زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

...... ماروی اور مرجینا ......

یہ گلوبل ویلج کی زندگی کا تجربہ ہے جسے نجم الحسن رضوی نے اس کی ہماہمی، سفاکی، وابستگی، شکستگی معنویت اور لایعنیت کے متنوع اور متضاد رنگوں میں فن کارانہ کامیابی کے ساتھ سمیٹا ہے۔ ناول کے زمانی دائرے میں تین دہائیاں اگر ایک طرف دونسلوں کے سماجی وقوعے کی رُوداد سناتی ہیں تو دوسری طرف مکانی دائرے میں پاکستان (خصوصاً سندھ) اور عرب امارات کی اپنی اپنی نہاد میں الگ الگ دنیائیں اپنے اندر بنتے بگڑتے نقشے دکھاتی ہیں۔ یوں زمان ومکان کی اکائی میں یہ ناول انسانی احساسات، سماج میں قدرت و اختیار کے اثرات اور افراد واقوام کے تقدیری محکمات کا ایک ایسا لینڈ اسکیپ بن جاتا ہے جو ہنساتا بھی ہے اور رُلاتا بھی۔

...... مبین مرزا

دوسو چالیس صفحات کی مجلد یہ کتاب مبلغ چار صد روپے کے عوض اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی سے بآسانی دستیاب ہے۔

...... اشارے ......

(تنقیدی مضامین وتبصرے)

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اپنے نامور والد ڈاکٹر وزیر آغا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے علم وادب کے نئے نئے جواہر اور خزینے تلاشنے اور تراشنے میں اُسی طرح منہمک اور مصروف ہیں جس طرح ڈاکٹر وزیر آغا صاحب تمام عمر معنی اور مفہوم کے نئے زاویوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ جناب سلیم آغا قزلباش کی زیرِ نظر کتاب ''اشارے'' ایک بالغ نظر اور روشن فکر کے مالک قلمکار کے تنقیدی مضامین، زائچوں وتبصروں کا نہایت مفید ومثبت مجموعہ ہے، جس میں جناب جوگندر پال، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر اکبر حمیدی، جناب غلام ثقلین نقوی، جناب منشا یاد کے شخصی وفنی تجزیات کے ساتھ افسانوی اور انشائی ادب کو نئی جہات کے ساتھ بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ مطالعہ کے دوران قاری کو بے پناہ معلومات کے ساتھ بہت سے نئے تجربات اور احساسات سے بھی آ گاہی ہوتی ہے۔

...... انوارشریف

ایک سوساٹھ صفحات کی مجلد یہ کتاب جس کی قیمت دوسو پچاس روپے مقرر کی گئی ہے نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی سے طلب کی جاسکتی ہے۔

...... موم کا پتھر ......

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے احسان کی چند تحریریں کراچی کے ادبی مجلّے سیپ میں پڑھی تھیں، جن سے میں متاثر ہوا تھا لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ اس کا تعلق میری جنم بھومی سے ہے اور وہ خاصے عرصے سے لکھ رہا ہے۔ میرا متاثر ہونا قدرتی تھا کہ اس تاثر میں ذاتی تعلق بھی شامل ہو گیا لیکن میری کوشش تھی کہ تاثر تعلق سے مجروح نہ ہو۔ آج تک میں اس کے کئی افسانوں کا مطالعہ کر چکا ہوں اور ہر بار تاثر ایک نیا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اسکا تو مجھے علم نہیں کہ احسان کب سے افسانے لکھ رہا ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تعلیم کے بعد وہ دوسرے سینکڑوں نہیں ہزاروں ہم وطنوں کی طرح مشرق وسطی کے ریگزاروں میں، تیل کے ڈالروں کی تلاش میں گم ہو گیا تھا۔ چند برس ریت پھانکنے کے بعد وہ واپس آیا تو اس کی تحریریں ملک کے ادبی پرچوں میں شائع ہونے لگیں اور آج وطن عزیز کا ایسا ادبی پرچہ شاید ہی کوئی جس میں اس کی تحریر شائع نہ ہو چکی ہو۔ اس کا مجموعہ پہلی بار میرے سامنے آیا تو مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ افسانہ نگاری پر وہ کتنا آگے جا چکا ہے۔

...... وقار بن الٰہی

ایک سو چوالیس صفحات کی کتاب ایک سو پچاس روپے کے جمالیات پبلی کیشنز، اٹک پر دستیاب ہے۔

متاعِ چہارسو

☆

مدیر چہارسو گلزار جاوید کا تازہ سیل نمبر نوٹ فرمالیجیے۔

0092-336-0558618

''یاد کی خوشبو''

تم جس خواب کا جادو لے کر
اپنے گیت بناتے ہو
تم جس آنکھ کا آنسو بن کر
اپنا درد بہاتے ہو
بادل جیسے رندھ رندھ آتے ہو
تم جس یاد کی خوشبو سے
اپنی شام سجاتے ہو
لفظوں کو مہکاتے ہو
تم جس پیڑ کی چھاؤں اوڑھے
دینہ نام کا گاؤں اوڑھے
رستہ رستہ، مٹی مٹی
اُگتے اور اُگاتے ہو
دھوپ میں پھول کھلاتے ہو
برکھا، باد، پرندا اور چھتری بن جاتے ہو
میں اس خواب کے جادو
آنکھ کے آنسو
یاد کی خوشبو
اور اس پیڑ کی چھاؤں سے
دور دراز کے رستوں اور دِشاؤں سے
بارشوں اور ہواؤں سے
ایک سنہری نظم بنا کر
روز تمہارے شہر کی اُور روانہ کرتا ہوں
ملنے اور ملانے کا بہانہ کرتا ہوں

نصیر احمد ناصر
(راولپنڈی)

''اگر میں لوٹنا چاہوں''

طاہر ظہیر بٹ (منگلا روڈ، دینہ)

شاید بہت کم لوگ اس راز سے آشنا ہوں کہ برصغیر کی ایک بہت مشہور شخصیت، گلزار کا آبائی علاقہ کون سا ہے۔ ہمارے شہر دینہ ضلع جہلم کو اعزاز حاصل ہے کہ گلزار یہاں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن اور نوجوانی دونوں اس شہر نے دیکھے۔ برصغیر کی تقسیم کی وجہ سے 1947ء میں انہیں یہ شہر چھوڑنا پڑا اور وہ یادوں کا عظیم خزانہ لے کر یہاں سے رخصت ہوئے۔ ان کو اس علاقہ سے کتنی دلچسپی ہے، اس کا ذکر ان کی شاعری میں کئی جگہ ملتا ہے اور ان کے ملنے والے بھی بتاتے ہیں کہ گلزار ابھی تک اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں۔ گلزار کا مقام بھارت میں کیا ہے اور ان کا نام کتنا معروف ہے، وہ کتنے بڑے شاعر، ادیب اور فلم ساز ہیں، اس پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔ غرض اس بات سے ہے کہ میں نے جو معلومات گلزار صاحب کے بارے میں حاصل کی ہیں کہ دینہ میں وہ اور ان کا خاندان کس حال میں تھا، یہ معلومات ان تک پہنچائی جائیں۔ گلزار صاحب کی دینہ سے دلچسپ کا دعویٰ ان کے اپنے اس آبائی شہر کے دورہ سے ہی سچ ثابت ہوسکتا ہے۔ کیا خبر کہ کل کو ان کے جاننے والے آخری چند لوگ بھی دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ ان کا دورہ ان پر قرض ہے، انہیں جلد اسے چکانا چاہیے۔ میں نے یہ تمام معلومات اپنے ماموں جان نذیر احمد بٹ سے حاصل کی ہیں، جو گلزار کے ہم عمر ہیں اور گلزار صاحب کے مکان کے ابھی تک پڑوسی ہیں۔ میرے نانا جان صوفی محمد سلیم گلزار کے والد مکھن سنگھ کے گہرے دوست تھے اور ان کی کپڑے کی دکان تھی جو کہ گلزار کے والد کی دکان کے بالکل قریب تھی۔

گلزار کا اصلی نام جسمیر سنگھ اور ان کے والد کا نام مکھن سنگھ ہے۔ مکھن سنگھ کی جائے پیدائش ہمارے علاقے کا مشہور گاؤں ''کرلہ'' ہے۔ جس کی آبادی پانچ ہزار ہے۔ یہ دینہ سے پانچ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ گلزار کی ایک بہن تھی جس کا نام مہندر کور تھا۔ گلزار کے والد مکھن سنگھ بھاری جسم کے خوبصورت جوان تھے۔ گلزار کی والدہ چھوٹے قد کی تھیں اور گلزار کے بچپن ہی میں انتقال کر گئیں۔ والدہ کی اس اچانک موت کا داغ شاید ابھی تک ان کے دل پر ہو۔ گلزار اور ان کی بہن بہت دبلے پتلے تھے۔ مکھن سنگھ نے بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کر لی۔ یہ شادی انہوں نے ''بوڑا پنڈی'' گاؤں کے ایک مشہور خاندان میں کی۔ یہ گاؤں دینہ سے دس کلومیٹر دور ہے۔ مکھن سنگھ کے یہ نئے سسرالی 150 ایکڑ اراضی کے مالک ہونے کے علاوہ سرائے عالمگیر میں کپڑے کا تھوک کاروبار کرتے تھے۔

گلزار نے اپنی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل اسکول چک عبدالخالق سے حاصل کی جو سید ضمیر جعفری مرحوم کا گاؤں بھی ہے۔ چک عبدالخالق میں کرپا رام اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اپنے علاقہ کے سفید پوشوں لوگوں میں ان کا بڑا نام تھا۔

گلزار صاحب کے والد مکھن سنگھ دینہ کے مشہور آدمی تھے۔ ان کی تین دکانیں تھیں جو مین بازار دینہ کے وسط میں پیپل کے مشہور درخت کے بالمقابل تھیں۔ ان میں سے ایک دکان میں وہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے، جس کا پچھلا دروازہ ان کے گھر میں کھلتا تھا۔ وہ دکانیں، ان کا گھر اور وہ گلی آج بھی اسی حالت میں موجود ہیں۔ یہ گلی آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ گلی کے دائیں جانب عطر سنگھ کی دکان اور پیچھے مکان تھا۔ اس کے ساتھ میرے نانا جان کی ٹیلرنگ اور کپڑے کی دکان تھی جو آج بھی میرے ماموں جان کے پاس ہے۔ گلی کے بائیں جانب شیخ لطیف شریف کی دکان تھی۔ مکھن سنگھ کے ملنے والوں میں میرے ایک اور ماموں پنوں خان بھی تھے جو وفات پا چکے ہیں۔

گلزار کے والد مکھن سنگھ جہاندیدہ آدمی تھے۔ انہوں نے حالات کو بھانپ کر قیامِ پاکستان سے قبل دہلی جا کر اپنا کاروبار کھول لیا۔ پاکستان بننے سے چند ماہ پہلے مکھن سنگھ دہلی سے واپس آئے، اپنی جائیداد کو فروخت کرنے کی ناکام کوشش کی اور حالات خراب ہونے سے پہلے ہی بچوں کو لے کر بھارت چلے گئے۔ ان کا مکان عزیز نامی ایک شخص کو الاٹ ہوا جو اب بھی اسی خاندان کے قبضہ میں ہے۔ ان کی دکانیں شیخ صادق اور شیخ محمد دین کو الاٹ ہوئیں، جو اب بھی انہی کے پاس ہیں۔ ایک دکان میں ''لیور برادرز'' کی ایجنسی ہے۔ دوسری میں چاول کا کاروبار ہوتا ہے۔ دینہ جو اب پچھتر ہزار آبادی والا شہر ہے کبھی مکھن سنگھ کی دکانوں تک محدود تھا۔ چند گز کے فاصلے پر ایک چوک تھا، جس کے مغرب میں پوسٹ آفس ہوا کرتا تھا۔ جی ٹی روڈ دینہ سے تین سو گز کے فاصلہ پر برصغیر کی اس عظیم شخصیت کا مسکن آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔ ان کے مکان کے سامنے پیپل کا یادگار درخت اپنی اداس چھاؤں کے باوجود ان لوگوں کی یاد میں جلتا ہے جنہوں نے اسے لگایا، اس کے سائے میں پلے بڑھے۔ گردشِ زمانہ نے انہیں کتنی دور جانے پر مجبور کیا لیکن یہ درخت اپنے بھاری وجود اور گہری جڑوں کی وجہ سے ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ گلزار صاحب کی یادوں کی جڑیں شاید اب اس سے بھی گہری ہو چکی ہوں۔

گلزار صاحب کے ایک بہت گہرے دوست اور کلاس فیلو کا ذکر کیے بغیر سب کچھ نامکمل رہے گا۔ اللہ دتہ نامی شخص بھی انتقال کر چکا ہے۔ گلزار صاحب اس کو اپنی محبت میں ساتھ لے گئے تھے اور اس کی بڑی مدد کی۔ بعد میں اللہ دتہ کراچی منتقل ہو گئے اور سائیکلوں کا کاروبار کیا۔ دینہ کا سب سے مشہور ریسٹورنٹ ''البلال ریسٹورنٹ'' ان کی ہی ملکیت ہے، جو جی ٹی روڈ پر دینہ چوک کے بالکل قریب ہے۔ اللہ دتہ کے بھائی غلام محمد جنہوں نے دینہ میں پہلی بار اتنا معیاری ریسٹورنٹ کھولا، وہ بھی انتقال کر چکے ہیں۔

اگر میں لوٹنا چاہوں تو کیا میں لوٹ سکتا ہوں
وہ دنیا ساتھ جو میرے چلی تھی اب کہاں ہوگی

''دوسرا کوئی سخی کہاں''

میگھنا گلزار

- ترجمہ وتلخیص -

ف۔س۔اعجاز

(کول کتہ، بھارت)

میں اپنے باپ کی ابتدائی زندگی کی چشم دید گواہ نہیں ہوں۔ وہ میرے لئے محض باپ نہیں بلکہ زندگی کا مستقل تجربہ رہے ہیں، طاقت اور جذباتی مدد کا ایک ستونِ بے زبان، میرے تخلیقی سرچشموں کا منبعِ تحریک اور ایک وراثت جس کے ساتھ میں ہمیشہ جینے کی کوشش کرتی رہوں گی۔

میں انہیں (اپنے پاپا کو) پاپی کہتی ہوں۔ پاپی کے سمبندھ سے میری سب سے مضبوط یاد یہ ہے کہ میں اُن کے ستار کی جھنکار سے جاگ اٹھتی تھی۔ سنگیت اور آرٹ کے تئیں وہ ایک خاص جذبہ رکھتے ہیں۔ جب میں تقریباً سات سال کی تھی اسوقت وہ ستار سیکھتے تھے۔ تب وہ اپنی عمر کے پانچویں دہے میں رہے ہوں گے۔ ہمیشہ صبح تڑکے اٹھ جایا کرتے (اور اب بھی اٹھ جاتے ہیں) سورج نکلنے سے پہلے!۔ وہ کہتے ہیں سورج کو شکست دینا دن شروع کرنے کا عظیم الشان طریقہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اپنے اس عقیدے کی خاطر انھوں نے مجھے کبھی نیند سے جگا کر پریشان نہیں کیا، میں خود ان کی ستار کی آواز سے اٹھ جاتی تھی۔ ان کی خواب گاہ سے متصل ان کی مطالعہ گاہ تھی جہاں وہ ستار بجایا کرتے تھے۔ میرا اپنا الگ کمرہ ہونے کے باوجود جب بھی میں ان کے ساتھ اُن کے کمرے میں ہوتی وہیں سوجایا کرتی۔ جب آنکھ کھلتی اٹھ کر ان کے پاس چلی جاتی اور ان کے زانو پر سر رکھ کر دوبارہ سوجاتی۔ وہ ستار بجاتے رہتے۔ پھر میں اٹھ جاتی تا کہ اسکول کے لیے تیار ہوجاؤں۔ وہ جوتوں کے فیتے باندھنے میں میری مدد کرتے۔ میرے یونیفارم کی کمر کی گرہ لگاتے۔۔۔ دوہری گرہ، وہ بھی اپنے فن کارانہ انداز سے!۔

اور پھر میرے بالوں کی مانگ، میری چوٹیاں تھیں! دس سال کی ہونے تک میرے بال شانوں تک آتے تھے۔ ہر صبح میں اپنی آیا سے حجت کرتی کہ میری دونوں چوٹیاں ایسے بنایا کرکہ دونوں نہ صرف میرے کانوں تک آئیں بلکہ برابر بھی ہوں۔ مجھے معلوم ہے میں کوئی آسان بچی نہیں تھی۔۔۔ ایک صبح پاپی نے ہمیشہ کے لیے میری ٹیڑھی چوٹیوں کا مسئلہ خود حل کرنے کی ٹھان لی۔ بڑے صبر سے انھوں نے میری مانگ نکال کر بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پھر میری ''ہدایت'' کے مطابق انھوں نے ہر حصے کو تین حصوں میں بانٹا۔ درمیانی لٹ کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے انھوں نے دائیں لٹ کو بائیں پر، پھر بائیں کو دائیں پر بٹنا شروع کردیا۔ ظاہر ہے کہ دونوں چٹیاں پہلی بار میں وہ بھی برابر نہ کر سکے لیکن ٹھیک ہونے تک وہ یہ عمل دہراتے رہے۔

اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ وہ اپنے سر ایک روایتی ماں کی ذمہ داریاں لینا شروع کررہے تھے، اپنی بیٹی کے بال گوندھنا اور اس سے زیادہ اہم یہ کہ اس کام کو اپنی ہی بیٹی سے سیکھنے میں انہیں کوئی شرم یا عار نہ تھی۔

وہ ہمیشہ ایک مساوات پسند (Egalitarian) باپ رہے ہیں۔ کبھی مجھے جھڑکتے نہ تھے بلکہ ہمیشہ مجھ سے باتیں کرتے رہتے، حکم نہ دیتے بلکہ مشورہ دیا کرتے۔ اس کے باوجود انھوں نے میرے اندر ڈسپلن اور عزت کا احساس پیدا کردیا۔ یہ پرورش کا ایک انوکھا طریقہ تھا۔ ایک حالیہ انٹرویو ہم نے ایک ساتھ دیا۔ باپ بیٹی کے رشتے پر انھوں نے ایک بات کہی جس سے یہ سب کتنا واضح ہوگیا۔

انہوں نے کہا والدین کا یہ فرض کرلینا غلط ہے کہ وہ اپنے بچوں سے زیادہ سمجھتے یا جانتے ہیں۔ وہ حیاتیاتی طور پر اپنے بچے سے زیادہ بڑے ہوسکتے ہیں۔ لیکن اپنے والدین ہونے کے تجربے میں وہ بچے ہی کی عمر کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا (ان کے فلسفے کے مطابق) اگر میں ان کی دوسالہ بیٹی تھی تو وہ میرے دوسالہ باپ تھے۔ وہ ایک باپ کی حیثیت سے اور میں ان کی بیٹی کے طور پر۔ چنانچہ وہ میری کنگھی چوٹی کرنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں اس سے انہیں یاد آجاتا تھا کہ کس طرح ان کی ماں ان کے بال گوندھ دیا کرتی تھیں جب وہ کمسن تھے۔۔۔

کچھ ہی لوگ جانتے ہیں کہ ''گلزار'' کا پیدائشی نام سمپورن سنگھ کالرا تھا۔ وہ ایک سکھ خاندان میں سردار ماکھن سنگھ کالرا اور سوجان کور کے یہاں پیدا ہوئے اور ایک لڑکے کے طور پر سکھ روایت کے مطابق ان کے بال لمبے تھے۔ ان کے پتا یعنی میرے دادا ان کے کیس بنایا کرتے تھے کیونکہ پاپی کی ماں ان کی کمسنی میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔

پاپی کو یاد نہیں ان کی ماں کیسی دکھتی تھیں۔ اس زمانے میں تصویر کشی کا چلن نہیں تھا، اس لئے ماں کا کوئی تصویری حوالہ بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک رشتہ دار خاتون ننھے گلزار کو اپنی بانہوں میں لیے دینہ کے ایک بازار سے گذر رہی تھی تب اُس نے کہا۔۔۔ ''دیکھ ایسی لگتی تھی تیری ماں''۔

انہیں یاد ہے وہ چہرہ۔ وہ عورت مسکراتی تو اس کا ایک دانت سونے کا خول چڑھا نظر آیا تھا۔ اور اس وقت سے پاپی نے ہمیشہ یہی تصور کیا کہ ان کی ماں کا ایک دانت سونے کا تھا!۔ حالانکہ بعد میں جب انہوں نے اپنی بڑی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ماں کا کوئی دانت سونے کا نہ تھا!۔

ان کی تاریخ پیدائش بھی ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ 18 اگست 1996ء کو ہم نے ان کا ساٹھواں جنم دن منایا۔ لیکن بعض جگہوں پر ان کا

سال پیدائش 1934ء درج ہے۔ کچھ دستاویزوں کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش 5 ستمبر 1934ء ہے!۔ میرا اندازہ ہے کہ یوم پیدائش منانا مغربی روایت ہے اس لئے بہت سارے لوگ اس کا ریکارڈ محفوظ نہیں رکھتے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے ان کی عمر بڑھا کر لکھوا دیا کرتے تھے تا کہ قبل از وقت پنشن ملنی بھی شروع ہو جایا کرے!۔ لیکن چونکہ میں اپنے پاپی کو ہمیشہ جوان تر دیکھنا چاہوں گی اس لئے میں ان کی تاریخ پیدائش 18 اگست 1936ء ماننا پسند کروں گی۔

دہلی میں بستی پنجابیاں، سبزی منڈی کا حصّہ ہے۔ روشن آرا باغ ایک قتل گاہ بن گیا تھا جہاں مردوں کو رگید کر ان کے سر قلم کر دئے جاتے تھے اور انہیں نالے میں پھینک دیا جاتا تھا۔ عام آدمی آسمانی بلائیں اور قاتل بن گئے تھے، تلواریں اور چھریاں چمکاتے پھرتے تھے۔ میرے پتا کو یاد ہے ایک شخص سمندر سنگھ ایک مسلمان لڑکے کو کھینچ رہا تھا جو انہیں اسکول میں درس دعا دیا کرتا تھا۔ جب پوچھا گیا ''سمندر سنگھ تم کہاں جا رہے ہو'' اس نے پنجابی میں جواب دیا ''اِس کے ٹکڑے اڑانے'' تھوڑی دیر بعد پاپی نے اسے ایک خون آلود تلوار کے ساتھ واپس آتے ہوئے دیکھا۔

پاپی کا ہمیشہ یہ خیال تھا کہ ان کے باپ موجود نہیں ہوتے تو پارٹیشن کے مہلک نظارے دیکھنے کے بعد وہ اور ان کے رشتے دار جنونی ہو گئے ہوتے۔ دادا جی کے بہت سارے دوست مسلمان تھے اور فسادات کے دوران وہ سب ایک دوسرے کو تلاش کرتے اور ہر ممکنہ بلا اور نقصان سے بچاتے۔ رواداری کے اسی جذبے نے بچوں یعنی پاپی اور ان کے ماں جایوں کو انتہا پسند بننے سے بچا لیا۔ پاپی کو یاد ہے دادا جی کہا کرتے تھے ''پرالے (قیامت) آ گئی ہے۔۔۔ نکل جائے گی''

جب ''گرم ہوا'' اور ''تمس'' جیسی فلمیں بنیں انہیں راحت اور اطمینان کا احساس ہوا۔ ان زخموں کے نشان اب ظاہر ہو چکے تھے اور انہوں نے پاپی کو 1996ء میں ''ماچس'' بنانے پر مجبور کیا جو پنجاب میں دہشت گردی کی تحریک کے بارے میں ایک یادگار دستاویزی فلم تھی۔

ادبی دنیا سے بڑھتی ہوئی وابستگی کے ساتھ پاپی پینٹنگز کی نمائشوں اور ہندوستانی کلاسیکی سنگیت کے پروگراموں میں بھی جانے لگے تھے۔ فنون لطیفہ کے لیے یہ کشش ان کے اندر سے پیدا ہوئی تھی، خاندان یا بزرگوں کی دین نہ تھی۔ وہ کہتے ہیں ''میرے اندر ایک تنہائی تھی جو مجھے بے چین رکھتی تھی۔ اس سے وہ پُر ہو جاتی تھی۔ اگر آرٹ نے رہنمائی نہ کی ہوتی اور میرے جذبات کو استوار کرنے میں میری مدد نہ کی ہوتی تو میں پورے طور پر گمراہ ہو گیا ہوتا!''۔

پاپی ساہتیہ سبھا کے رکن بن گئے جہاں ان کی دوستی گُرویل سنگھ پنّو، راجندر سنگھ بیدی، سکھ بیر، اداکار بلراج ساہنی وغیرہ سے ہوئی۔ پنجابی ساہتیہ سبھا کے ارکان کے طور پر ان لوگوں نے ایک ادبی جریدہ بھی پنجابی میں نکالنے کی کوشش کی جو چند سال تک ''چیتنا'' کے نام سے نکلا بھی جس کی ادارات ایس سؤرن کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ کہ گُرویل سنگھ پنّو جو ایک سکھ اور کٹر کمیونسٹ تھے، نے ہی ان کے لمبے بال اپنے ہاتھوں سے تراش دئے تھے کیونکہ وہ خود اپنے بال پہلے کاٹ چکے تھے۔ پاپی اس وقت تک بھی پگڑی باندھتے تھے۔

تایا جی نے پاپی کو سکھ دھرم خاندان کی مریادا اور روایات پر ایک مختصر لیکچر پلایا لیکن انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ حضرت پہلے ہی سے خاندان کی ''کالی بھیڑ'' ہیں۔

گھر کے لوگ چاہتے تھے وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنیں لیکن ان کے اندر کے ادیب کو روکا اور دبایا نہ جاسکا۔۔۔

ایک ادیب یا مصنف بننے کی ان کے اندر اتنی چاہ تھی کہ انہوں نے اپنے (S.S.Gulzar) کی ایک جعلی مہر بنوائی اور موپاساں کی مختصر کہانیوں کے مجموعے کے سرورق پر اصل مصنف کے نام کی جگہ چھاپ کر یہ دیکھنا چاہا کہ میرا نام کیسا لگے گا۔ اب اتنی ڈھیر ساری کتابوں کے مصنف ہونے کے بعد بھی پاپی کے پاس وہ کتاب اب تک محفوظ ہے!۔

پاپی اس مفروضے کو رَد کرتے ہیں کہ ان کی بیشتر فلمیں سوانحی ہیں یا ان میں ان کی زندگی کے اُس دور کی عکاسی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں ''ہر تخلیق کرداروں یا موضوع کے انتخاب کی رُو سے اپنے خالق کو اجاگر کرتی ہے۔ کسی پینٹنگ کو لیجیے۔ اس کے رنگ، مرکزی خیال اس کی بُنت سے مصور کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ فلموں میں اس کے برعکس متوازی چیزیں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں کیونکہ فلم کرداروں، فریموں، روشنی، سنگیت وغیرہ کی یکجائی میں ایک زیادہ لفظی (Verbose) میڈیم ہے''۔

پاپی کی تمام فلموں میں سب سے نمایاں سرا انسانی رشتوں کی پیچیدگی اور نزاکت کا نظر آتا ہے۔ یہ رجحان ان میں غالباً اپنے گرو بملدا کی میت میں پیدا ہو گیا تھا۔ پاپی بملدا کو بہت اچھی طرح یاد کرتے ہیں۔ وہ اور ان کے ساتھی ویبوسین، آر جھالانی اور مُکل دت بملدا کو میریڈ پرنٹ (Married Print) کہا کرتے تھے۔ فلمی اصطلاح میں جب تصویر اور آواز کے نگیٹو ایک دوسرے میں فیوز کر دئے جاتے ہیں تو جو پوزیٹو پرنٹ تیار ہوتا ہے اسے ''میریڈ پرنٹ'' کہتے ہیں۔ بملدا کے معاونین میں یہ لطیفہ عام تھا کہ اُن (بملدا) کی شادی فلموں سے ہوئی ہے!۔

بملدا کے ساتھ پاپی کا وقت بہت واقعات سے پُر تھا۔ کئی لوگوں سے ان کا رابطہ ہوا جن سے بعد میں ان کی تخلیقی وابستگی ہو گئی اور چند ایک تو عمر بھر کے دوست بن گئے۔۔۔۔

مینا کماری عظیم اداکارہ ''بے نظیر'' فلم میں کام کر رہی تھیں جو بملدا ''کابلی والا'' کے بعد بنا رہے تھے۔ ان میں بھی شاعری کے لیے ایک لگن تھی جو پاپی اور مینا جی کو قریب لے آئی۔ وہ اپنی شاعری اور خیالات کی ڈائریاں ساتھ

رکھتی تھیں جنہیں پاپی سے شیئر کرتی تھیں۔

بقول پاپی ''مینا جی بہت حساس طبیعت کی مالک تھیں۔ وہ ہندوستانی اسکرین کی تاریخ ساز ٹریجیڈین تھیں۔اُن کے اظہار، اُن کی آواز اور ان کی شاعری میں ایک درد تھا، مجرد لیکن روح پرور''۔شاید اسی بات نے پاپی کو ان کی طرف مائل کر دیا۔ جذبہ ہو، شاعری ہو تو رومان زیادہ پیچھے نہیں رہ جاتا۔۔۔

جب وہ مر گئیں تو معلوم ہوا اپنی بیاضیں پاپی کو وصیت کر گئی ہیں جو اب تک ان کے پاس محفوظ ہیں۔ اُن کے ایک شہکار پورٹریٹ کے ساتھ جسے ایم۔آر۔اچریکر نے بنایا تھا۔

برسوں وہ پورٹریٹ مجھے پاپی کے دفتر میں ان کی میز کے پیچھے نظر آتا رہا۔

پاپی کی پہلی کتاب ''چورس کتاب'' افسانوں کا مجموعہ تھی جو چیتنا پبلی کیشنز کے ایس سوَرن نے 1963ء میں شائع کی تھی۔اس کا انتساب مینا جی کے نام تھا۔ایس سوَرن نے ہی 1964ء میں پاپی کی دوسری کتاب ''جانم'' بھی شائع کی جو پچاس نظموں کا مجموعہ تھی۔

ہیمنت کمار یعنی، ہیمنت دا کے گھر پر ''راہگیر'' کی سِٹنگ تھی جسے ترون مجمدار ڈائرکٹ کر رہے تھے۔ پاپی اس کے گانے لکھ رہے تھے۔''وہ'' ترون مجمدار کی بیوی اور فلم کی ہیروئن سندھیا رائے کے ساتھ تشریف لائیں۔وہ اُن کی زندگی کی طویل ترین مختصر کہانی ہونے والی تھیں۔۔۔

راکھی کے لئے۔۔۔ جو میری زندگی کی طویل ترین مختصر کہانی ہے۔۔۔''

پاپی کی مختصر کہانیوں کے مجموعے ''راوی پار'' کا یہ انتساب غالباً اس بات کا بہترین خلاصہ ہے۔

راکھی، میری ماں پاپی کی سب سے لمبی مختصر کہانی ہے۔۔ جواب بھی زیرِ تحریر ہے۔ ہر کہانی کی طرح اس کے بھی کئی Versions ہیں۔

1968ء کے آس پاس۔۔۔ پاپی کو یاد ہے وہ پہلی بار ماں سے کلکتہ میں ملے، پھر ہیمنت دا کے گھر پر ''راہگیر'' فلم کی تیاری کے دوران ملے۔ لیکن ماں کہتی ہیں وہ پاپی سے پہلی بار ''راہگیر'' کی شوٹنگ کے دوران ملیں، پنویل، بمبئی کے قریب مقام تھا آپٹے گاؤں جہاں آج ماں کا ایک فارم ہے۔وہ کہتی ہیں یہ زمین انھوں نے اس لیے خریدی تھی کہ یہاں اُن سے اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی!

1968ء میں ماں بمبئی منتقل ہو چکی تھیں اور لیکو کیلامائن اور ہاکوبا ساڑیوں جیسی مصنوعات کے لیے اشتہارات میں کام کر رہی تھیں اور ریڈیو پر بنگالی جنگلز (Jingles) بھی گاتی تھیں۔اجے بسواس کے ساتھ ان کی شادی ختم ہو چکی تھی اور وہ اپنی سہیلی چاند عثمانی کے ساتھ رہ رہی تھیں۔

اس وقت تک مُکل دت اور چاند عثمانی شادی کر چکے تھے۔(اس میں پاپی کے فنِ خطوط نویسی کا بڑا حصہ ہے)۔اور پاپی ان کے گھر جایا کرتے تھے۔

ماں کی سہیلیاں گلو اور سرلا جو پنجاب نیشنل بنک میں کام کرتی تھیں انہیں قریب سے قریب تر لے آئیں۔

ماں کہتی ہیں ان کی حس مزاح نے انہیں (ماں کو) کھینچ لیا۔ وہ ہمیشہ انہیں اور ان کی سہیلیوں کو ہنسایا کرتے تھے۔

پاپا کہتے ہیں ماں میں انہیں یہ بات سب سے زیادہ پسند آتی کہ وہ گھر اور خاندان کی جانب جھکاؤ رکھتی تھیں۔ نارتھ بمبئی ہاؤزنگ سوسائٹی والے گھر کو وہ ہمیشہ سجانے سنوارنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔ نئے پردے خریدنا، بڑھئی کو بلانا، الماریاں میزیں بنوانا وغیرہ۔۔۔

خدا جانے کب اور کیوں دو شخص ملتے ہیں۔۔۔ یا جدا ہو جاتے ہیں۔۔۔

''میرے اپنے'' کے دوران مشہور اداکار جتیندر جو اُن دنوں پاپی کے پڑوسی تھے ایک فلم کی پیشکش لئے آئے۔ پاپی کوزی ہوم سوسائٹی، باندرہ، پالی ہل کے فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے۔ماں نے یہ فلیٹ ڈھونڈا تھا۔

پاپی نے جتیندر کو کئی کہانیاں سنائی تھیں لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ ایک دن جتیندر پاپی کے پاس آئے اور بولے ماں (یعنی میری ماں) نے انہیں ایک کہانی سنائی تھی جو انھوں نے ہر طرح پسند کر لی تھی۔ پاپی نے یاد دلایا کہ وہ کہانی تو میں آپ کو سنا چکا تھا لیکن آپ نے اسے رَد کر دیا تھا۔

''ایسی صورت میں آپ کو سیکھنا چاہیے کہ کہانیاں کیسے سنائی جائیں۔ راکھی یہ کام آپ سے بہت زیادہ اچھا کر سکتی ہیں!!!''

ماں نے یہ کہانی ''رنگین اُتّریو'' (رنگین چادر) ایک بنگالی رسالے ''اُلٹورتھ'' میں پڑھی تھی اور پاپی کو تجویز کی تھی۔ وہ کہانی صاف طور پر میوزیکل فلم ''دی ساؤنڈ آف میوزک'' سے انسپائرڈ تھی۔ ہیمنت دا نے اس کہانی کے حقوق خریدنے میں مدد کی اور اس طرح ''پریچے'' پر کام شروع ہوا۔

پاپی کو ایک ہدایت کار کے طور پر نیک نامی حاصل ہونے لگی تھی۔ ان کی فلمیں تقریباً تقریباً ادب سے اخذ کی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور سادگی اور انسانی سائیکی اور تعلقات کی گہری تفہیم کی ترجمانی ہوتی تھیں۔

انسانی تعلقات میں تحقیق کا ان کا جتن فلم ''کوشش'' میں نمایاں ہوا جو ایک جاپانی فلم ''The Happines of Us Alone'' سے متاثر تھی جسے پاپی نے بمبئی میں منعقدہ اولین فلمی میلے میں 1952ء میں دیکھا تھا۔ لیکن پاپی اس فلم کے اس بنیادی نظریے سے متفق نہ تھے کہ معذور لوگ اپنی الگ تھلگ سوسائٹی میں زیادہ خوش رہتے ہیں۔ وہ اس خیال کو بہت انقلابی تصور

کرتے تھے۔اس کے برعکس وہ اس خیال کے حامی تھے کہ معذور لوگوں کو سماج کے عام دھارے میں مساوی طور پر اور معمولاً لایا جانا چاہیے۔انھوں نے یہ فلم لکھی، ایک اندھے کردار کے اضافے کے ساتھ۔ان کا اسکرپٹ مماثل صورت حال میں بھی اس فلم کا مخالف تھا (یا اس سے بہت مختلف تھا)

این سی سپّی جنہیں فلم پروڈیوس کرنا تھی اسکرپٹ مکمل ہونے کے بعد ثانوی خیالات میں مبتلا ہو گئے۔انہوں نے رائے دی کہ یا تو پاپی اوپری آواز کا استعمال کریں یا گونگے بہروں کے مافی الضمیر اور افعال کی ترسیل کے لیے ضمنی ٹائٹلوں (Sub-titles) کا استعمال کریں۔ پاپی نے اس خیال سے اتفاق نہ کیا۔ ان کا ادّعا تھا کہ اگر اداکاری اسکرین پلے، سینماٹوگرافی، سنگیت، ایڈیٹنگ، آرٹ ڈائرکشن اور میک اپ کی سہولتیں میسر ہونے کے باوجود اپنی فکر کو ناظرین تک پہنچانے میں ناکام رہتے ہیں تو انہیں فلم سازی چھوڑ دینا چاہیے۔سپّی صاحب کو پاپی کی توجیہ سے اتنی تقویت ملی کہ انہوں نے پاپی کو فوراً ایک چیک دیا اور کہا ''اگر آپ اتنے مطمئن اور پُر اعتماد ہیں تو مجھے اتنے شکوک میں کیوں پڑنا چاہیے؟''

ماں اور پاپی کی شادی 18 اپریل 1973ء کو ہوئی۔ پاپی کو یاد ہے سپّی صاحب شادی میں کتنے فعال ثابت ہوئے تھے۔ پاپی کا فلیٹ بہت چھوٹا تھا اس لئے انہوں نے اپنے بنگلے سے اس کا اہتمام کیا۔شادی کے دعوت نامے ان کے دفتر سے جاری ہوئے اور انہوں نے ہی استقبالیہ کا بھی بندوبست ٹرف کلب میں کیا۔

لڑکی کی طرف سے شگن بھی سپّی صاحب کے گھر ہی سے آیا۔۔۔ ایک بینگن تھا کدّو کے سائز کا!۔

ماں شرارت کے موڈ میں تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ پاپی کو بینگن کتنے ناپسند ہیں۔اس کا اظہار وہ اپنی کئی فلموں میں بھی کر چکے ہیں۔

سبزیوں سے پاپی کا گریز 1960ء تک پہنچتا ہے جب وہ ''چار بنگلے'' میں رہتے تھے (کرشن چندر اور ساحر لدھیانوی بھی وہاں رہتے تھے)۔ بینگن کا پکوان جو پورا پکا بھی نہ تھا پاپی نے اُٹھا کر اسے پھینک دیا۔اس وقت سے اس کے لیے اُن کی چڑ میں اضافہ ہی ہوا ہے۔''میں ہر بنگالی شئے پسند کرتا ہوں ان کا ادب، ان کی شاعری، ان کا سنگیت۔۔۔اپنی بیوی بھی۔۔۔ ہر چیز سوائے بینگن کے!''

پاپی کوئی زیادہ دھارمک آدمی نہیں ہیں۔ وہ دھارمک رسموں میں دھارمک سے زیادہ ثقافتی تجربے میں شریک ہونے کے لیے شامل ہو جاتے ہیں۔ان تمام برسوں میں کسی واحد رسم میں اگر وہ شریک ہوئے ہیں تو وہ ہے ''ہون'' جو ہر سال میرے جنم دن پر منایا جاتا ہے۔ ہمارے خاندانی پجاری انشو مان جی ہَون کرواتے ہیں جو صبح سے شروع ہو کر پاپی کے مجھے آشیرواد اور اس سال گرہ کا تحفہ دینے تک جاری رہتا ہے۔میری عمر کے ساتھ پاپی کے تحفوں کا انتخاب بالیدہ ہو گیا ہے۔انھوں نے مجھے میرا پہلا ویڈیو کیمرہ میری سترھویں سالگرہ پر دیا۔ پھر سال دو سال کے وقفے سے نئے ماڈل سے اس میں ترمیم ہوتی رہی۔ بینک اکاؤنٹ کے لیے میرا پہلا ATM کارڈ میرے اٹھارویں جنم دن پر۔ میرا پہلا خاموش کیمرہ بائیسویں سالگرہ اور اب اس بار لیپ ٹاپ!۔لیکن سب سے قیمتی وہ کتابیں ہیں جو انہوں نے میرے لئے لکھیں۔ جب تک میں تیرہ سال کی نہ ہو گئی وہ ہر سال مجھے ہَون کے بعد کتاب کی پہلی جلد پیش کرتے رہے۔

دوسرا مستقل تہوار ہولی تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے محظوظ ہوتے بلکہ محض اس لئے کہ وہ مجھے پسند تھا!۔ وہ اپنے دوستوں کو ان کے خاندان سمیت مدعو کر لیتے۔ میرے دوست بھی آتے اور آنگن میں جمع ہو جاتے۔ گلال اڑایا جاتا، سموسوں، جلیبیوں سے تواضع کی جاتی۔ جب میں اس تہوار سے نکل گئی تو ان کا ہولی تہوار ختم ہو گیا۔

دیوالی البتہ آج بھی پسندیدہ تہوار ہے۔ گھر کے اطراف میں ہم سب مل کر چودہ دیئے جلواتے ہیں۔ ماں اور پاپی دونوں کے گھروں میں۔ ماں دنیا بھر کے پٹاخے اور آتش بازیاں خرید لاتیں جنہیں ہم ان کے گھر کے باہر چھوڑتے۔ رات کا کھانا کبھی ماں اور کبھی پاپی کے گھر پر ہوتا۔ اب جبکہ میری شادی ہو چکی ہے، تو وہ دونوں میرے یہاں آ جاتے ہیں اور ہم پٹاخوں کے بجائے صرف موم بتیاں جلاتے ہیں!

دلچسپ بات یہ کہ پاپی برسوں تک روزے بھی رکھتے رہے۔ مجھے یاد ہے میں افطار کے وقت ان کے ساتھ میز پر بیٹھا کرتی تھی۔ بھوشن چاچا اور دوسرے بھی ہوا کرتے تھے۔ مجھے ابھی حال میں معلوم ہوا کہ پاپی نے میناجی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے روزے رکھیں گے۔ میناجی ہر سال پابندی سے روزے رکھا کرتی تھیں۔ جب ان کی صحت گرتی چلی گئی اور پابندی سے دوائیں لینے کی وجہ سے وہ روزے رکھنے کے قابل نہ رہیں تو پاپی نے ان کے روزے رکھنے کی ٹھانی اور ہر سال وہ پورے روزے رکھنے لگے۔ جب تک ان کے بلڈ پریشر نے خود انہیں دواؤں پر رہنے کے لیے مجبور نہ کر دیا یہ سلسلہ چلتا رہا۔

1976ء کے قریب پاپی نے اپنی پروڈکشن کمپنی ''میگھنا مووِیز'' کے نام سے شروع کی تاکہ وہ دیگر پروڈیوسروں کی مداخلت یا دباؤ کے بغیر اپنے طرز کی فلمیں بنا سکیں۔اس وقت تک وہ کئی پروڈیوسروں کی ڈھل مل یقینی کا نظارہ کر چکے تھے۔انھوں نے مقبول اداکاروں دھرمیندر، ہیما مالنی اور شرمیلا ٹیگور کو لے کر ''دیوداس'' کا آغاز کر دیا تھا۔مشہور فلمی ولین پریم چوپڑہ کے بھائی کیلاش چوپڑہ اسے پروڈیوس کر رہے تھے۔ پاپی کا خیال تھا کہ پچھلی دونوں دیوداس فلموں میں گرچہ کے۔ایل۔سہگل اور دلیپ کمار جیسے عہد ساز ہیروز نے مرکزی کردار نبھایا تھا۔لیکن ان فلموں میں نسائی کرداروں کو دبا دیا گیا تھا۔ پاپی چونکہ شرت چندر کے زبردست مداح ہیں اس لئے انہوں نے ''پارو'' اور ''چندرمکھی''

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمایئے

شہر یار سُو۔۔۔

گلزؔار

بڑی شاعری کے بڑے شاعر فراؔق تھے، فیضؔ تھے، فراؔز تھے اور شہر یاؔر ہیں۔

شہر یاؔر کے ہاں کوئی ہیڈ لائن نظر نہیں آتی۔ وہ کوئی نعرہ نہیں لگاتے۔ فیضؔ اپنی بات کو پرچم کی طرح تان دیتے تھے۔ فراؔق اپنی بات کا اعلان کرتے تھے۔ فراؔز بھی۔ اُن کی بات بڑی واضح ہوتی تھی اور سُرخی بن جاتی تھی۔ شہر یاؔر اِن سب سے سَٹل ''Subtle'' شاعر ہیں۔ جس طرح پڑھتے ہیں، ویسا ہی لکھتے ہیں۔ اور جیسا لکھتے ہیں ویسے ہی پڑھتے ہیں۔ پورے صبر اور تحمل سے بات کرتے ہیں۔ اُن کا کہا، کنول کے پتّے پر گری بُوند کی طرح دیر تک تھرکتا رہتا ہے۔ شعر سُن کر دیر تک کان میں گونجتا ہے۔

وہ گھٹا کی طرح اُمڑ کر نہیں آتے۔ بیش تر شاعروں کی طرح۔ اُٹھ کر کھڑکیاں بند نہیں کرنی پڑتیں کہ اندر کے دَری، غالیچے بھیگ جائیں گے۔ بلکہ اُٹھ کر کھڑکی کھولیں تو پتہ چلتا ہے کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔

انقلاب کی آواز فیضؔ کے ہاں بھی سُنائی دیتی ہے۔ فراؔز کے ہاں بھی۔ لیکن یوں خود کلامی کے انداز میں صرف شہر یاؔر کے ہاں سُنائی دیتی ہے۔ آگاہی ہے، لیکن یوں جیسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کوئی سمجھا رہا ہے۔

اُدھر دیکھو ہوا کے بازوؤں میں
ایک آہٹ قید سے۔۔۔
۔۔۔ اگر تم چاہتے ہو
اس زمیں پر حکمرانی ہو تمہاری
تو میری بات مانو۔۔۔
ہوا کے بازوؤں میں قید اِس آہٹ کو
اب آزاد کر دو!!

''فیصلے کی گھڑی'' ایک اور ایسی ہی نظم ہے۔

بارشیں پھر زمینوں سے ناراض ہیں
اور سمندر سبھی خشک ہیں
کھُردری، سخت بنجر زمینوں میں کیا بو یئے اور کیا کاٹیے!
آنکھ کی اوس کے چند قطروں سے کیا اِن زمینوں کو سیراب کر
پاؤ گے؟۔۔۔۔

میں نقاد نہیں، نہ ہی ماہرِ فن یا زبان اور گرامر کا ماہر۔۔۔ میں محض ایک شہر یاؔر کا مداح اور اُن کی شاعری کو محسوس کرنے والا شاعر ہوں۔

شہر یاؔر عموماً غزل ہی سُناتے ہیں۔ کسی محفل میں ہوں یا مشاعرے میں۔ مگر مجھے اُن کا لہجہ ہمیشہ نظم کا لگتا ہے۔ بات صرف اتنی نہیں ہوتی۔ جتنی وہ ایک شعر میں بند کر دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر وہیں رُکو، تو ہر شعر کے پیچھے ایک نظم کھلنے لگتی ہے۔

تمہارے شہر میں، کچھ بھی ہوا نہیں ہے کیا؟
کہ تم نے چیخوں کو، سچ مچ سُنا نہیں ہے کیا؟

اس شعر کے پیچھے کی نظم کھولو تو ایک اور شعر سُنائی دیتا ہے۔

تمام خلقِ خدا اُس جگہ رُکی کیوں ہے؟
یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں ہے کیا؟
رُکیے اور پھر چلیے۔۔۔
لہولہان سبھی کر رہے ہیں سُورج کو
کسی کو خوف یہاں رات کا نہیں ہے کیا؟

تمام شعر پھر سے پڑھ جایئے۔ اور بتایئے یہ نظم نہیں ہے کیا؟

شہر یاؔر اپنی غزلوں کے لئے بہت جانے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے شاید اس لئے کہ اُن کی غزل کا شعر صرف ایک quote بن کر رُک نہیں جاتا۔ ایک تسلسل ہے۔ بیان میں اختصار اور لہجے کی نرمی اُن کا خاص انداز ہے۔ سارا کلام پڑھ جاؤ، کہیں غصّے کی اونچی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ زخم ہیں، درد ہیں، لیکن چیخنے نہیں۔

سنّاٹوں سے بھری بوتلیں بیچنے والے
میری کھڑکی کے نیچے پھر کھڑے ہوئے ہیں
اور آوازیں لگا رہے ہیں
بستر کی شکنوں سے نکلوں
نیچے جاؤں
اُن سے پوچھوں
میری رُسوائی سے اُن کو کیا ملتا ہے!

پوری نظم ایک جملہ کی طرح بہتی ہے۔ اور اس کا دوسرا جملہ ہے۔

میر پاس کوئی بھی کہنے والی بات نہیں ہے
سُننے کی طاقت بھی کب کا گنوا چُکا ہوں!

نظم ہو یا غزل ہو، گفتگو کا یہ انداز سراسر اُن کا اپنا ہے۔

بندشیں اتنی آسان ہیں کہ کوشش کرو تو لکھنا مشکل ہے۔ بات کہنے میں کوئی effort نظر نہیں آتی۔ لگتا ہے سوچ رہے ہیں۔ Loud thinking کر رہے ہیں۔

تجھ سے ملنے کی، تجھ کو پانے کی
کوئی تدبیر، سوجھتی ہی نہیں
ایک منزل پہ رُک گئی ہے حیات
یہ زمیں جیسے گھومتی ہی نہیں

عجیب چیز ہے یہ، وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے!

''ہونٹوں سے نہیں لکھی''، ''چپکے سے اِدھر آ جاؤ''، ''ہوس سوا کوئی نہیں'' اعتراف، ایک ایک لمبی سانس کی نظمیں ہیں۔ اختصار خصوصیت ہے۔ پانچ سات نومصرعوں میں نظم پوری ہو جاتی ہے۔ بات صرف اتنی ہی کہتے ہیں جتنی تاثر دے جائے۔ بات کو افسانہ نہیں بنا دیتے۔ شروع شروع میں، لمبی نظمیں ملتی ہیں، جیسے جیسے اُن کا قد اونچا ہوتا گیا، نظمیں چھوٹی ہوتی گئیں۔ سارا کلام ایک بار پھر دوہرایا تو ایک اور بات کا احساس ہوا، کوئی Metropolis شہر نظر نہیں آتا۔۔۔اور نہ ہی دیہات نظر آتا ہے۔

دیہات ہے، مگر کہیں کہیں، داغ دھبے کی طرح۔ مگر چھوٹے شہر، یا پُرانے شہروں کی تہذیب مہکتی ہے، بیان میں بھی، موضوعات میں بھی۔ مڈل کلاس کے درد دھڑکتے ہیں۔ جنہیں سہلانے میں اتنا ہی مزہ آتا ہے جتنا بھرتے ہوئے زخموں پر ہاتھ پھیرنے کا مزہ آتا ہے۔

رات، دن، سورج، پیاس، پانی۔ احساس ہر بار اُن کی شکلیں بدل دیتا ہے۔
رات کبھی صحرا ہو جاتی ہے، کبھی دریا! اور پھر دن کبھی دریا ہو جاتا ہے کبھی صحرا۔

دن کے صحرا سے جب بنی جاں پر
رات کے اس اتھاہ دریا میں
خواب کی کشتیوں کو کھیتے ہیں۔۔۔
(فریب در فریب)

دو قدم اور ۔۔۔ دُور ہے کتنا
شب کے صحرا سے، صبح کا دریا!

سمیٹ لیتا ہے جب چاند اپنی کرنوں کو
تو دن کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں
یوں ہی ہمیشہ طلوع و غروب ہوتے ہیں!!
(سائے)

بڑے کمال کا مصرع ہے۔

تم پیاس کی شدت میں بھی سراب کو دریا نہیں کہنے والے۔

اور تائید میں اچھا شعر ہے۔

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو
میں دیکھتا رہا دریا تری روانی کو

شراب پینے سے، نہ آدمی چھوٹا ہوتا ہے، نہ شاعر! غالبؔ نہیں ہوئے تو شہریار کیوں ہوں گے۔ شراب اتنے ہی شوق سے پی۔ لیکن شراب کا اس سے خوبصورت سفر میں نے پہلے نہیں پڑھا۔

ابھی بوتلوں کے بدن میں تھی
ابھی اک گلاس کی تہہ میں تھی
ابھی قطرہ قطرہ لرز رہی تھی
لبوں کی زرد، منڈیر پر
ابھی حلق میں، ابھی دل میں تھی
ابھی، ہاں ابھی ابھی، بس ابھی
کسی ریگزار میں کھو گئی۔۔۔ (زندگی کی خواہش)

کلام پڑھ کر، وہ کسی سیاسی پارٹی کے نہیں لگتے۔ نہ ہی کسی خاص سیاسی رجحان سے جُڑے نظر آتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ ملک کی سیاست سے بے بہرہ ہوں۔ یا ''ری ایکٹ'' (react) نہ کرتے ہوں۔ سیاست سے متاثر ہو کر ایک عام شہری کی طرح اظہار بھی کرتے ہیں اور احتجاج بھی۔ لیکن بالکل اپنی طرح۔ نعرہ نہیں لگاتے، ہوا میں مُٹھیاں نہیں لہراتے، لیکن ناخوشی اور مایوسی کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔ خوش ہونے کی یوں بھی سیاست میں کوئی وجہ کبھی نظر نہیں آئی۔۔۔ یہ احتجاج اور اس کی حرارت، کس درجہ ہے کچھ کچھ اِن نظموں سے نظر آ جاتی ہے۔ (تھرمامیٹر لگا کر دیکھ لیجئے۔)

درندوں کی لڑائی کی
کوئی تازہ خبر جنگل سے آئی ہے۔۔۔۔۔ (تازہ قبر)

نفرت بھرے اس شہر میں،
دن رات کٹتے ہیں مرے
میرے بدن میں خون کی مقدار کتنی ہے مجھے
بتلانے والے ہاتھ بھی لاچار ہیں۔۔۔ (خوف ساعت)

بے حِسی کے صحرا میں
خوں کو جذب کرنے کی
اب سکت نہیں باقی۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (فسادات کی زبان سے)

عوام کے لیے، اپنی ایک نثری نظم میں لکھتے ہیں:

تمہاری تلوار زنگ آلُود ہے
اس لئے کہ تم نے اُسے کبھی استعمال نہیں کیا
اور استعمال کرتے بھی تو کیسے
تم اپنے دشمنوں سے ناواقف تھے۔۔۔۔ (ساتواں دَر)

ایک اور غزل جو گرہیں کھولتے جاؤ تو نظم ہو جاتی ہے۔

ایک ہی دھن ہے کہ اِس رات کو ڈھلتا دیکھوں
اپنی ان آنکھوں سے سوُرج کو نکلتا دیکھوں

اے جنوں تجھ سے تقاضا ہے یہی دل کا مرے

شہرِ اُمید کے نقشے کو بدلتا دیکھوں

(شام ہونے والی ہے)

اب یہ بھی ممکن نہیں کہ پوری کی پوری نظمیں یہیں سُنا دی جائیں۔ کچھ کچھ quote کی ہیں اور آگے نقطے لگا دیئے ہیں۔۔۔ایک اور نظم جو بڑی پُراثر ہے۔

عنوان ہے، ''آنکھ کا کام ہے۔۔۔''

''آنکھ کا کام ہے دیوار میں روزن کرنا۔۔۔۔

مرد عورت کے رشتوں پر سب نظمیں کہتے ہیں۔ اُس میں کچھ باتیں کوئی نہیں کہتا۔ شہریار کہتے ہیں اور بڑے خوبصورت انداز میں کہتے ہیں۔ مرد اور عورت کا وجود اصلی لگتا ہے۔ افسانوی نہیں، تخیلی نہیں۔

رات تجھے سپنے میں دیکھا
تجھ کو چھونے کی خواہش کو
کتنی دُشواری سے ٹالا۔۔۔ (بزدل ہونے کا خمیازہ)

تمہارے میرے درمیاں
ہوس سوا کوئی نہیں۔۔۔
کبھی تم اپنے جسم سے
الگ مجھے مِلو کہیں۔۔۔ (ہوس سوا کوئی نہیں)

یہ طرزِ اظہار بہت اچھا ہے۔۔۔اور انوکھا ہے۔

آؤ میں تم پر ہوس اسرار کھولوں
لب ترازو میں تمہیں تا دیر تولوں۔۔۔ (بدن کے بند)

میرا تو اِرادہ تھا
ہونٹ سیڑھیوں سے مَیں
آسمان تک جاؤں۔۔۔
اس وجودِ خاکی میں
جسم کچھ زیادہ تھا!۔۔۔۔ (میرا تو اِرادہ تھا)

ایک نظم جو مجھے صرف اس لئے پسند ہے، کہ وہ شہریار کا لہجہ ہے۔

ڈوبتی شام کے اُس پار
کھڑے تھے جو لوگ
ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے
کہ اُن لوگوں کی
مٹھیاں بند تھیں

یہ ریت کہاں سے آئی؟۔۔۔ (نیند کی کرچیں)

اور آخر میں ایک شعر شہریار کی طرف سے

زمیں نے ہم کو بہت دیر میں قبول کیا
جلی حروف میں یہ بات لکھے جاتے ہیں!

☆

''پرواز''

یہ زمیں میری میرا آسماں
بڑا خوبصورت ہے جہاں
میری زندگی پرواز ہے
وہ فضا میری میں اُڑوں جہاں
کبھی دھوپ لیپ کے آسماں
ہم نے سنہری کرلیا
پھر دھوپ باندھ کے پاؤں میں
ہم اُڑے ہیں ٹھنڈی ہواؤں میں
کبھی وقت اُٹھا کے سروں پہ ہم
اور آگ لے کے پروں پہ ہم
کبھی چھانی خالی خلا کہیں
ہم اُڑے جہاں پہ ہوا نہیں
میری زندگی پرواز ہے

ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام

(سابق صدر جمہوریہ ہند)

کی کتاب ''Wing of Fire'' سے منتخبہ

ترجمہ: گلزار

○

''نکتہ چیں ہے غمِ دل''

گلزار

جاوید صاحب۔۔۔آپ کے سوالوں کے صدقے!

جو میری سمجھ میں آئے، اُن کے جواب دے رہا ہوں۔ جو آپ سمجھا رہے تھے اُنہیں چھوڑ دیا۔

کبھی کبھی ایک دانشور ''انٹرویور'' بھی اتنا عام ہونے کی کوشش کرتا ہے جتنا، عام آدمی ہے نہیں۔ عام آدمی کو کوئی دلچسپی نہیں کہ، آپ نے پاؤں پہ کلہاڑی ماری کہ کلہاڑی پہ پاؤں! لیکن انٹرویور سمجھتا ہے کہ وہ کوئی نیا Sensation پیدا کر رہا ہے۔ ایسا ہوتا نہیں۔ کچھ لوگوں نے روایت بنا رکھی ہے کہ ایک تخلیق کار کی زندگی ذاتی نہیں ہوتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بہت ذاتی ہوتی ہے۔ تخلیق کار، ماں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی تخلیق اتنی ہی ذاتی ہے جتنی ماں کی کوکھ! اُسے وہی احترام دینا لازم ہے۔۔۔!

ایک فنکار اپنے اور اپنے سماج کی تجربات کا اظہار اپنے فن کے ذریعے کرتا ہے۔ اور وہ تمام غیر ضروری تفصیلات خارج کر دیتا ہے، جو ابہام پیدا کرتی ہیں۔ اصل بات اور اصل مدعا صاف کر کے سامنے رکھنا ہی فنکار کا کام ہے۔

جیسے آپ نے پوچھا، تقسیم کے حادثات کا آپ پر کیا اثر ہوا؟

سنیئے۔۔۔!

ہم سب بھاگ رہے تھے
ریفیوجی تھے
ماں نے جتنے زیور تھے، سب پہن لیے تھے
باندھ لیے تھے
چھوٹی مجھ سے۔۔۔ چھ سالوں کی
دُودھ پلا کے، خُوب کھلا کے، ساتھ لیا تھا
میں نے اپنی ایک ''بھمیری'' اور اک ''لاٹو''
پاجامے میں اڑس لیا تھا
رات کی رات ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے
ریفیوجی تھے۔۔۔

آگ دھوئیں اور چیخ پکار کے جنگل سے گُزرے تھے سارے
ہم سب کے سب گھور دھوئیں میں بھاگ رہے تھے
ہاتھ کسی آندھی کی آنتیں پھاڑ رہے تھے
آنکھیں اپنے جبڑے کھولے بھونک رہی تھیں
ماں نے دوڑتے دوڑتے خون کی قے کر دی تھی

جانے کب چھوٹی کا مجھ سے چھوٹا ہاتھ
وہیں اُسی دن پھینک آیا تھا اپنا بچپن۔۔۔
لیکن میں نے سرحد کے سناٹوں کے صحراؤں میں اکثر دیکھا ہے
ایک ''بھمیری'' اب بھی ناچا کرتی ہے
اور ایک ''لاٹو'' اب بھی گھوما کرتا ہے۔۔۔

اب بتایئے اس میں کرداروں کے نام اور جگہوں کے نام سے کیا اضاف ہوگا۔ جنھیں کوئی پہچانتا ہی نہیں۔ بابا نے (احمد ندیم قاسمی) ایک افسانہ ''پرمیشور سنگھ'' لکھ کر تقسیم میں مذہب کا پورا المیہ بیان کر دیا۔ منٹو نے ''سیاہ حاشیے'' لکھ کر تقسیم کی ساری داستان کہہ دی۔ اُس میں ذاتی ناموں کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے ''راوی پار'' افسانہ اور دُوسری نظموں میں وہ تمام تاثرات بیان کئے ہیں جو مجھ پر گزرے۔۔۔ ''خوف'' نام کی کہانی آپ کے پاس ہے۔ ضرور چھاپ لیجیے گا۔ یا ''دُھواں'' وہ بھی اچھا افسانہ ہے۔

شہر ''دینہ'' سے تعلق میرا؟ میری پیدائش وہاں کی ہے۔ آپ نے پوچھا ہے، کتنا یاد ہے۔ سنیئے۔۔۔!

اگر ایسا بھی ہو سکتا۔۔۔
تمہاری نیند میں سب خواب اپنے منتقل کر کے
تمہیں وہ سب دِکھا سکتا، جو میں خوابوں میں اکثر دیکھا کرتا ہوں!

یہ ہو سکتا اگر ممکن
تمہیں معلوم ہو جاتا
تمہیں میں لے گیا تھا، سرحدوں کے پار دِینہ میں
تمہیں وہ گھر دکھایا تھا۔۔۔ جہاں پیدا ہوا تھا میں
جہاں چھت پر لگا سریوں کا جنگلا، دھوپ سے دن بھر
ہرے آنگن میں شطرنجی بناتا تھا، مٹاتا تھا

دکھائی تھیں تمہیں وہ کھیتیاں سرسوں کی، دِینے میں، کہ جس کے
پیلے پیلے پھول تم کو خواب میں کچے کھلائے تھے
وہیں ایک راستہ تھا ''ٹہلیوں'' کا جس پہ میلوں تک پڑا کرتے تھے
جھولے سوندھے ساون کے
اُسی کی سوندھی خوشبو سے، مہک اُٹھتی ہیں آنکھیں
جب کبھی اس خواب سے گذروں

تمھیں رہتاس کا چلتا کنواں بھی تو دکھایا تھا
قعلے میں بند رہتا تھا جو دن بھر، رات کو گاؤں میں آ جاتا تھا
کہتے ہیں۔۔۔
تمھیں کالا سے کالووال تک لے کر اُڑا ہوں میں
تمھیں دریائے جہلم پر عجب منظر دکھائے تھے
جہاں تربوز پر لیٹے ہوئے تیراک لڑکے بہتے رہتے تھے
جہاں تنگڑے سے اک سردار کی پگڑی پکڑ کر میں
نہاتا، ڈبکیاں لیتا، مگر جب غوطہ آ جاتا تو میری نیند کھُل جاتی

مگر یہ صرف خوابوں ہی میں ممکن ہے
وہاں جانے میں اب دشواریاں ہیں کچھ سیاست کی
وطن اب بھی وہی ہے، پرنہیں ہے ملک اب میرا
وہاں جانا ہو اب تو دو دو سرکاروں کے دَسیوں دفتروں سے
شکل پر، لگوا کے مہریں، خواب ثابت کرنے پڑتے ہیں!!
کوئی واقعہ؟ وہ بھی سُن لیجیے!
بڑی سی ایک لڑکی تھی
مِرا بستہ پکڑ کے، اور دروازے کے پیچھے کھینچ کر مجھ کو
مِرے بستے سے اس نے گاچنی مٹی چرائی تھی
کُتر کے دانت سے وہ مسکرائی تھی!
مِرے گالوں پہ چپّی لے کے بولی تھی
''مجھے دے دے یہ مٹّی!
مجھ کو تختی پوت کر اک نام لکھنا ہے!''
''وہ کوئی حاملہ ہوگی!'' مجھے ماں نے بتایا تھا!

میں شاید چھ برس کا تھا
مَیں اب چھتر برس کا ہوں
میں اب بھی حاملہ ہوں یاد سے اس کی
وہ لڑکی اب بھی مجھ کو یاد آتی ہے!

ہاں، وہ ٹینس پر۔ بہت اچھا سوال ہے آپ کا۔۔۔!
وہ نیکر پہن کر علیٰ الصبح بلاّ ہاتھ میں لے کر گیند کے ساتھ دھول دھپّا کرنا۔ اردو کے شاعر کو زیب نہیں دیتا۔ بہت ہی غیر شاعرانہ عادت ہے۔ بڑی مجبوری ہے جاوید صاحب، اچکن پہن کر ٹینس نہیں کھیل سکتا، اور نیکر پہن کر مشاعرے میں نہیں جا سکتا۔
اور آپ کا یہ پوچھنا کہ ہمیشہ سفید لباس ہی پہننے کی وجہ کیا ہے؟

اب ہر بات کی وجہ کہاں ہوتی ہے۔ میں پوچھوں کہ آپ کو کھیر کیوں اچھی لگتی ہے۔ یا غالبؔ کو آم کیوں پسند تھے۔ اور اُس پر چچا کوئی وجہ بتا کر بھی نہیں گئے۔ سفید مجھے پسند ہے اس لئے پہنتا ہوں۔ اس کی وجہ کیا کہوں اور کہاں سے تلاش کروں۔ ہاں بیگن پسند نہیں۔ سو نہیں کھاتا۔ ایک بار اندر کا جالا کچّا رہ گیا تھا۔ کھالیا۔ اُلٹی ہوگئی۔ تبھی سے دل سے اُتر گیا۔
بیگن پر کوئی نظم نہیں ہے میری۔ نہ افسانہ ہے۔
دین، دھرم اور خدا؟

کیا پتہ یہ اُس کا نام ہی نہ ہو
کیوں خُدا خدا بُلا رہا ہوں میں

اور اساتذہ؟

کئی اُستادوں سے سیکھا تھا ہم نے
تمھیں سب سے بڑے اُستاد نکلے

وقت کے حوالے سے کئی نظمیں ہیں۔ ایک میری اپنی پسند کی سُن لیجیے۔ آپ کی پسند کی کوئی دوسری ہو تو وہ بھی چھاپ دیجیے۔ سنیئے۔۔۔!

تمہاری فرقت میں جو گزرتا ہے، اور پھر بھی نہیں گزرتا
میں وقت کیسے بیاں کروں، وقت اور کیا ہے؟
کہ وقت بانگِ جرس نہیں جو بتا رہا ہے کہ دو بجے ہیں
کلائی پر جس عقاب کو باندھ کر سمجھتا ہوں وقت ہے،
وہ وہاں نہیں ہے!
وہ اُڑ چکا
جیسے رنگ اُڑتا ہے میرے چہرے کا، ہر تحیّر پہ، اور دِکھتا نہیں کسی کو
وہ اُڑ رہا ہے کہ جیسے اس بیکراں سمندر سے بھاپ اُڑتی ہے
اور دِکھتی نہیں کہیں بھی

قدیم وزنی عمارتوں میں
کچھ ایسے رکھا ہے جیسے کاغذ پہ بٹّا رکھ دیں
دبا دیں، تاریخ اُڑ نہ جائے
میں وقت کیسے بیاں کروں، وقت اور کیا ہے؟

کبھی کبھی وقت یوں بھی لگتا ہے مجھ کو جیسے
غلام ہے
آفتاب کا اک دہکتا گولا اُٹھا کے ہر روز پیٹھ پر وہ
فلک پہ چڑھتا ہے چپّہ چپّہ قدم جما کر
وہ پورا کہسار پار کر کے
اتارتا ہے، اُفق کی دہلیز پر دہکتا ہوا سا پتھر

ٹکا کے کے پانی تپلی سُتلی پہ، لوٹ جاتا ہے اگلے دن کا اُٹھانے گولہ
اوراس کے جاتے ہی
دھیرے دھیرے وہ پورا گولہ نگل کر باہر نکلتی ہے
رات اپنی پیلی سی جیبھ کھولے
غلام ہے وقت گردشوں کا
کہ جیسے اس کا غلام میں ہوں!!

میرے الفاظ کے انتخاب کے بارے میں پوچھا آپ نے۔۔۔؟
اک نظم کا مصرعہ گستے ہوئے
الفاظ کے جنگل میں گھس کر
مخصوص کوئی معنی جب توڑ کے لاتا ہوں
ہاتھوں پہ خراشیں پڑتی ہیں
اور اُنگلیاں چِھل جاتی ہیں مگر
وہ لفظ زباں پہ رکھتے ہی
مُنہ میں اک رَس گھل جاتا ہے!

بہت جگہ آپ جب کہتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں۔ تو آپ جیسے خود کو الگ کر لیتے ہیں۔ کون لوگ ہیں؟ کوئی حوالہ؟ کوئی نام؟ مجھ سے تو کوئی نہیں کہتا۔ اور دیگر یہ کہ کیا آپ اُن لوگوں میں شامل ہیں؟

اشوک ترپاٹھی اور اجیت پشکل کا ایک حوالہ آپ نے دیا ہے دو دہائیاں پہلے کچھ کہا تھا، کہ میں نامکمل کہانیاں لکھتا ہوں۔ کیا کہا تھا آپ درج کر دیجیے۔ میں نے تو نہیں پڑھا۔ اور اگر آپ اُن سے متفق ہیں تو آپ بتایئے، کیوں؟۔۔۔ اور اگر متفق نہیں ہیں تو آپ نے کیا جواب دیا؟

فلم نہیں بنا رہا ہوں کیونکہ
اور بھی غم ہیں زمانے میں فلموں کے سوا۔۔۔
اُن غموں میں بھی شریک ہونا چاہتا ہوں۔ فلم دن رات، سب خرچ کر دیتی ہے۔ پھر کچھ نہیں بچتا۔ ہزار فن ہیں اور ایک زندگی۔۔۔ اور لالچ ہے بہت کچھ جینے کا!

''زندگی کی پرواز''

قومی ایوارڈ

بہترین اسکرین پلے ''کوشش''	1972
بہترین ہدایت کار ''موسم''	1976
بہترین گیت کار ''میرا کچھ سامان'' (اجازت)	1988
بہترین گیت کار ''یارا سیلی سیلی'' (لیکن)	1991
بہترین ڈاکومنٹری ''استاد امجد علی خان''	1991
بہترین ڈاکومنٹری ''پنڈت بھیم سین جوشی''	1993
بہترین تفریحی فلم ''ماچس''	1996

فلم فیئر ایوارڈ

بہترین مکالمے ''آنند''	1971
بہترین مکالمے ''نمک حرام''	1973
بہترین فیچر فلم (ناقدین) ''آندھی''	1975
بہترین ہدایت کار ''موسم''	1976
بہترین گیت کار ''دو دیوانے شہر میں'' (گھروندا)	1977
بہترین گیت کار ''آنے والا پل جانے والا ہے (گول مال)	1979
بہترین گیت کار ''ہزار راہیں مڑ کے دیکھیں'' (تھوڑی سی بے وفائی)	1980
بہترین گیت کار ''تجھ سے ناراض نہیں زندگی'' (معصوم)	1983
بہترین گیت کار ''میرا کچھ ساماں۔۔۔'' (اجازت)	1988
بہترین گیت کار ''یارا سیلی سیلی۔۔۔'' (لیکن)	1991
بہترین ڈاکومنٹری ''استاد امجد علی خان''	1991
بہترین مکالمے ''ماچس''	1996
بہترین کہانی ''ماچس''	1996
بہترین گیت کار ''چل چھیا چھیا'' (دل سے)	1998
تاحیات خدمات کا انعام	2002
بہترین گیت کار ''ساتھیا۔۔۔'' (ساتھیا)	2003
بہترین مکالمے (ساتھیا)	2003

صدارتی خطاب

پدم بھوشن	2004

دیگر اعزازات

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کی طرف سے تاحیات اعزازی فیلوشپ	2001
ساہتیہ اکاڈمی سے اردو افسانوی مجموعہ ''دھواں'' پر انعام	2003
سمبل پور یونیورسٹی سے گنگادھر نیشنل ایوارڈ	2006

''نورآ گیا ہے''

گلزار صاحب کی فلموں سے چنیدہ گیت

نند کشور وکرم
(دہلی، بھارت)

خاموشی

ہم نے دیکھی ہے اُن آنکھوں کی مہکتی خوشبو
ہاتھ سے چھو کے اسے رشتوں کا الزام نہ دو
صرف احساس ہے یہ، روح سے محسوس کرو
پیار کو پیار ہی رہنے دو، کوئی نام نہ دو
پیار کوئی بول نہیں، پیار آواز نہیں
ایک خاموشی ہے، سنتی ہے، کہا کرتی ہے
نہ یہ بجھتی ہے، نہ رکتی ہے، نہ ٹھہری ہے کہیں
نور کی بوند ہے، صدیوں سے بہا کرتی ہے
ہم نے دیکھی ہے اُن آنکھوں کی ......

مسکراہٹ سی کِھلتی ہے آنکھوں میں کہیں
اور پلکوں پہ اُجالے سے جھکے رہتے ہیں
ہونٹ کچھ کہتے نہیں، کانپتے ہونٹوں پہ مگر
کتنے خاموش سے افسانے رُکے رہتے ہیں
ہم نے دیکھی ہے اُن آنکھوں کی ......

○

انُو بھَو

میرا دل جو میرا ہوتا
پلکوں سے پکڑ لیتی
ہونٹوں پہ اُٹھا لیتی
ہاتھوں میں خُدا ہوتا
سورج کو مسل کر میں
چندن کی طرح ملتی
سونے کا بدن لے کر
کندن کی طرح جلتی

اس گورے سے چہرے پر
آئینہ فدا ہوتا
میرا دل......

برسا ہے کئی برسوں
آکاش سمندر میں
اک بوند ہے چندا کی
اتری نہ سمندر میں

دو ہاتھوں کی اوک میں یہ
گر پڑتا تو کیا ہوتا
ہاتھوں میں خُدا ہوتا......

○

آنند

میں نے تیرے لئے ہی سات رنگ کے سپنے چُنے
سپنے، سریلے سپنے
کچھ ہنستے، کچھ غم کے
تیری آنکھوں کے سائے
چرائے رسیلی یادوں نے

چھوٹی باتیں، چھوٹی چھوٹی باتوں کی ہیں یادیں بڑی
بھُولے نہیں، بیتی ہوئی اک چھوٹی گھڑی
جنم جنم سے آنکھیں بچھائی تیرے لئے ان راہوں میں
میں نے تیرے لئے ہی سات رنگ کے سپنے چُنے
سپنے، سریلے سپنے
بھولے بھالے، بھولے بھالے دل کو بہلاتے رہے
تنہائی میں، تیرے خیالوں کو سجاتے رہے
کبھی کبھی تو آواز دیکر مجھ کو جگایا خوابوں نے
میں نے تیرے لیے ہی سات رنگ کے سپنے چُنے
سپنے، سُریلے سپنے

○

پرتیچے

بیتی نہ بتائی رینا
برہا کی جائی رینا
بھیگی ہوئی انکھیوں نے
لاکھ بجھائی رینا

بیتی ہوئی بتیاں کوئی دوہرائے
بھولے ہوئے ناموں سے کوئی تو بلائے

چاند کی بندی والی
بندی والی رتیاں
جاگی ہوئی انکھیوں میں
رات نہ آئی رینا

بیتی نہ بتائی رینا......
یگ آتے ہیں اور یگ جائیں
چھوٹی چھوٹی یادوں کے پل نہیں جائیں
جھوٹ سے کالی لاگیں
روٹھی کالی رتیاں
لاکھ منائی رینا
بیتی نہ بتائی رینا......

○

آندھی

تم آ گئے ہو نورآ گیا ہے
نہیں تو چراغوں سے لو جاتی رہی تھی
جینے کی تم سے وجہ مل گئی ہے
بڑی بے وجہہ زندگی جارہی تھی

کہاں سے چلے کہاں کے لیے
یہ خبر نہیں تھی مگر
کوئی بھی سرا جہاں جا ملے
وہیں تم ملو گے
کہ ہم تک تمہاری دعا آ رہی تھی
تم آ گئے ہو نورآ گیا ہے......

دن ڈوبا نہیں، رات ڈوبی نہیں
جانے کیسا ہے سفر
خوابوں کے دئے، آنکھوں میں لئے
وہاں آ رہے تھے
جہاں سے تمہاری صدا آ رہی تھی
تم آ گئے ہو نورآ گیا ہے
نہیں تو چراغوں سے لَو جارہی تھی

○

دیوتا

جب ایک قضا سے گزرو تو
اک اور قضا مل جاتی ہے
مرنے کی گھڑی ملتی ہے اگر
جینے کی سزا مل جاتی ہے
اس درد کے بہتے دریا میں
ہر غم ہے مرہم، کوئی نہیں
ہر درد کا عیسیٰ ملتا ہے
عیسیٰ کی مریم کوئی نہیں
سانسوں کی اجازت ملتی نہیں
جینے کی سزا مل جاتی ہے
میں وقت کا مجرم ہوں لیکن
اس وقت نے نیا انصاف کیا
جب تک جیتے ہو، جلتے رہو
جل جاؤ تو کہنا معاف کیا
جل آئے ذرا سی چنگاری
تو اور ہوا مل جاتی ہے
کچھ ایسے قسمت والے ہیں
کہ جن کی قسمت ہوتی نہیں
ہنسنا بھی منع ہوتا ہے انہیں
رونے کی اجازت ہوتی نہیں
بے نام سا موسم جیتے ہیں
بے رنگ قضا مل جاتی ہے

○

کنارہ

نام گُم جائے گا، چہرہ یہ بدل جائے گا
میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے
وقت کے ستم کم حسیں نہیں
آج ہیں یہاں، کل کہیں نہیں
وقت سے پرے اگر مل گئے کہیں
میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے
جو گزر گئی کل کی بات تھی
عمر تو نہیں، ایک رات تھی
رات کا سِرا اگر پھر ملے کہیں
میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے
دن ڈھلے جہاں رات پاس ہو
زندگی کی لَو، اونچی کر چلو
یاد آئے گر کبھی جی اداس ہو
میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے
نام گُم ہو جائے گا، چہرہ یہ بدل جائے گا
میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے

○

تھوڑی سی بے وفائی

آج بچھڑے ہیں، کل کا ڈر بھی نہیں
زندگی اتنی مختصر بھی نہیں

زخم دکھتے نہیں ابھی لیکن
ٹھنڈے ہونگے تو درد نکلے گا
طیش اترے گا وقت کا جب بھی
چہرہ اندر سے زرد نکلے گا
آج بچھڑے ہیں......

کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا
سہنے والے کمال کرتے ہیں
کون ڈھونڈے جواب دردوں کے
لوگ تو بس سوال کرتے ہیں
آج بچھڑے ہیں......

کل جو آئے گا جانے کیا ہوگا
بیت جائیں جو کل، نہیں آتے
وقت کی شاخ توڑنے والوں
ٹوٹی شاخوں پہ پھل نہیں آتے
آج بچھڑے ہیں......

کچی مٹی ہے، دل بھی، انساں بھی
دیکھنے ہی میں سخت لگتا ہے
آنسو پونچھیں تو آنسوؤں کے نشاں
خشک ہونے میں وقت لگتا ہے

آج بچھڑے ہیں، کل کا ڈر بھی نہیں
زندگی اتنی مختصر بھی نہیں

بمل رائے کا جانشیں

خواجہ احمد عباس

(۵)

جیسا نام ویسا کام!

اپنے دماغ اور الفاظ سے فلمی دنیا میں گل وگلزار کھلاتا ہے۔آج سے نہیں کوئی پچیس سال سے جانتا ہوں۔جب ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں آیا کرتا تھا۔ یہ میٹنگ کبھی کبھی ہمارے گھر پر بھی ہوا کرتی تھی۔گھر میں اتنی کرسیاں تھیں نہیں کہ سب ان پر بیٹھ سکیں۔اس لئے کرسیاں ہٹا کر دری کا فرش بچھا دیا جاتا تھا۔ کچھ لوگ آگے بیٹھتے تھے۔ جیسے علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، ساحر اور مجروح وغیرہ۔کچھ نوجوان کونے میں چھپ کر بیٹھتے تھے ان میں ہی ایک نوجوان گلزار تھا۔۔۔آج وہ کونے سے نکل کر سرِ محفل آ گیا ہے۔جہاں بھی جاتا ہے اس کی قابلیت کی شہرت اس کے ساتھ جاتی ہے۔کل وہ گمنامی کا گلزار تھا آج شہرت کا گلزار ہے۔

مگر سفید کرتا پاجامہ اس وقت بھی پہنا کرتا تھا آج بھی اسے سفید لباس ہی پسند ہے۔ ویسے تب وہ ململ کا کرتا اور لٹھے کا پاجامہ پہنا کرتا تھا آج دونوں ٹیرلین کے کپڑے ہیں مگر دور سے وہی لگتا ہے۔اس کو کہتے ہیں وضع داری!

سنا ہے یہ نوجوان سکھ ہے۔ پہلے داڑھی بھی رکھا کرتا تھا میں نے کہیں کسی کتاب میں تصویر بھی دیکھی ہے جس میں ایک نوجوان کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی ان دنوں وہ دہلی میں پڑھتا تھا۔

اب جب سے بمبئی میں آیا ہے اپنا اصلی نام وہیں چھوڑ آیا ہے۔ تخلص ہی نام ہو گیا ہے۔ پہلے بمل رائے جیسے بڑے ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ رہا۔ ڈائیلاگ لکھے، گیت لکھنے شروع کیے اور بنگلہ سیکھی۔ پھر اس کے ڈائیلاگ اور گیتوں کی شہرت ہو گئی۔ کیونکہ ان میں ادبیت ہوتی تھی۔اور ہوتا تھا صاف ستھر انداز۔ بمل رائے خود بہت سنجیدہ آدمی تھے۔ ان کی فلم میں ڈائیلاگ لکھنا آسان کام نہیں تھا۔لیکن گلزار ایسا فٹ بیٹھا، جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

جب بمل دا کا انتقال ہوا تب کسی نے پوچھا اب بمل دا کی جگہ کون لے گا؟ اچانک میرے منہ سے نکلا......گلزار!

اور یہی ہوا بھی۔

وہی سنجیدہ انداز...... وہی عام رَوِش سے ہٹ کر فلمیں بنانے کی خواہش۔

پہلے کبھی جب سڑک پر یا گھر پر میری گلزار سے ملاقات ہوتی تھی تو بات چیت کرتے تھے تو مینا کماری کے بارے میں ۔۔۔میں بھی میناجی کا فین تھا۔

گلزار کی پہلی فلم ''میرے اپنے'' آئی۔۔۔جس میں میناجی نے ایک بوڑھی عورت کا کردار ادا کیا تھا۔''پاکیزہ'' کی طوائف زادی سے کتنا الگ رول تھا ان کا۔ایسا لگتا تھا یہ رول ان کے لیے ہی لکھا گیا اور انہوں نے اس رول کو کیا بھی خوب۔۔۔مجھے اپنی فلم ''چار دل چار راہیں'' کی لڑکی یاد آ گئی۔۔۔پھر شمع جلتے جلتے ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔۔۔میناجی کا انتقال ہو گیا۔لوگ تعزیت دینے کمال امروہی کے پاس پہنچے۔لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس تعزیت کے وصول کرنے کا حق دار کوئی اور ہی ہے جو کہ صرف میناجی کی ڈائری کا وارث قرار پایا تھا۔۔۔یعنی گلزار! اس صدمے کے بعد گلزار مرجھایا نہیں۔۔۔گل بوٹے اس میں نشوونما پاتے ہی رہے۔

''آندھی'' ایک خوبصورت فلم تھی لیکن سنسر میں پھنس گئی۔اس فلم کے گرد طوفان آیا بھنور آیا مگر آخر میں گلزار اسے بغیر کسی داغ دھبے کے نکال لایا۔یہ اس کا کردار ہے۔اس کا کمال ہے۔

ایک ذاتی تجربہ بھی سنادوں۔۔۔

ایک دن گلزار کا فون آیا۔۔۔ کہنے لگا کچھ سال ہوئے آپ کی ایک کہانی پڑھی تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔نام تو اب یاد نہیں مگر ایک آدمی کو پھانسی دی جاتی ہے اس میں۔۔۔۔

میں نے کہا۔۔۔''اس کہانی کا نام تھا۔۔۔دل ہی تو ہے''

گلزار نے کہا۔۔۔''شاید اردو میں یہ نام ہو گا مگر میں نے انگریزی میں پڑھی تھی''۔

میں نے کہا۔۔۔تب اس کا نام تھا۔۔۔''تھر ٹیتھ وِکٹم''

وہ کہنے لگا۔۔۔''شاید یہی نام تھا، کیا وہ کہانی پھر پڑھنے کو مل سکتی ہے؟''

''ضرور۔۔۔'' میں نے اپنی فائل ڈھونڈ کر کہانی اس کو بھجوا دی اور بھول گیا اس واقعہ کو۔

دو ہفتے بعد ہی پھر گلزار فون پر تھا۔۔۔

''آپ سے کل صبح میں اور سپّی (این۔سی۔سپی) ملنا چاہتے ہیں۔ آپ کے یہاں آ سکتے ہیں؟''

میں نے کہا۔۔۔''بڑی خوشی سے مگر کل صبح چھ بجے کے پلین سے میں دہلی جا رہا ہوں کسی میٹنگ کے سلسلے میں''

''اچھا تو ہم آپ کو ائیر پورٹ پر ملیں گے''

صبح ساڑھے پانچ بجے ائیر پورٹ پہنچا تو گلزار اور سپّی صاحب کو وہاں پہلے سے انتظار کرتے پایا۔

میں نے کہا۔۔۔''خیریت؟''

میں نے دیکھا اس وقت بھی گلزار سفید کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔

شاید نہا کر بھی آیا تھا۔

''آپ کو کچھ دینا ہے۔۔۔'' سپّی صاحب نے کہا اور ایک موٹا سا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا ''یہ کیا ہے؟''

''ایڈوانس سمجھئے اس کو۔۔۔''تھرٹینتھ وکٹم'' ہماری ہو گئی۔ آپ کی اجازت ہو تو سکرین پلے لکھنا شروع کر دوں؟''۔۔۔گلزار نے پوچھا۔

میں نے کہا۔۔۔''بڑی خوشی سے۔ مجھے پورا بھروسہ ہے تم پر۔ جو چاہو کرو اس کا''

دہلی جا کر میں نے وہ لفافہ دیکھا تو اس میں پانچ ہزار روپے تھے۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ گلزار نے یہ کیا کیا۔ میں تو یہ پرانی لکھی ہوئی کہانی اس کو مفت ہی نذر کر دیتا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اس پر وہ بہت اچھی فلم بنائے گا۔

فلم اس نے بنائی۔

فلم کا کلائمکس کہانی سے کچھ ہٹا ہوا تھا پھر بھی فلم میں بڑی جان تھی۔ بڑی صاف ستھری اور بامعنی فلم بنائی تھی اس نے۔''کتاب'' میں نے گلزار کے برابر بیٹھ کر دیکھی فلم بہت اچھی تھی۔ افسوس یہ کہ ''میری فلموں کی طرح'' چلی نہیں۔

اس کے بعد سنا گلزار نے ''میرا'' بنائی۔ پریم جی پروڈیوسر تھے۔ بڑی ہمت کی تھی ان دونوں نے۔ ورنہ آج کل کی مار دھاڑ کی فلموں کے زمانے میں کون کلاسیکل فلم بناتا ہے؟ موسیقار بھی کلاسیکل لیا، یعنی روی شنکر۔

مگر ''میرا'' کے رول میں ہیما مالنی کو لیا۔ یہ گلزار کی کمزوری بھی ہے اس کا ''اسٹرانگ پوائنٹ'' بھی۔ اس کی فطرت، اس کی نرم زبانی، اس کے رومانی انداز سے ہر ہیروئن اس کی مداح ہو جاتی ہے۔

مینا کماری۔۔۔!

راکھی۔۔۔(جس سے اس نے شادی بھی کر لی)

ہیما مالنی۔۔۔!

ریکھا۔۔۔!

جس نے ایک دفعہ دیکھا وہی اس کی مداح ہو گئی۔ کم قیمت پر اس کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہو گئی۔ ایسا صرف ہیروئنوں کے ساتھ نہیں ہے ہیرو بھی گلزار کے فین ہو جاتے ہیں۔ دلیپ کمار سے لے کر ونود مہرہ تک سب انتظار میں رہتے ہیں کہ گلزار ان کو اپنی فلم میں آفر دے۔

یہ مقناطیسی طلسم گلزار کے انداز گفتگو میں ہے۔ اس کے لباس میں ہے۔ اس کی ایک دن کی بڑھی ہوئی داڑھی میں ہے۔

اس کے نام میں ہے۔

اس کے صاف ستھرے کام میں ہے۔

اس کی بنگالی زبان کی سوجھ بوجھ میں ہے۔

اس کی آنکھوں میں ہے۔

☆

۔ مسافر ہوں یارو ۔

پنچم کے ساتھ یہ پہلا گانا تھا میرا۔۔۔راج کمل سٹوڈیو میں کس پکچر کا بیک گراؤنڈ میوزک چل رہا تھا۔ سٹوڈیو جاتے ہوئے اُس نے مجھے گھر سے ساتھ لے لیا۔ سچویشن میں اُسے پہلے بتا چکا تھا۔ گاڑی میں جاتے جاتے اُس نے کہا ''مجھے ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آیا! کوئی مکھڑا دے، میں اُس پر دھن بنا لوں گا۔'' دو چار اڑتے مڑتے خیال آئے۔ سٹوڈیو پہنچنے پر میں نے یہ لائنیں اُسے لکھا دیں:

مسافر ہوں یارو، نہ گھر نہ ٹھکانا
مجھے بس چلتے جانا ہے، بس چلتے جانا

لائنیں نوٹ کر کے پنچم نے میرا پیک اپ کر دیا۔ ''تُو جا مجھے بہت کام ہے۔'' یہ اُس کا ہمیشہ کا روّیہ تھا۔ اُسی رات قریب بارہ بجے میرے گھر پر دستک ہوئی اور اُس نے مجھے جگا کے پوچھا: ''کیا سو رہا تھا؟ چل گاڑی میں بیٹھ۔'' اُس نے کیسٹ لگایا اور دھن سنائی۔ واقعی کمال کی دھن تھی۔ ممبئی کی خالی سڑکوں پر وہ گاڑی چلاتا رہا اور مکھڑا گاتا رہا۔ دھیرے دھیرے دھن آگے بڑھنے لگی۔ میں آگے کی لائنیں بناتا گیا اور وہ گاتا گیا۔ مسافروں کی طرح گھومتے گھومتے صبح چار بجے تک ہم نے گانا تیار کر لیا۔ اسی گانے سے میرا اور پنچم کا سانجھا سفر جاری ہوا!

○

"زندگی کا ذائقہ"

احمد ندیم قاسمی

(۵)

شعری روایت سے وابستگی شاعر کے انفرادی اسلوب کی صورت میں مزاحم نہیں ہوسکتی۔ ثبوت کے طور پر گلزار کی شاعری پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ شاعری روایت سے کہیں بھی دستکش نہیں ہوئی مگر اس کے موضوعات، اس کی لفظیات اور اس کے لہجے میں انفرادیت ہے۔ وہ گلزار کے صاحب اسلوب شاعر ہونے پر ناقابلِ تردید دلالت کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت بخش حیرت ہوتی ہے کہ سیلولائڈ کی چمک دمک سے اُدھر گلزار کتنی لگن کے ساتھ مشق سخن میں مصروف رہا ہے۔ فلموں کی ہدایت کاری اور کہانی نویس اور گیت نگاری کی مصروفیات میں سے اگر گلزار اعلیٰ پائے کی شاعری کے لئے وقت نکالتا رہا تو یہ اس کے تخلیقی وفور کا کرشمہ ہے۔ اسی وفور نے اس سے ایسی ایسی نظم اور غزل اور تروینی کہلوائی ہے کہ دورِ حاضر میں اس انداز کی نظم، ان تیوروں کی غزل اور نوکیلی اور چوٹیلی تروینی کی کوئی مثال مشکل ہی سے دستیاب ہوگی۔

جس تخلیقی وفور کا میں نے ذکر کیا ہے اس کے ثبوت میں گلزار کے مجموعے "چاند پکھراج کا" میں شامل ایسی نظمیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں جن کا موضوع ہی نظم کی تخلیق کا کرب ہے۔ گلزار اس کرب کے اظہار میں بھی فنکار کے منصب کو نہیں بھولتا اور جب کربِ تخلیق کا ذکر کرتا ہے تو صرف یہ کہہ کر الگ نہیں ہوجاتا کہ اظہار میں مشکل پیش آرہی ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے:

لفظ کاغذ پہ بیٹھتے ہی نہیں
اُڑتے پھرتے ہیں تتلیوں کی طرح

اسی نوعیت کی ایک نظم میں گلزار نے شاعر کو ریشم کے کیڑے سے بلیغ تشبیہہ دی ہے جو لمحے لمحے کو کھولتا اور پتے پتے کو بینتا ہے۔ اور اپنی ایک ایک سانس کی لے سن کر اسے اپنے تن پر لپیٹتا جاتا ہے۔ پھر اس وفور کے اظہار میں جو رکاوٹیں ہیں ان میں سے ایک کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

ایک بے چاری نظم کے پیچھے
مسئلے لاکھ روز مرّہ کے

اس صورتِ حال میں اگر گلزار نے "چاند پکھراج" کا میں ہمارے لئے ۱۲۳ نظمیں، ۳۶ غزلیں اور ۱۶ تروینیاں جمع کر دی ہیں تو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، یہ اس کے تخلیقی وفور کا کرشمہ ہے۔ گلزار کے ہاں موضوعات کا تنوع دیدنی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گلزار کی شاعری میں فطرت اس کے ہمزاد کا کردار ادا کرتی ہے۔ اور فطرت کی وسعتیں کائناتی ہیں۔ وہ دن اور رات، سورج اور چاند، دھوپ اور چاندنی، ساون اور بارش، درختوں اور پتوں، پیڑوں اور پھلوں، پہاڑوں اور بادلوں وغیرہ کو اپنی تخلیقات میں یوں بے ساختگی سے استعمال کرتا ہے جیسے ہم اور آپ اپنی آنکھوں اور کانوں اور دیگر حواس کو استعمال کرتے ہیں۔ گلزار کے ہاں فطرت کے یہ مظاہر جیتے جاگتے، سانس لیتے اور انسانوں کی طرح جانداروں کا روپ دھارتے محسوس ہوتے ہیں۔ شاعر اور فطرت کے یہ مظاہر ان نظموں میں باہم آمیخت ہو کر یک جان ہوجاتے ہیں۔ فطرت باقاعدہ متکلم لگتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کون سا جوار بھاٹا کہاں سے اٹھا۔ سمندر سے یا گلزار کے ذہن کی حساس رگوں سے۔

فطرت اس کے ہاں استعارے کا کام بھی دیتی ہے، علامت کا بھی اور اس کے افکار کے پس منظر کا بھی۔ اسی لئے جب وہ برسات کا ذکر کرتا ہے تو صرف برسات کا ذکر نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے:

تمام موسم ٹپک رہا ہے
پلک پلک رِس رہی ہے یہ کائنات ساری

فطرت کا یہ استعارہ اس کی شاعری کے محبوب موضوع......محبت اور پھر محبت کے بنیادی موضوع......ہجر و وصال کے اظہار میں اس کا خاص فنکارانہ ہتھیار ہے۔ بہت کم شاعروں کے ہاں محبت کا حسی تجربہ اتنی بے شمار باریک اور مہین پرتوں کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ گلزار کی شاعری شاہد ہے کہ اس نے محض محبت نہیں کی، ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ عشق اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ اس موضوع پر بولتا ہے تو جیسے عشق متشکل ہو کر بولتا ہے۔ ہجر و وصال دونوں ایک سی شدت کے ساتھ اس کے ہاں وارد ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک غزل میں کہتا ہے:

اپنے ماضی کی جستجو میں بہار
پیلے پتے تلاش کرتی ہے
ایک امید بار بار آکر
اپنے ٹکڑے تلاش کرتی ہے

اور

آپ کے بعد ہر گھڑی ہم نے
آپ کے ساتھ ہی گزاری ہے

پھر ایک نظم میں گلزار نے کہا ہے:

ترے غم کا نمک چکھ کر
بڑا میٹھا لگا ہے زندگی کا ذائقہ مجھ کو

محبت کا یہ وہ مقام ہے جہاں فراق و وصال شاعر کے دل و دماغ پر اپنی گرفت کے لحاظ سے متحد نظر آنے لگتے ہیں۔ کہیں وہ محبوب سے کہتا ہے کہ تیرے قرب کی برکت سے میرے جسم پر سے سیکڑوں فالتو جسم اتر گئے ہیں اور کہیں عالمِ فراق میں محبوب کی کہی ہوئی باتوں کا لمس بھی سرشار کر دیتا ہے۔ کہیں

وہ محبوب کی رخصت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

جیسے جھنّا کے چٹخ جائے کسی ساز کا تار
جیسے ریشم کی کسی ڈور سے انگلی کٹ جائے

یا وصل کے عالمِ سرخوشی میں وہ پکار اٹھتا ہے:

نزدیک سے کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا

محبت اور اس کی متنوع کیفیات گلزار کا محبوب موضوع ہیں مگر وہ مسائل حیات پر بھی فکر کرتا ہے۔ اور حیران ہوتا ہے کہ موت تو سبھی پر آتی ہے مگر

زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی!

ان چھ الفاظ کے ایک مصرعے میں شاعر نے زندگی کی کرب ناکی اور سفاکی کو سمیٹ لیا ہے۔ اسی طرح اس کی تین ''بھارت نما'' نظمیں ہیں جن کے موضوعات غصہ، نشہ اور غم ہیں۔ ''بھارت'' کے لفاظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے یہ محض دماغی کرتب ہوں مگر ان تینوں کی فکری کیفیت نہایت گہری ہے۔ یہ گہرائی کاغذ کی کشتی کے استعارے میں بھی موجود ہے جہاں یہ کھلونا اس کرب میں سے گزرتا ہے جو اسے اپنے وجود کے شعور سے حاصل ہوتا ہے، یا پھر ''ریفیوجی'' میں بھی یہی شعور ایک بچے سے اس کا بچپن چھین لیتا ہے۔ فکر کا یہ عنصر گلزار کی شاعری میں ایک انڈر کرنٹ کی طرح رواں رہتا ہے۔

ظاہر ہے اس انتہا کا سوچتا ہوا ذہن اپنے آس پاس کی زندگی سے آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔ گلزار حقائق کی دنیا سے بھاگتا نہیں بلکہ اس سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ روزانہ اخباروں کی لرزا دینے والی خبریں پڑھ کر وہ بتاتا ہے کہ:

سارا دن میں خون میں لت پت رہتا ہوں

اس نے ایک نظم میں زندگی کو ٹین کے خالی ڈبے سے تشبیہہ دی ہے جو تیز ہواؤں میں دیوار و در سے ٹکراتا پھر رہا ہے۔ اسی لئے وہ ایک جُلا ہے سے بے داغ اور بے گرہ زندگی کی تکمیل کا درس لینے جاتا ہے۔ پومپئی کے سیکڑوں برس پرانے آثار کا ذکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ غربت و امارت اور ظلم و جبر کے جو نقشے پومپئی کی کھدائی میں برآمد ہوئے وہ آج اس ترقی یافتہ، مہذب اور ماڈرن معاشرے میں بھی پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ گلزار کا عصری اور سماجی شعور اس کی محبت کی ہمہ گیری اور پھیلاؤ کے برعکس بے حد نوکیلا ہے۔ اسے معاشرے کی ناہمواریاں اور ناانصافیاں شعور کی انتہائی گہرائی تک متاثر کرتی ہیں۔ نظم ''ایک پتہ'' میں اس نے پسی ہوئی انسانیت کی نقشہ کشی بڑی درد مندی سے کی ہے۔ سرسری نظر ڈالنے والوں سے یہ جزیات پوشیدہ رہ جاتی ہیں۔ انہی جزیات کے حوالے سے وہ خدا سے بھی چند سوال کرتا ہے۔ گلزار کے اس رویے میں ایک اپنائیت سے مملو بغاوت ہے جو سوال کرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور اختلاف کرنے کی طاقت عطا کرتی ہے۔ یوں اس کے ہاں کہیں کہیں طنزیہ لہجہ بھی در آتا ہے۔ وہ جب مصور سے افلاس کی تصویر بنانے کو کہتا ہے یا اس شاعر کا ذکر کرتا ہے جسے افلاس کی سچی نقشہ کشی کے بدلے خلعتِ کم خواب ملتی ہے تو یہ طنزیہ لہجہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

عالمِ انسانیت کے ماضی کے آئینے میں وہ جب حال کا عکس دیکھتا ہے تو طنز کی کاٹ نہایت شدید ہو جاتی ہے۔ وہ کھنڈروں میں قدیم راتوں کی بوسیدہ قبریں گزرے دنوں کی شکستہ صلیبیں، شفق کی چتائیں، وقت کے ٹوٹے گزر اور ڈھیر پڑی صدیاں دیکھتا ہے اور اسے عالیشان ایوانوں کی باقیات میں سے:

ایک جھینگر کی آ رہی ہے صدا

کا المیہ دستیاب ہوتا ہے۔ کھنڈر اور میوزیم اور اپنے مکان سے گزر کر جب وہ پومپئی پر اپنی اور غیر فانی نظم لکھتا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے تو وہ ہمیں بتاتا ہے کہ:

شہر کھودا تو تاریخ کے ٹکڑے نکلے

اور وہاں اسے وقت کے پتھرائے ہوئے صفحے اور فراموش شدہ تہذیب کے پرزے اور منجمد لاوے میں اکڑے ہوئے انسانوں کے گچھے دکھائی دیتے ہیں۔ تب وہ گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھتا ہے مگر وہاں بھی اسے پومپئی ہی کے مناظر نظر آتے ہیں اور وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہیں آج کا انسان ترقیِ معکوس میں تو بتلا نہیں ہے! ایسی صورتِ حال کے بارے میں سوچتے تو شاید بہت سے لوگ ہیں مگر اس کا انتہائی فنکارانہ اظہار گلزار اور اس کی قبیل کے معدودے چند شعراء ہی کے حصے میں آیا ہے۔

گلزار کی لفظیات دورِ حاضر کی اردو شاعری کے برعکس قطعی طور پر منفرد حیثیت رکھتی ہے یہاں میں الفاظ نہیں گنواؤں گا۔ اظہار کے صرف چند کرشموں، چند پیکروں، کا ذکر کروں گا جو گلزار کی نظموں اور غزلوں میں ایک کے بعد ایک وارد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جن سے ثابت ہو گا کہ گلزار اپنے جذبہ و احساس میں برش ڈبو کر ایسی تصویریں پینٹ کر رہا ہے مثلاً:

گہنائے ہوئے چاند کی دھجّی (گہرا نشیب ظاہر کرنے کے لیے)، سڑھکتی ہوئی وادی، لکڑی سی بے حس پڑی رات، پیٹھ پھیرے ہوئے دروازے، بادلوں کے جزیرے، شب کا نیلا گنبد، ماضی کی خشک شاخیں، گزرے ہوئے لمحوں کے پتے، دروازے پر چراغ کی لو کا ٹیکا، سناٹوں کی دھول، آواز میں لپٹی خاموشی، روشنی کی سفید کرچیں، آنکھوں پر دھوپ کے تیزاب کے چھینٹے، افق کی ٹہنی پر بیٹھی سنہری کونجیں، آنکھوں کے حروف، آواز کو دیکھنا، نگاہوں کا سننا، اٹھی ہوئی نظروں کی گونج، شام کا زمین پر پلکوں کی طرح اترنا، آنکھوں کی آہٹیں، چہروں کا شور، کانوں میں آواز کو مندروں کی طرح پہن لینا، صحرا میں بارش برسنے سے ریت کا سنسنا اٹھنا، وقت سے کٹ کر لمحے کا گرنا، (ہجر کے بیان میں) ''یہ میرے بستر پہ کیسا سناٹا سو رہا ہے!''۔۔۔ یہ محض چند مثالیں ہیں عام اور مروجہ روش سے ہٹ کر شاعری کی جدید لفظیات اور منفرد پیکروں کی......

چنانچہ گلزار جہاں موضوع و مواد کے معاملے میں یکتا ہے وہاں نئی نئی علامتوں کا بھی بے مثال تخلیق کار ہے۔

میں اس تفصیل کو شاعری کے ذہین قارئین کے لئے چھوڑے دیتا ہوں کہ نظم کے علاوہ غزل میں بھی گلزار نے جدت طرازی اور معنی آفرینی کے کیسے کیسے کمالات دکھائے ہیں۔ میں غزلوں کے صرف چند منتخب اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جو گلزار کے خاص اپنے اسلوب کے نمائندہ ہیں:

وقت کے تیر تو سینے پہ سنبھالے ہم نے
اور جو نیل پڑے ہیں، تری گفتار کے ہیں

آئنہ دیکھ کر تسلی ہوئی
ہم کو اس گھر میں جانتا ہے کوئی

کتنی لمبی خاموشی سے گزرا ہوں
اُن سے کتنا کچھ کہنے کی کوشش کی

آدمی خود ہی دوڑے جاتا ہے
خود ہی چابک بدست ہے بھائی!

شام کے سائے بالشتوں سے ناپے ہیں
چاند نے کتنی دیر لگا دی آنے میں

خالی کرگھے میں عمر بُنتا رہا
اب گرہ کے لیے بھی دھاگا نہیں

ایک پل دیکھ لوں تو اُٹھتا ہوں
جل گیا گھر، ڈرا سا رہتا ہوں

میں نہ ہوں گا تو خزاں کیسے کٹے گی تیری
شوخ پتے نے کہا شاخ سے، مُرجھاتے ہوئے

یہ سراسر نئی آواز ہے، نیا لحن ہے، نیا لہجہ ہے۔۔۔ گہرے معانی سے چھلکتا ہوا، محسوسات کا متلاطم کرتا ہوا، تخلیقی وفور سے بھرپور، جیتا جاگتا کھنکتا ہوا لہجہ!

☆

مایا میم صاحب

اس دل میں بس کر دیکھو تو
یہ شہر بڑا پرانا ہے

ہر سانس میں اک کہانی ہے
ہر سانس میں اک افسانہ ہے
یہ شہر بڑا۔۔۔

یہ بستی دل کی بستی ہے
کچھ درد ہے، کچھ رسوائی ہے
یہ کتنی بار اجاڑی ہے
یہ کتنی بار بسائی ہے

یہ جسم ہے کچی مٹی کا
بھر جائے تو رسنے لگتا ہے
بانہوں میں کوئی تھامے تو
آغوش میں گرنے لگتا ہے

یہ شہر بڑا۔۔۔

(1993)

Come,colonize this heart
this age-old citadel
a fable in each breath
each fabled breath, a story

oft wrecked and oft built
this settlement is that of the heart
a little graced with pain,
a little unsettled with disgrace

this body of unbaked clay...
it begins to ooze when it's full
scoop it up in your arms
and it begins to crumble in your embrace

Translated by:
Sunjoy Shekhar

کتابِ زیست

پروفیسر گوپی چند نارنگ
(دہلی، بھارت)

فلم کی دنیا بھی عجیب چکاچوند کی دنیا ہے جس میں آنے کا دروازہ تو ایک ہے لیکن جانے کے دروازے کئی ہیں۔ پوپ کلچر کا زمانہ ہے۔ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے ایسی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی اور پھر غائب بھی ایسے ہوتے ہیں گویا تھے ہی نہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ برسوں کی ریاضت کے بعد نمایاں ہوتے ہیں، اپنی جگہ رہ رہ کے چمکتے ہیں اور گم کردہ رہوں کو راہ دکھاتے ہیں۔ دنیا بہت بدل گئی ہے، دنیا کی سچائیاں بھی بدل گئی ہیں لیکن کچھ نہیں بھی بدلیں مثلاً لکشمی اور سرسوتی کے معاملات۔ ہر چند کہ لکشمی اب سیاست دانوں کے نرغے میں ہیں اور سرسوتی وینا لیے اکیلی بیٹھی ہیں۔ تاہم بعض وضعداریاں جوں کی توں چلی جاتی ہیں یعنی ایک عرش نشیں ہے تو دوسری فرش نشیں۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ ایک کی توجہ ہو جائے تو ہو جائے، دونوں ایک ساتھ مہربان ہوں یہ آسان نہیں۔ البتہ اگر تپسیا میں کھوٹ نہیں، اور ریاضت پکی اور لگن سچی ہے تو پھر اچنبھا سا اچنبھا ہوتا ہے۔ ایسا ہی اچنبھا گلزار کی ذات ہے۔ ادھر چند برس پہلے جب فنون لاہور میں ان کی تخلیقات منظرِ عام پر آنے لگیں، اور ہر چند کہ میں احمد ندیم قاسمی کی نظر کا قائل ہوں اور جانتا ہوں کہ کیسے کیسوں کو انھوں نے کندن بنا دیا، لیکن گلزار چونکہ شہرت اور گلیمر کی راہ سے چل کر آئے تھے، ان کی چیزوں کو میں نے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا، لیکن جیسے جیسے پڑھتا گیا میری خوشگوار حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور اب ان کہانیوں کو پڑھا ہے تو مزید اچنبھا ہوا۔ آپ کو اچنبھا ہو یا نہ ہو تب بھی آپ کم از کم وہ نہیں رہیں گے جو آپ پہلے تھے۔

گلزار کے فنکار ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن فن اور فن میں فرق ہوتا ہے اور ہر فن کے تقاضے الگ ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک زمرے کا فنکار دوسرے زمرے میں بھی اتنا ہی کامیاب ہو۔ فلم کی شہرت اپنی جگہ، گلزار کہانی کے فن میں ایسے کھرے نکلیں گے، اس کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ ادب کے بہت سے معاملات عشق کی طرح ہیں۔ ان میں منصوبہ بندی یا فارمولا سازی نہیں چلتی، بلکہ بہت کچھ غیر ارادی بلکہ اضطراری طور پر ہوتا ہے اور اس میں شعوری سعی کو اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا غیر شعوری باطنی تحریک کو۔ بعض لوگ دیر سے لکھنا شروع کرتے ہیں۔ اس کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں، پھر بھی فن کی دیوی کو رام کرنے کے لیے ریاضت شرط ہے۔ میرا خیال ہے گلزار شروع ہی سے کہانیاں لکھتے رہے ہوں گے اپنی باطنی ضرورت کے تحت اور اس سے تسکین پاتے رہے ہوں گے۔ جب لکھنا داخلی وجدانی تسکین کا ذریعہ بن جائے کسی خارجی حصول یا یافت کا نہیں تو اس میں لامحالہ تخلیقی کاوش کا رنگ آنے لگتا ہے اور فن کے تقاضوں کا احساس ہو تو سونے پہ سہاگہ، تب تخلیقی کاوش ادب کا درجہ پانے لگتی ہے۔ میں جیسے جیسے ان کہانیوں کو پڑھتا گیا، ان کی ادبی حیثیت کے بارے میں میرا گمان خوشگوار یقین میں تبدیل ہوتا گیا۔ رائے لکھنے کے لیے اکثر ساری چیزوں کو پڑھنا ضرور نہیں ہوتا، بالعموم جب اندازہ ہونے لگے کہ باقی سب بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن گلزار پُرفریب فنکار ہے، ہر قدم پر جُل دے جاتا ہے۔ اکثر فلم والوں کو دیکھا ہے کہ جب لکھتے ہیں تو رومانس اور فارمولا سے باہر کم ہی قدم رکھ پاتے ہیں یعنی گھوم پھر کر وہی فضا جس میں ان کی زندگی گزری ہے۔ ان کے ذہن کو رومانی موضوعات سے ایک جکڑ سی پیدا ہو جاتی ہے جو اولین گناہ کی طرح ان سے چپک جاتی ہے اور وہ ہرگز اس سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ لیکن گلزار کے یہاں تعجب ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کا مصنف اس 'ویولینگتھ' یا اس 'ویولیسنگتھ' کا خالق نہیں ہے۔ ان کے یہاں ہر کہانی کے ساتھ زندگی کا ایک نیا روپ ایک نیا رُخ ایک نئی سطح نظر آتی ہے، ایک نیا زاویہ ایک نیا تجربہ ایک ایسے ذہن و شعور کا پتہ دیتا ہے کہ اس کا لگاؤ اس رُخ یا اُس رُخ سے نہیں، پوری زندگی کی سچائی سے ہے یا زندگی کے اس کھلے ڈلے تجربے سے جو حدیں نہیں بناتا، حصار نہیں کھینچتا، رشتوں، طبقوں، نفرتوں اور محبتوں میں کسی ایک پرت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ سچائیوں کے آر پار دیکھتا ہے اور زندگی کو اس کے پورے تنوع بوقلمونی اور تجربے کو اس کی تمام جہات کے ساتھ انگیز کرتا ہے۔ کسی بھی فنکار کے لیے یہ کمال معمولی نہیں۔ غالب نے باجے کو راگوں سے بھرا ہوا کہا تھا۔ گلزار کی کہانیوں کو ذرا سا چھیڑنے کی ضرورت ہے، زندگی کے سُر ان میں سے نکلنے لگیں گے۔ ایک ایسے فنکار کے لیے جس نے ساری زندگی فلم سازی میں کھپا دی، یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ اس نے ایسی کہانیاں لکھیں جن میں زندگی کا سنگیت بھرا ہوا ہے اور ہر کہانی میں زندگی کا ایک الگ روپ الگ تجربہ سامنے آتا ہے۔

آیئے ان کہانیوں میں سے بعض پر ایک نظر ڈالیں۔ 'ادھا' اور 'خیرو' اس لحاظ سے بہت مزے کی کہانیاں ہیں کہ ان میں جو کردار وضع کیے گئے ہیں، وہ عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ 'ادھا' کو سب ادھا کہہ کر بلاتے ہیں، نہ پورا نہ پونا، بس اڈّھا۔ قد کا بونا تھا لیکن سب کے کام نمٹا دیتا۔ خود چھوٹا تھا پر کوئی کام اس سے بڑا نہ تھا۔ رادھا کملانی کو کالج سے لوٹتے ہوئے جب غنڈوں نے چھیڑا تو ادھا ہی اسے بچا لایا پھر بھی سب اسے مرد آدھا سمجھتے۔ رادھا بھی اسے آدھا سمجھتی۔ تب اس نے ستیہ سے ناتا جوڑ لیا جو وہیں فلیٹوں میں پیشہ کرتی تھی۔ اڈّھے کی مردانگی کا امتحان تو تب ہوا جب ستیہ کے حرامی بچہ ہونے کی خبر اڑ گئی اور سب نے فلیٹوں سے اس کو نکال دینے کی ٹھان لی۔ اڈّھا سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھ کر بچّے کو گود لے لیا۔ گویا دنیا جس کو اڈّھا کہہ کر مذاق اڑاتی تھی وہی پورا نکلا، مکمل انسان۔ اسی طرح خیرہ بھی ایک گرا پڑا کردار ہے جس کی کسی نظر میں کوئی وقعت نہیں۔ وہ بے کار کے کام کرتا رہتا ہے بیلوں کو گھنٹیاں باندھنا، سینگ رنگنا، سجانا سنوارنا، مٹکیوں پر نقش و

نگار بنانا، چوپال پر گانا بجانا، یعنی وہ زندگی کا جمالیاتی پہلو ہے جو بظاہر غیر افادی ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کے نزدیک اس کی سب حرکتیں شُکمی تھیں۔ لوگ سمجھتے کہ وہ فالتو کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ کب تک مفت کی بٹورتا، بھوکا رہنے لگا، بیمار ہوا، مر گیا، تب گاؤں والوں کو احساس ہوا جیسے کوئی بڑی کمی آ گئی ہو۔ وہ جو بے کام کے کام کرتا تھا زندگی کے رنگ و نور میں اس کا کتنا بڑا حصہ تھا۔

ایک کہانی 'مرد' ماں بیٹے کے رشتے پر ہے۔ ماں باپ میں طلاق ہو چکی ہے۔ نوجوان بیٹا ہوسٹل میں ہے۔ ماں کا تعلق کسی دوسرے شخص سے ہو جاتا ہے۔ بیٹا چھٹیوں میں گھر آ رہا ہے، ماں اس کو بتا دینا چاہتی ہے کہ وہ حاملہ ہے اور کچھ مدت میں اس شخص سے شادی کر لے گی۔ لیکن بیٹا جس کو ماں ہنوز بچّہ سمجھتی تھی آتے ہی بھانپ جاتا ہے، اور اس کے اندر کا مرد چیخ اٹھتا ہے "کس کا بچہ ہے، باسٹرڈ"۔ گویا بیٹا نہیں باپ بول اٹھتا ہے۔ یا بیٹا باپ کی انا کا قائم مقام ہے یا ہمارے 'ذکر مرکز' سماج میں سارے حقوق مرد کے ہیں یا یہ کہ ماں باپ بچوں کو کتنا ہی بچہ سمجھتے رہیں، بچے بہت جلد اندر ہی اندر بڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مزے کی کہانی بچے اور دادی کے رشتے پر ہے جو دس پیسے چرانے پر دادی کی ڈانٹ کھاتا ہے اور گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ ٹرین پکڑتا ہے اور دس پیسے مٹھی میں دبائے رات کے خوف سے راستے کے کسی اسٹیشن پر اتر جاتا ہے، اکیلا اور بے سہارا ہے۔ صبح جاگتا ہے تو دیکھتا ہے کہ رات بھر وہ ایک بوڑھی بھکارن سے گلے لپٹ کر سوتا رہا جو مر چکی ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس کے کفن دفن کے لیے چندہ جمع کرنے لگتے ہیں۔ بچے کو دادی یاد آتی ہے، وہ سکہ کٹورے میں پھینکتا ہے اور بھاگتا ہے گھر کی طرف دادی کی تلاش میں۔ گلزار نے بچے کے جذبات کی ترجمانی تو کی ہے ساتھ ہی اس حقیقت کی بھی کہ جب ہم چیزوں کو گنوا دیتے ہیں تو ان کی قدر پہچانتے ہیں، یا گنوانا اور پانا دونوں ایک ہی سچائی کے دو رُخ ہیں۔

گلزار کی کہانیاں جیسے کہ کہا گیا زندگی کی ہمہ جہت بوقلمونی کا نگار خانہ ہیں جن کی تشکیل میں سچائیو کی تہ تک اترنے والی نظر کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان میں عام انسانوں کے عام رشتوں کی کہانیاں بھی ہیں جن میں کوئی خاص پہلو ہے، اور گرے پڑے نظر انداز کیے گئے لوگوں کی کہانیاں بھی ہیں جن میں انسانیت کا درد ہے، اسی طرح راجاؤں، مہاراجاؤں، ٹھاکروں اور راجپوتوں کی بھی، نیز ڈاکوؤں کی یا پھر ایسی کہانیاں بھی جن میں فینٹسی کا عنصر ہے یا وہ جس کو آج کل جادوئی حقیقت نگاری (Magic Realism) کہا جا رہا ہے۔ ایک مختصر مضمون میں ان سب پہلوؤں کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں، البتہ بعض کہانیوں کے بغیر بات پوری بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ گلزار کے کرداروں میں ادنیٰ اعلیٰ چھوٹے بڑے، ہر طرح کے لوگ ملیں گے، عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے، جوان سب اپنے اپنے اعمال و اطوار کے ساتھ نظر آتے ہیں، 'سانجھ' ایک بوڑھے لالہ اور اس کی بڑھیا لالائن کی کہانی ہے جس میں لالہ کو اس بات کا دکھ گھلا ڈالتا ہے کہ لالائن نے سمدھن کی دیکھا دیکھی بال کٹوا دیے اور بوڑھے سے پوچھا بھی نہیں۔ بڑھاپے کے جذبات اور احساس تفاخر پر یہ کہانی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک اور کہانی میں یہی احساسِ تفاخر غیرتِ نفس کا مسئلہ بن جاتا ہے اور منفرد و معنیاتی قوس قزح بناتا ہے۔ 'زندہ' میں راجا صاحب کے اکلوتے بیٹے کو، جو اپاہج ہے، یہ بات پسند نہیں کہ لوگ اس پر ترس کھائیں کیونکہ وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر زندہ رہنا چاہتا ہے کہ "میرے انگ مجھ سے ہیں میں اپنے انگوں سے نہیں"۔ لیکن جب راجا صاحب اس کی شادی کر دیتے ہیں تو وہ تاب نہیں لا سکتا کیونکہ پہلے جب لوگ ترس کھاتے تھے تو اس کی قوتِ ارادی کو شہ ملتی تھی، وہی لوگ اب اس پر ہنسنا شروع کرتے ہیں تو گویا اس کو اپاہج پن قبول ہے لیکن مضحک بننا قبول نہیں۔ دونوں صورتیں وجودی ہیں لیکن پہلی سے فرار ممکن ہے دوسری سے نہیں اسی لیے وہ جان لیوا ہے۔ اونچے گھرانے کی کہانیوں میں بھی اصل پہلو انسانی صورتِ حال کا ہے۔ یہی معاملہ غریب غربا ناداروں کامگاروں کی کہانیوں کا ہے۔ دو کہانیوں میں دھوبیوں کی گھریلو زندگی کا بڑا جیتا جاگتا نقشہ ہے۔ 'اونچی ایڑی والی میم' دراصل بخشش میں دی ہوئی سائیکل ہے جو چھبّا اور مہکو کے درمیان وجہِ عداوت بن گئی ہے۔ کہانی اس واقعے کے گرد گھومتی ہے کہ سیٹھوں کی جھوٹی مراعات کس طرح معصوم زندگیوں میں زہر کے بیج بو دیتی ہیں، نتیجتاً مہکو چھبّا کو نیچا دکھانے کے لیے بیوی کا زیور چوری کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ ایک اور کہانی 'ہاتھ پیلے کر دو' میں کھاڑی کے دھوبیوں کا المیہ ہے۔ اس کی ساخت میں ایک خوبصورت وائروی عمل ہے کہ جو کچھ جوانی میں مالتی کے ساتھ ہوا، وہی اب مالتی کی جوان بیٹی کے ساتھ ہونے جا رہا ہے۔ جوانی میں مالتی اور ڈرائیور رام ناتھ کا عشق تھا جو میلے کپڑوں کے گٹھڑ لاتا تو تین بار ہارن بجاتا اور مالتی اس کی تان پر بھاگی چلی جاتی تھی۔ ایک رات رام ناتھ پکڑا گیا اور دھوبیوں نے مل کر اسے مار ڈالا۔ اب جو مالتی کی بیٹی جوان ہو گئی ہے اور رات میں جب کھاڑی ہائی ٹائیڈ سے بھر جاتی ہے اور ہارن کی پیں پیں سنائی دیتی ہے تو کھانا پروستے ہوئے اچانک مالتی کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔

گلزار کی بعض کہانیوں میں عورت مرد کے رشتوں اور خود فریبیوں کے ٹوٹنے کا عمل ہے۔ انسان ان خود فریبیوں کو دعوت دیتا ہے اور باہمی رشتوں میں ان خود فریبیوں کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ اکثر یہ فریب ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن لاشعور میں کہیں نہ کہیں ان کا طلسم بنا رہتا ہے اور مرد عورت اس کے سہارے زندہ رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک دن حقیقت کا بے رحم چہرہ سامنے آتا ہے اور ہم پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

بعض دلچسپ کہانیاں ایسی بھی ہیں جن میں متوسط طبقے کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی نفسیاتی گرہیں ہیں۔ 'کاغذ کی ٹوپی' میں سن بلوغ کو پہنچنے والے کرداروں کا تصادم ہے جو بظاہر مغائرت کا پہلو رکھتا ہے لیکن در پردہ ان دھڑکنوں کا پتہ دیتا ہے جو دو دلوں کے ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لیکن انا کے ہاتھوں اقرار نہ کرنے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح 'گڈی' میں سابقہ دو بہنوں کا ہے جن میں چھوٹی ہر بات میں بڑی پر سبقت لے جانا چاہتی ہے، رفتہ رفتہ یہ

معصوم نفسیاتی خواہش گہرے حسد کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں اس محبت کی قلعی بھی کھولی گئی ہے جو آج کل کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو فلم ایکٹروں سے ہوجاتی ہے اور پھر ذراسی بات پر بھرم ٹوٹ بھی جاتا ہے جو خاصہ صدمہ زا ہوتا ہے۔ خیالی توقعات کا ٹوٹنا 'نو وارڈ' میں بھی ہے کہ اخباروں کی پیش گوئیاں پڑھ پڑھ کر اکثر لوگ سہانی توقعات قائم کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کی تطبیق شادی بیاہ پر بھی کرتے ہیں اور پھر صدمات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان کہانیوں میں روزمرہ کے واقعات اور زندگی کے مضحک پہلو ہیں جن کو لوگ سنجیدہ سمجھ لیتے ہیں اور پھر مشکلوں میں پڑ جاتے ہیں۔

توقع کی جاسکتی ہے کہ گلزار نے بہت سے واقعات اور کردار فلم کی دنیا سے لیے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے، فقط دو کہانیوں کا تعلق فلمی ہستیوں سے ہے، لیکن یہ کہانیاں بھی ایک پرت کی رومانی کہانیاں نہیں بلکہ بعض جینوین آرٹسٹوں کی زندگی میں جو گہرا دکھ اور پنہاں المیہ ہوتا ہے یہ کہانیاں اس درد پر مبنی ہیں اور ان میں حقیقت اور فینٹسی کا کچھ ایسا گھال میل بھی ہے کہ بیانیہ کا وہ طور مشکل ہوتا ہے جس کو جادوئی حقیقت نگاری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ کہانیاں ہیں 'بملدا' اور 'سن سیٹ بولیوارڈ'۔ بملدا یعنی بمل رائے جن کے ساتھ گلزار نے برسوں بطور اسسٹنٹ کام کیا تھا۔ بمل رائے الہ آباد میں تروینی کے سنگم پر جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ملتی ہیں اور ہر بارہ سال کے بعد جب سورج کے گرد گھومتے ہوئے نو سیارے ایک سیدھ میں آجاتے ہیں اور سورج کی پہلی کرن سنگم پر پڑتی ہے تو کمبھ کا میلہ لگتا ہے جس میں نواں دن جوگ اشنان کا دن مانا جاتا ہے۔ بملدا کمبھ پر فلم بنانا چاہتے تھے جو شروع تو ہوئی لیکن مکمل نہیں ہوئی حتیٰ کہ بارہ برسوں کے پورا ہوتے ہوئے خود بملدا کی جیون یاترا عین اس دن پوری ہوگئی جو جوگ اشنان کا دن تھا۔ دوسری کہانی چارولتا ایک بجھ چکے ستارے کے بڑھاپے کی کہانی ہے۔ وہ سن سیٹ بولیوارڈ کی مشہور زمانہ کوٹھی میں جو عظمتِ رفتہ کا نشان محض رہ گئی ہے پرانی یادوں کے سہارے زندہ ہے لیکن پیشتر اس کے کہ یہ یادیں بھی چارولتا سے چھن جائیں اور کوٹھی کا سودا ہوجائے، خریدار کے وزیٹنگ کارڈ کو ہاتھ میں دبائے وہ دم توڑ دیتی ہے۔ دونوں کہانیوں میں المناکی کے سائے ہیں اور زندگی کی کامرانیوں اور جگمگاہٹ سے دور دونوں میں عدم تکمیل کا دکھ سرسراتا ہے۔

خالص فینٹسی کی مثال 'واہمہ' ہے۔ خود گلزار کو یقین نہیں کہ اس کو کیا نام دیں، پہلے اس کا نام 'واہمہ' تھا، بعد میں 'لیکن' کردیا گیا۔ شاید اس لیے کہ اس میں جو واقعہ ہے اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے لیکن وہ حقیقت نہیں، بلکہ حقیقت اور غیر حقیقت کا وہ تصور ہے جسے ہم بالعموم قبول کر لیتے ہیں۔ گلزار نے اس کہانی کے ذریعے حقیقت کے معمولہ تصور پر سوالیہ نشان لگایا ہے اور مدد لی ہے کرشنا مورتی کے تصورِ حقیقت سے جو وجود و عدم کے فرق کو ذہنِ انسانی کا کرشمہ کہتا ہے۔ اس کہانی میں ریل سے ایک آدمی کے کٹ کر مر جانے کا ذکر ہے۔ اسٹیشن پر ریل اب نہیں آتی، پلیٹ فارم، پٹریاں، سگنل سب سنسان ویران پڑے ہیں لیکن ہر شام راوی کو ایک آدمی دیوراج ملتا ہے جو پٹریوں پر چلنے سے منع کرتا ہے کہ دیکھتے نہیں گاڑی آرہی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کا جوان بیٹا شیام گاڑی سے کٹ کر مر گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد دیوراج کا آنا بند ہوجاتا ہے۔ راوی اس کی خیریت پوچھنے اس کے گھر جاتا ہے تو جو شخص دروازہ کھولتا ہے وہ اس کا بیٹا شیام ہے۔ شیام بتاتا ہے کہ اس کا باپ دیوراج تو تین سال پہلے اسٹیشن پر گاڑی کے نیچے کٹ کر مر گیا تھا۔ کہانی کے بین السطور کرشنا مورتی کے اقوال کا تجسس چلتا رہتا ہے کہ سب واہمہ ہی تو ہے۔ حقیقت فقط اسی قدر ہے جس قدر ہم قبول کر لیتے ہیں ورنہ زندگی یا موت دونوں واہمے ہیں۔

گلزار کے تخلیقی کینوس کے صحیح اندازے کے لیے ان کہانیوں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کا مرکز و محور مذہبی جنون، دہشت گردی یا خوف و ہراس ہے۔ یہ کہانیاں بھی اتنی ہی منفرد ہیں جتنی بعض دوسری۔ فسادات کے موضوع پر بلامبالغہ ہزاروں کہانیاں لکھی گئی ہوں گی، گلزار کی کہانیاں سب سے الگ ہیں اور اپنی مثال آپ۔ کہانی 'خوف' میں اس دہشت کی عکاسی ہے جو مذہبی جنون کی فضا میں ذہن کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس میں بمبئی کی لوکل ٹرین میں سفر کرنے والا یاسین جس کی بیکری جلائی جاچکی ہے وہ پانچ دن تک اِدھر اُدھر چھپنے اور جان بچانے کے بعد لوکل ٹرین سے ڈرتا بچتا گھر جارہا ہے، ڈبے سنسان ہیں، اچانک دیکھتا ہے کہ ایک سایہ ڈبہ میں داخل ہوا اور تاک میں کھڑا ہوگیا۔ یاسین کو ڈر ہے کہ وہ شخص کوئی غیر ہے جو اس کو مار ڈالے گا۔ موقع پاتے ہیں یاسین 'یاعلی' کہتے ہوئے اس کو ٹانگوں کے بیچ سے اٹھا کر چلتی ٹرین سے باہر پھینک دیتا ہے۔ اس کے بعد گلزار نے صرف ایک جملہ لکھا ہے جو کہانی کی جان ہے۔ ''نیچے گرتے آدمی کی چیخ سنائی دی۔ اللہ''۔ اس کہانی کا شمار فسادات پر لکھی ہوئی موثر ترین کہانیوں میں ہوسکتا ہے کہ کس طرح مذہبی جنون خود اپنی سچائی کی نفی کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک منفرد اور انتہائی دردناک کہانی ہے ''راوی پار'' جس میں درشن سنگھ اپنی بیوی اور نوزائیدہ دو جڑواں بچوں کے ساتھ 'نانک نام جہاز ہے' کے سہارے گوردوارے کے اکٹھ سے نکل کر بھیڑ بھاڑ میں اسپیشل ٹرین کی چھت پر چڑھ جاتا ہے۔ دونوں بچے ماں کی سوکھی چھاتیوں کو چچوڑتے رہتے ہیں، نہ دودھ ہے نہ پانی، دورانِ سفر ایک بچہ مر جاتا ہے۔ جب ٹرین راوی کے پل سے گزرتی ہے تو ساتھی مسافر کہتا ہے سردار جی مرے ہوئے بچے کو کہاں تک ساتھ رکھو گے، یہیں سے پھینک دو دودریا میں کلیان ہوجائے گا۔ درشن سنگھ نے پوٹلی سی اٹھائی اور واہگورو کہہ کر دریا میں اچھال دی۔ اندھیرے میں ہلکی سی آواز سنائی دی۔ کسی بچے کی۔ مردہ بچہ تو وہیں تھا ماں کی چھاتی سے لگا ہوا، اور لوگ نعرے لگا رہے تھے واگھا آگیا واگھا آگیا۔ گویا آزادی کی سرحد پار کرتے ہوئے ہم نے بھی زندہ قدروں کو تو پھینک دیا اور نفرت، دہشت اور تعصب و تنگ نظری کی مردہ لاش جس کو تلف کر دینا چاہیے تھا وہ ابھی تک ہمارے گلے سے لگی ہوئی ہے اور جس کو ہم طربیہ سمجھ رہے ہیں، اصلاً وہ ہمارا المیہ ہے۔

میں اس مختصر مضمون کو مختصر رکھنا چاہتا تھا لیکن گلزار کے ساتھ انصاف کے لیے ہنوز ایک دو کہانیوں کا ذکر ضروری ہے جو دوسری تمام کہانیوں سے ہٹ کر ہیں۔ کہانی 'نجوم' کا تعلق اس طور سے ہے جس کو آج کل Sci Fiction کہا جارہا ہے۔ اس میں روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی بنا پر اس بجھے ہوئے سورج کا ذکر ہے جو ہم سے دس ہزار نوری سال دور ہے اور کروڑوں سال جلنے کے بعد بجھ چکا ہے۔ اب بھی کوئی شعلہ بھڑک اٹھتا ہے تو اس کی لپٹیں بیس پچیس ہزار میل کی بلندی تک اٹھتی ہیں اور ان کی روشنی (دس ہزار نوری سال طے کرنے کے بعد) ایک بار 1841 میں اور دوسری بار 1854 میں اس زمین پر دیکھی گئی تھی۔ ان سائنسی واقعات و واردات کو مرزا غالب کے ملازم کلو اور منیر کے مکالموں اور اختر شناسی کو اس زمانے کے لوگوں کے اعتقادات سے جوڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ یوں کہ 1841 کے چمکدار نئے ستارے کو مغلوں کی خوش بختی کی بشارت بمعنی دیوان غالب کی اشاعت پر منتج قرار دیا گیا ہے جو واقعتاً مغل کلچر کا سب سے روشن ستارہ ہے اور 1854 میں چمکدار ستارے کے دوبارہ نمودار ہونے کو استاد ذوق کے انتقال اور غالب کے استاد شہ ہونے اور بالآخر اپنا ادبی مقام پانے کا مظہر سمجھا گیا ہے۔ گلزار نے اس کہانی کو وضع کرتے ہوئے اختر شناسی اور سائنس نیز تاریخ کے جو مراحل طے کیے ہوں گے اور ان تینوں کے تخلیقی میل سے جو کام لیا ہے اس سے نہایت دلچسپ بیانیہ سامنے آیا ہے۔ 'نجوم' کی طرح 'آگ' اور 'جنگل نامہ' بھی بہت مزے کی کہانیاں ہیں اور لطف کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بچے بوڑھے چھوٹے بڑے سبھی ان کہانیوں سے الگ الگ کیفیت اخذ کرسکتے ہیں۔ ان کہانیوں میں آرکی ٹائپل عنصر تو ہے ہی ان کو Eco-friendly بھی کہا جاسکتا ہے۔ 'آگ' میں قبل تاریخ کے آدی باسی تصورات کی فضا ہے اور یہ کہ قدیم ترین انسان نے سب سے پہلے آگ کو کس طرح رام کیا ہوگا اور گھر میں بسایا ہوگا۔ آج کل ماحول شناسی اور ماحول دوستی کی وہ ریل پیل ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کرۂ ارض انسانی تہذیب و تمدن کے ہاتھوں تقریباً تباہی کے کنارے آلگا ہے اور اس جاندار کے ہاتھوں جس کو 'انسان' کہتے ہیں 'پانی، دریا، پہاڑ، پیڑ، پودے، چرند، پرند کچھ بھی محفوظ نہیں۔ ہوا، بادل، فضا، خلا، سب زہر سے بھر رہے ہیں اور 'اوزون' کا پھٹاؤ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ایسے میں گلزار کی 'جنگل نامہ' بادِ نسیم کے ایک جھونکے کی مانند ہے جس میں جانور، جنگل، انسان، حیوان، چرند، پرند، پیڑ، پودے سب زندگی کی ایک ہی ڈور سے بندھے نظر آتے ہیں۔ اور اس ڈور کا ایک سرا ہے سالم علی، پرندوں کا عاشق اور ہمراز جو جتنا انسان تھا اتنا ہی انسان سے ماورا زندگی کے بڑے معنی کا مظہر بھی جس کی پوری اہمیت کو سمجھنا ابھی باقی ہے۔

ایسی گوناگوں کہانیوں کے پیش نظر گلزار نے ایک باکمال کہانی کار کہلانے کا حق تو پا ہی لیا ہے۔ اس مختصر مطالعے کی اور جہات بھی ہوسکتی تھیں لیکن فی الحال اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ان کہانیوں میں زندگی کے جو رنگ ہیں، تجربے کی جو وسعت ہے، واقعے کو کہانی بنانے کا جو ہنر ہے، نفسیات کے جو پیچ و خم ہیں، نیز کچلے دبے لوگوں یا عورت مرد کے جو مسائل ہیں، یا جن وانس، جنگل و کائنات یا ستارے و سیارے جس طرح زندگی سے آ لگے ہیں، ان سے گلزار کی کہانی کاری کا کچھ تو اندازہ ہوا ہوگا، اور اس امر کا بھی کہ گلزار نے زندگی کے تجربے کے جس رُخ کو بھی لیا ہے اس کا فنی، تخلیقی اور جمالیاتی برتاؤ اس نوع کا ہے کہ ہر جگہ گلزار نے کوئی نکتہ، کوئی رمز، کوئی انوکھی بات، کوئی بھید ایسا رکھ دیا ہے کہ تجربہ یا واقعہ یا کردار یا کہانی بن گیا ہے اور یہ معمولی بات نہیں۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ گلزار کہیں یک سُرے نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں زندگی کی سرگم ہے اور ہر سُر دوسرے سے الگ ہے۔ کوئی کہانی کسی دوسری کہانی کا ظل یا چربہ نہیں۔ گلزار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے کچھ ورق یہاں پلٹے گئے۔ قاری جہاں سے چاہے ان میں داخل ہوسکتا ہے۔ زمین ہری بھری، فضا اجلی ہے، اور زندگی کے گھنے پن میں کیف و نشاط کا سامان بھی ہے اور نظر ہو تو معنی خیزی اور نکتہ آفرینی کا بھی۔

- بقیہ -

دوسرا کوئی سخی کہاں

کے مرکزی کردار میں چھوٹے گئے کھانچوں اور رخنوں کو محسوس کرلیا تھا۔ پارو ایک شریف لڑکی تھی جو ایک رات میں عورت بن گئی تھی جبکہ چندر مکھی ایک درباری کوٹھے دار تھی جو دیوداس کی محبت میں پڑ گئی تھی۔ جیسا کہ ایک جوان لڑکی کے لیے ممکن ہے۔ ''دیوداس'' ہی ایک ایسا تھا جو شباب کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ اس لیے اس رول کے لیے دھرمیندر کو پسند کیا گیا۔ پاپی کا خیال ہے کہ دھرمیندر ہمیشہ دل سے جوان رہے ہیں اور اب بھی ہیں!۔

پاپی نے چندر مکھی کے کوٹھے میں شرمیلا ٹیگور کے ساتھ اور دیوداس کے گھر میں پارو کے ساتھ ہیما مالنی اور دھرمیندر کو لے کر کچھ منظر فلمائے تھے۔ اپنے پسندیدہ آر ڈی برمن کی طرزوں میں دو گیت بھی ریکارڈ کرلئے تھے۔ لیکن اس کے بعد پروڈیوسر اپنے کچھ اسباب کی بنا پر جنہیں وہ ہی سمجھتا ہوگا پیچھے ہٹ گیا۔۔۔

1990ء کے فلم فیئر ایوارڈ بڑے یادگار تھے۔ ماں کو بہترین معاون اداکارہ کے رول میں ''رام لکھن'' کے لیے ایوارڈ ملا۔ میرے لیے دل چھونے والا لمحہ تھا جب پاپی نے ایوارڈ کا اعلان کیا اور ایوارڈ یافتہ کو یہ کہہ کر پکارا

''اجی سنتی ہو!''

چوربدن کہانیاں

انتظار حسین

(لاہور)

گلزار صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں جو بہت سرسری ملاقات تھی اور بس چند گھڑیوں کی مجھے یوں لگا کہ میں کسی بہت خوبصورت آدمی سے ملا ہوں۔ یہاں میں نے لفظ خوبصورت ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں منیر نیازی استعمال کیا کرتا تھا۔ جب کسی بھلے آدمی سے مل کر وہ بہت خوشی محسوس کرتا تو اس کی تعریف میں کہتا کہ خوبصورت آدمی ہے۔ اور میں اپنے حساب سے گلزار صاحب کے سلسلہ میں اس اسم صفت کی وضاحت کروں تو یوں کہوں گا کہ گلزار صاحب کی شخصیت بہت دل موہ لینے والی ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ آپ پہلی ہی سرسری ملاقات میں محسوس کریں کہ جس شخص سے ہم مل رہے ہیں وہ بہت نفیس آدمی ہے۔

گلزار صاحب سے میری ملاقاتیں بہت کم ہیں اور بہت مختصر مگر ہر ملاقات کے بعد احساس ہوا کہ اس شخصیت نے میرے میں کچھ اور زیادہ گھر کر لیا ہے۔

خیر مجھے ابھی ان کی شخصیت پر زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی میں ان سے کتنا ملا ہوں اور کتنا جانا ہے۔ لیکن اس عمل میں ایک رنگا رنگ تخلیقی آدمی سے جو تعارف ہوا وہ حیرت و مسرت سے بھرا ایک تجربہ ہے۔ بس اسی کا ذکر مقصود ہے۔ گلزار صاحب کو اولاً جس طرح اس برصغیر کی خلقت جانتی ہے بس اسی طرح میں بھی انہیں جانتا چلا آیا تھا۔ یعنی ایک کامیاب اور ایک صاحبِ نظر فلم ڈائرکٹر کی حیثیت سے۔ ان کی جو چند ایک فلمیں دیکھی تھیں وہ دل و دماغ میں بسی ہوئی تھیں۔ پھر "فنون" میں ان کا نام کبھی شاعر کی حیثیت سے نظر آیا اور کبھی افسانے کی تقریب سے۔ نظموں کو دیکھ کر تو ایسا تعجب نہیں ہوا۔ سمجھ لیا کہ وہ جو فلموں کے لیے انہوں نے گیت نگاری کی ہے اسی سے تھوڑا آگے بڑھ کر وہ اردو نظم کی طرف آ گئے ہیں۔ اور اردو سے جسے شغف ہو اس کا مشغلہ کچھ بھی ہو وہ کسی نہ کسی وقت شعر سے شوق ضرور کرے گا۔ یہ اردو کلچر کا خاصہ ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ تو افسانے میں بھی رواں ہیں۔ پھر جلدی ہی وہ وقت آیا کہ ان کے افسانوں کے دو مجموعے میری دسترس میں تھے۔ اب جو میں نے توجہ سے ان کی کہانیاں پڑھیں تو تعجب سے سوچا کہ ارے گلزار صاحب تو باقاعدہ افسانہ نگار ہیں۔ یعنی یوں نہیں ہے کہ فلمسازی کرتے کرتے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے خالی وقت میں کوئی کہانی لکھ ڈالی۔ یہ تو کچھ ایسی صورت ہے کہ ایک فنکار اپنے فن میں اظہار کرتے کرتے وسعت کی تلاش میں افسانے کی وادی میں آ نکلا ہے اور یہاں بھی وہ اسی قدر سنجیدگی کے ساتھ اس صنف کے سارے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا اظہار کر رہا ہے۔ غالب نے جو یہ کہا تھا کہ:

بقدر شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

یہ ہر اس صاحب تخلیق کے بارے میں صحیح نظر آتا ہے جس کے یہاں شوق اظہار زیادہ ہے اتنا زیادہ ہے کہ جس صنف میں اس کا اظہار ہو رہا ہے وہ صنف تنگی کا تاثر پیدا کر رہی ہے۔ شوق اظہار اپنے وفور میں اس صنف سے آگے نکل کر ایک وسعت کا تقاضا کر رہا ہے۔ لگتا ہے کہ گلزار اہل تخلیق کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو فنکار اپنا اظہار فلم کے میڈیم میں کر رہا ہے اس کے یہاں کسی قسم کی تشنگی کا احساس تو نہیں ہونا چاہیے۔ اس اسلوب اظہار میں اتنا تنوع ہے اور اس طرح کئی ایک فنون یہاں آ کر رنگا رنگی پیدا کرتے ہیں کہ تنوع اور توسیع کی متلاشی تخلیقی امنگ کی پوری طرح تسکین ہو جانی چاہیے۔ مگر بہر حال تخلیقی امنگ کسی حد کی پابند تو نہیں ہو سکتی۔ نہ اس کی کوئی انتہا ہے۔

خارجی سطح پر تو گلزار صاحب کے یہاں کسی تشنگی کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ فلم کے شعبہ میں ان کا اظہار بھی کامیابی سے ہمکنار رہا ہے اور شہرت و مقبولیت میں بھی کوئی کمی نہیں رہی۔ سو کوئی اندرونی خلش ہی ہوگی کہ فلم کے میڈیم میں بھرپور اظہار کے باوجود ان کی تخلیقی امنگ کو وسعت کی تلاش ہے۔ ان کی اردو شاعری اور اردو افسانہ دونوں ہی اس تلاش کا حاصل نظر آتے ہیں۔

ادھر چونکہ میری معلومات میں ہے کہ گلزار کا بڑا اور نمائندہ اظہار فلم میں ہوا ہے یعنی وہ اولاً فلم کے میدان کے شہسوار ہیں اسلئے میں کہہ رہا ہوں کہ افسانہ اس کے تخلیقی اظہار کا توسیعی علاقہ ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا تو میں یہی کہتا کہ اصلاً اور اولاً یہ شخص افسانہ نگار ہے۔

گلزار کے افسانے آخر مجھے کیوں بھائے۔ اردو افسانے کے کتنے رنگ میں دیکھ چکا ہوں، کچھ رنگ خود بھی برتے ہیں۔ ان افسانوں میں ایسی کونسی نئی بات ہے کہ تم اس کے قائل ہوئے۔ ان افسانوں میں کوئی نئی بات ہے یا نہیں اس کا تو مجھے پتہ نہیں۔ یہ نقاد بہتر بتا سکتے ہیں۔ میں تو بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے ذرا ایک الگ سے ذائقہ محسوس ہوا۔

اب جب میں نے الگ سے ذائقہ کی بات کی ہے تو یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ وہ جو ہمارے یہاں پچھلی صدی کی چھٹی ساتویں دہائیوں میں علامتی تجریدی افسانے کا چرچا ہوا تھا وہاں بھی تو کچھ اس قسم کا مسئلہ درپیش تھا۔ یہ کہ حقیقت نگاری والے افسانے کا دور بہت لمبا کھنچ گیا تھا۔ پریم چند کے وقت سے لے کر پاکستان کی پہلی دہائی کے آخر تک بلکہ دوسری دہائی کے اولیں برسوں تک اس اسلوب کی جگالی ہوتی رہی۔ اب اردو افسانہ اس کے سوا کوئی ذائقہ مانگ رہا تھا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد کی دو

ڈھائی دہائیوں میں پڑھنے والوں نے علامتی تجریدی افسانے کا مزہ بھی چکھا۔اور ایسا چکھا کہ جلدی ہی بے مزہ بھی ہو گئے۔اور آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں کہ نئے افسانے سے تو کہانی غائب ہو گئی۔اس ردعمل میں ایسا افسانہ لکھا گیا جس کے متعلق کہا گیا کہ لو صاحبو کہانی واپس آ گئی۔ادھر میرا کہنا یہ تھا کہ یہ تو وہی کہانی واپس آئی ہے جس کے خلاف ردعمل ہوا تھا۔اس کا تو وہی پرانا ذائقہ ہے۔کہانی اب جب ایک مختلف قسم کے اسلوب کو پیچھے دھکیل کر آئی ہے تو اب اسی کا ذائقہ حقیقت نگاری والے پچھلے افسانے سے تھوڑا الگ ہونا چاہیے۔

تو یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ گلزار کے افسانے کا ذائقہ کچھ الگ سا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔اسلوب تو یہاں بھی وہی حقیقت نگاری والا ہے۔ہاں یہ تو صحیح ہے۔مگر ہوا یوں کہ حقیقت نگاری نے پریم چند کے افسانے سے لے کر اب تک اچھا خاصا لمبا سفر کیا تھا۔حقیقت نگاری نے اپنا آخری جلوہ منٹو کے افسانوں میں دکھایا۔ان کے انتقال کے بعد حقیقت نگاری کا اسلوب ہمارے فکشن میں کچھ بجھا بجھا نظر آنے لگا۔کچھ اس قسم کا اس کا ذائقہ ہو گیا یا یوں کہہ لیں کہ حقیقت نگاری کے اسلوب میں لکھے ہوئے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا کہ جیسے ہم باسی روٹی کھا رہے ہیں۔

حقیقت نگاری والے افسانے نے مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے بیان کی تازگی کو کہیں گم کر دیا۔ترقی پسند افسانے نے تو اپنے نظریاتی جوش میں بیان کی اس تازگی،سادگی اور سچائی کو گم کیا جو اس اسلوب کے واسطے اردو افسانے کو میسر آئی تھی۔مگر غیر ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں سے بھی یہ وصف گم نظر آیا۔جدیدیت کے نام ان کے افسانے کو بھی تو جملہ امراض لاحق۔سب سے بڑھ کر فرائڈ کی نفسیات کا مرض اسے لگ گیا تھا۔ان دونوں گروہوں کے رد عمل میں جو افسانہ آیا وہ اپنے امراض ساتھ لے کر آیا۔کچھ علامت نگاری کے نام پر کچھ تجریدیت کے نام پر۔ان دونوں اسالیب نے مل کر کچھ ایسا گل کھلایا کہ افسانہ اچھا خاصا مسئلہ بن گیا۔جب اس نے تھوڑا شاعرانہ رنگ پکڑا تو اس افسانے کو پڑھ کر وہ متروک صنف یاد آنے لگی جس نے ایک زمانے میں ادب لطیف کے نام سے شہرت حاصل کی تھی۔اور وہ جو میں ابھی کہہ رہا تھا کہ جلد ہی قارئین اور نقاد دونوں کا اس افسانے سے جی بھر گیا۔اور آوازیں اٹھنے لگیں کہ افسانے سے کہانی کہاں غائب ہو گئی۔

کہانی واپس بھی آئی تو اسی رنگ سے جسے میں ابھی کہہ رہا تھا کہ ایسے جیسے،ہم باسی روٹی کھا رہے ہیں۔اب جو گلزار صاحب کی کہانی سامنے آئی تو لگا کہ جیسے حقیقت نگاری اپنی ابتدائی تازگی،سچائی اور سادگی کے ساتھ واپس آ گئی ہو۔اور اب مختلف حوالوں سے اس میں ایک نئے پن کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ان افسانوں کو پڑھتے جائیے نہ ان میں کسی نظریے کی کارفرمائی ہے،نہ کوئی نعرہ ہے۔نہ کوئی فلسفہ دانی کا زعم،نہ علامت نگاری کی بھول بھلیاں،نہ فرائڈ کی نفسیات کے اینچ پینچ۔یہاں چھوٹے چھوٹے انسانی تجربے ہیں جو اتنی سادگی سچائی سے بیان ہوئے ہیں کہ ایک تازگی کا ایک نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ذرا اس افسانے کو دیکھئے جس کا عنوان ''سانجھ'' ہے۔''لالہ جی کو یہ بات کھل گئی کہ بڑھیا(لالائن) نے بال کٹوا دیے اور ان سے پوچھا بھی نہیں''۔مگر نہ کوئی غصہ نہ لڑائی جھگڑا۔کتنی سادگی سے کہا ''تمہارے بال تو بہت اچھے تھے،خوبصورت تھے۔کٹوا کیوں دیئے''۔تھوڑا ٹھہر کر ''اور تم نے۔۔۔۔مجھ سے پوچھا بھی نہیں''۔

بیٹے بہوؤں نے ان کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔''ابھی تک ماں کے بالوں کی فکر لگی ہے۔ستر بہتر کے ہو گئے لیکن مزاج سے عشق نہیں گیا ابھی۔''

لالہ جی چپ اندر چلے گئے۔اور جیسے اسی کے ساتھ وہ اس بھرے گھر میں اکیلے رہ گئے ہوں۔ہنستی بولتی آل اولاد کے بیچ میں ایک اکیلا آدمی۔دکھ درد کی بھی تو اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔اس کا اعلان ہوتا ہے تو غمگسار بھی مل جاتے ہیں۔دکھ بٹانے والے۔غالب نے اسے شرکت غم سے تعبیر کیا ہے۔مگر ایک دکھ گونگا ہوتا ہے۔اس کا کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا۔پتہ کیسے چلے۔بقول غالب:

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری

بس لالہ جی چپ چپ رہنے لگے اور ایک دن یہ کہہ کر کہ بیٹی سے ملنے جا رہے ہیں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ڈھائی مہینے گذر گئے۔ان کا اتا پتا نہیں۔ہاں بدری ناتھ کے کسی آشرم سے ایک خط آیا۔پتہ چلا کہ وہ تو وہاں کسی آشرم میں جا براجے تھے۔خاندان والے بھاگم بھاگ وہاں پہنچے۔مگر ان کے پہنچنے سے پہلے لالہ جی پرلوک سدھار چکے تھے۔افسانہ جس سادگی سے شروع ہوا تھا اسی سادگی سے ختم ہوتا ہے۔

اور ہاں وہ ایک کہانی ''ایک چابی'' کیا خوب کہانی ہے۔سدھیر، ٹی کے اور سیما۔'' کچھ اسی طرح شوہر بدلا تھا سیما نے۔بالکل ایسے ہی جاتے جاتے۔جیسے کوئی ٹیکسی بدل لے۔''بس سدھیر نے نوٹس دیدیا ''میں تم دونوں کا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔ابھی۔اسی وقت'' اور اسی وقت ان کی طرف سے فیصلہ آ گیا۔سیما نے سدھیر کو چھوڑا اور ٹی کے کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر چلی گئی۔چٹ طلاق۔پٹ دوسرا شوہر۔سب کچھ چٹ پٹ ہو گیا اور کتنی سادگی سے۔اور افسانہ نگار نے کتنی سادگی صفائی اور خوبصورتی سے ہندوستان کے روایتی سماج کے بیچ نمودار ہوتے اس نئے کلچر کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔

مگر شاید سب سے کمال کی کہانی وہ ہے جس کا عنوان ہے''بملدا''

یہ فلم کا مرکزی کردار تو خود فلمی دنیا سے مستعار ہے۔اور یہ دنیا تو گلزار صاحب کی اپنی دنیا ہے۔اور یہ ایسی دنیا ہے جہاں کا ہر شخص اپنے طور اطوار سے،اپنی چال ڈھال سے کہتا نظر آتا ہے کہ مجھے دیکھو،میں بھی ایک کردار ہوں۔اور بملدا ایک فلمی ڈائرکٹر مگر وہ تو خود کردار ہے۔اس کے اندر ایک سچا فنکار سانس لے رہا ہے جس کا خواب ہے ایسی فلم جو فلم آرٹ کا شاہکار ہو۔آرٹ کا ایک کامل اور مکمل

نمونہ جو اسے امر کر دے۔ کتنے سالوں تک اندر ہی اندر چرخی چلتی رہتی ہے۔ کونسا سین کہاں آنا چاہیے۔ وہ جو ایک یاتری کو کمبھ کے میلہ میں بھیڑ کے قدموں تلے آ کر کچلا جانا ہے۔ اسے اشنان کے کون سے دن اس آفت کی زد میں آنا ہے۔ دن، گزرتے جا رہے ہیں۔ دن، مہینے، سال۔ بڑا آرٹ اپنے ظہور کے لیے ایک عمر مانگتا ہے۔ مگر آدمی کی عمر تھوڑی ہے۔ اور بملدا تو کینسر کا مریض ہے۔ اس عمر کا تو کوئی بھروسا نہیں۔ اور جب اشنان کے دنوں کی بہت الٹ پھیر کے بعد اچانک اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ اس یاتری کو اصل میں جوگ اشنان کے دن جب صبح کو پو پھٹ رہی ہو مرنا چاہیے۔ لیجیے فلم کا نقشہ مکمل ہو گیا مگر اسی دن جوگ اشنان کی صبح کو جب پو پھٹ رہی تھی اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ خواب منور ہوتے ہوئے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ایک سچا آرٹسٹ اپنے شاہکار کی دھن میں مگن، اپنے مرنے جینے کے معاملہ سے بے نیاز۔ بس جب دو چار ہاتھ لب بام رہ جاتا ہے تو زندگی کی کمند ٹوٹ جاتی ہے۔ زندگی بھی کتنی ستم ظریف ہے۔ اور اس افسانہ نگار نے اس ستم ظریفی کو کس فنکاری سے بیان کیا ہے اور دھیرے دھیرے مرتے اپنی دھن میں گم فنکار کو کس سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ایک سچے فنکار کا سراپا ہمارے تصور میں پھر جاتا ہے اور پھر کتنی سادگی سے یہاں اس کہانی میں گلزار کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔

فن اپنے عروج پر بھی نظر آتا ہے۔ اور کسی فنکارانہ بیان کا تاثر بھی نہیں دیتا۔ بس جیسے عام سی بات ہو گی اور سادگی سے کہی گئی ہو۔ شاعری میں ایسا کمال میرؔ کے یہاں نظر آتا ہے:

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

فقیرانہ آئے سدا کر چلے
میاں خوش ہو ہم دعا کر چلے

بیان میں اتنی سادگی جیسے شعر نہیں کہہ رہے بات کر رہے ہیں۔ نثر سے بیان اتنا قریب جیسے سچ مچ نثر ہی مگر شاعری ایسی کہ کھری شاعری۔ اسے شاعری کے معاملہ میں سہل ممتنع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بس کچھ ایسی ہی سادہ بیانی گلزار کی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ لمبی کہانی یہاں مشکل ہی سے نظر آئے گی اور مغربی زبان بھی مشکل ہی سے دکھائی دے گی۔ جذباتی شدت بھی کم کم ہی ہے۔ لہجہ میں سادگی اور دھیما پن۔ مگر ذرا جو کہیں سپاٹ پن کا احساس ہو۔ یوں کہیے کہ چور بدن کہانیاں ہیں۔ اوپری نظروں سے دیکھو تو بہت سادہ اور سہل نظر آتی ہیں۔ مگر ایسی سادہ کہ کوئی سادہ ہی ان کو سادہ کہے۔ ذرا احتیاط سے پڑھو تو سادہ بیانی کے پردے میں کتنی گہرائی ہے۔ انسانی درد کی گہرائی۔

☆

''پکھیاں وے پکھیاں''

سونے چ مڑھ کے
منتر پڑھ کے
لب کے تویت لیاوے نی
پڑھ پڑھ گلے چ پاوے نی
تے نالے پانویں چھپیاں
پکھیاں وے پکھیاں

پکھیاں وے پکھیاں
پکھیاں وے پکھیاں
پکھیاں وے پکھیاں
پیاج کٹایاں چِٹھی آوے
بھر جان اکھیاں
پکھیاں وے پکھیاں

لبھیا فرے منڈا باریاں دے اولے
چِٹھیاں چھپاواں تے او بگلاں ٹٹولے
ہونکیاں ایہہ لکیاں نے
ہک چ رکھیاں
پکھیاں وے پکھیاں

پکھیاں وے پکھیاں
پکھیاں وے پکھیاں
پکھیاں وے پکھیاں
پیاج کٹایاں چِٹھی آوے
بھر جان اکھیاں
پکھیاں وے پکھیاں

گلزارؔ

''چاندبیلتی رات''

ستیہ پال آنند
(یو۔ایس۔اے)

میں نے کچھ برس پہلے کولکاتہ کے ایک ادبی جریدے کے گلزار نمبر کے لیے تحریر کردہ گلزار کی امیجری پر ایک مضمون میں لکھا تھا:

امیج کیا ہے؟ سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ امیج ایک خیالی تصویر ہے جسے الفاظ اپنی اصوات واشکال سے ترتیب دیتے ہیں امیج کی قاری تک بہ احسن و خوبی پہنچ جانے کی کلید اس بات میں مضمر ہے کہ ان الفاظ کو پڑھ کر اس کے ذہن میں وہی تصویر ابھرے جو تخلیق کی کارکردگی کے لمحے میں شاعر کے ذہن میں تھی۔''

ان سطروں کو آج چھ سات برس بعد دوبارہ پڑھنے پر مجھے ان میں ایک کمی کا احساس ہوا۔ قاری اساس تنقید کی تھیوری کے مطابق کسی بھی ادبی تخلیق کا متن، خلق ہونے کے بعد، ایک مادر پدر آزاد، لیکن غیر آگاہ مخلوق کی طرح ہے ، جسے ایک غیر حساس قاری بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ کر دیکھ سکتا ہے، اپنے ہی ذہنی چاک پر چڑھا کر اسے متشکل کر سکتا ہے، اپنے تجربے، تعلیم و تربیت اور سماجی ماحول کے سیاق میں رکھ کر ''فرض'' کر سکتا ہے کہ اس کی شکل ''اب'' کیا ہے، یعنی اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے، کہ ''تب'' یعنی تخلیق کار کی تخلیقی قوت کی کارکردگی کے لمحے میں اس کی شکل وصورت کیا تھی۔

ان سطروں کی یہ ''کمی''، جس کا احساس مجھے اب ہوا، غیر مشروط نہیں ہے۔ لازمی شرط یہ ہے کہ اگر امیج کو ذہنی چاک پر چڑھا کر اس کی صورت گری کرتے ہوئے کوزہ گر، یعنی شاعر، اس کی مٹّی میں ان عناصر کا امتزاج کرتا ہے، ریزہ ریزہ کیا ہوا بھوسا، کیچڑ اور گارا ملاتا ہے، جو نہ صرف اس کے بلکہ اس کے مفروضہ قاری کے بھی جانے پہچانے ہوئے فرض کیے جا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں اس تصویر کی ترسیل قاری تک، اگر بجنسہ نہیں، تو لگ بھگ اسی طرح ہی ہو، جس طرح شاعر کے اپنے تخلیقی ذہن میں تھی۔

گلزار کی ایک پرانی نظم سے صرف دو سطریں یہاں لکھ کر میں اس نکتے کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

کیوں غریبوں سے کھیلتی ہے رات
روز اک چاند بیلتی ہے رات

''بیلنا'' گرائمر کی اصطلاح میں ایک فعلِ معروف ہے۔ کون بیلتا ہے؟ جواب: رات بیلتی ہے۔ کس کو بیلتی ہے؟ جواب: چاند کو بیلتی ہے۔ ہر وہ قاری جو نہ صرف ہمارے برصغیر کا ساکن ہے، بلکہ دنیا کے کسی حصے میں بھی رہتا ہے، جانتا ہے کہ چاند بیلنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کے انفرادی اور نسلی ذہن کی نچلی سطحوں پر یہ نقوش صدیوں سے کندہ ہیں کہ فعل اگر ''بیلنا'' ہے اور فاعل اگر ''رات'' ہے تو مفعول ''روٹی'' تو ہو سکتی ہے، چاند نہیں......لیجیے، ایک استعارہ معرض وجود میں آ گیا، اور قاری کو یہ باور کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ غریبوں سے مذاق کرنے والی رات بھوکے پیٹ سونے والوں کے لیے چاند کو اس طرح سے سجا کر پیش کرتی ہے، جیسے روٹی بیلی جا رہی ہو۔ کیوں رات غریبوں ہی سے یہ کھیل کھیلتی ہے؟ یہ ہے سوال شاعر کا جو کئی دیگر جہتوں کا بھی حامل ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر قاری چاند کو بھر پیٹ سونے، اس میں اپنے محبوب کا چہرہ دیکھنے، عید کی بشارت کے معانی میں دیکھنے کا اہل ہے۔ اس لیے یہ استعارہ بغیر کسی دیگر لفظ کا استعمال کیے ہوئے خود میں ہمہ جہت ہو جاتا ہے۔

گلزار ایک مختلف قسم کا Imagist شاعر ہے۔ وہ اپنے امیجز میں نہ تو ن۔م۔راشد کی طرح اپنی استعاراتی بھول بھلیاں کی کلید ایک ڈبیا میں چھپا کر اور ڈبیا کو ایک صندوق میں بند کر کے اسے سمندر میں پھینک کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ قاری اس کو تلاش کر لے گا، نہ فیضؔ کی طرح ''چہ دلاور است دُزدے'' کے بمصداق صنفِ غزل کے ان Time Honoured ستعاروں کو اسلوب اور جملہ سازی کی سطح پر تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو ملبوس دے کر یہ فرض کر لیتا ہے کہ وہ ایک انقلابی شاعر ہے اور ترسیل کی سطح پر اسے شعری لباس میں کچھ اس ڈھنگ سے بات کہنا چاہیے جو قاری کو آسانی سے سمجھ بھی آ جائے اور اسے وہ لطف و انبساط بھی مل پائے جو اسے غزل کا ایک شعر سن کر ملتا ہے، اور اس سحر زالذتِ سوز و گداز کی انتہا یہ ہو کہ جیسے ایک شعر حفظ ہو جاتا ہے ویسے ہی اس کی نظمیں بھی لوگوں کو زبانی یاد ہو جائیں۔ دو اور بڑے شاعروں، مجید امجد اور وزیر آغا سے بھی اور ایک نسبتاً چھوٹے شاعر ستیہ پال آنند سے بھی وہ اپنے امیجز کی کارفرمائی میں بالکل مختلف ہے۔ آغا صاحب تو خیر ایک باکمال، اور اپنی قسم کے واحد اور منفرد شاعر ہیں جنہیں کسی بھی سند کی ضرورت نہیں، لیکن مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں اپنی سرشت میں اپنے امیجز کو All-inclusive بناتے ہوئے، تاریخ، اسطورہ، مذہب اور قدیم عالمی ادب سے نکال نکال کر اور دھُن دھُن کر، ان کے لحاف میں اس قدر فالتو روئی بھر دیتا ہوں کہ غیر آگاہ قاری تک ان کی ترسیل ایک مسئلہ بن جاتی ہے اور اسے معانی کی تہہ تک پہنچنے کے لیے انسائیکلو پیڈیا دیکھنا پڑتا ہے۔ میں شعوری طور پر یہ سب کچھ نہیں کرتا، بس ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن مجھے احساس ہے کہ یہ ایک ایسی بدعت ہے جس سے میں اب تک آزاد نہیں ہو سکا۔

گلزار کے ساتھ ان شعرا کا یا خود اپنا تقابلی موازنہ میرا مقصد ہرگز نہیں تھا لیکن یہ سمجھنے کے لیے کہ گلزار کی امیجری کن سطحوں پر دیگر شاعروں سے کس قدر مختلف ہے، ان بزرگوں کا ذکر اور ان کے طریق کار کا حوالہ دینا ضروری تھا۔

گلزار کے نئے شعری مجموعے میں مشمولہ نظموں اور غزلوں کا استعاراتی گراف بنیادی طور پر پہلے چھپے ہوئے شعری مجموعوں کے گراف سے

زیادہ مختلف نہیں ہے،تو بھی اس میں کچھ جہتیں زیادہ نمایاں طور پر ابھر کر آئی ہیں۔ کچھ خصائص جو مشترک ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔ پہلے بھی ان کے امیجز میں آفاقیت،سورج، چاند،مختلف النوع ستاروں کی لڑیوں سے مرتب آفاق یا تو ایک حقیر سے خاکی ذرے یعنی انسان میں سمٹ کر اپنے وجود کے معانی کا حامل ہوتا تھا یا یہ حقیر سا ذرہ پھیل کر خود ہی کائنات بن جانے کی صلاحیت رکھتا تھا، یہ کیفیت ان نظموں میں بھی موجود ہے۔ پہلے بھی شاعر اپنے امیج میں دو یا دو سے زیادہ تصاویر کو ہم آہنگ کر کے مخلوط شکل میں ایک شبیہہ کی تشکیل کرتا تھا، اور اب بھی وہ اس فن میں پہلے کی طرح ہی ماہر ہے۔لیکن ان نظموں میں سے کچھ ایک میں شاعر کیسے اس مخلوط استعارے کے ''اکہرے پن'' سے آگے نکل کر اور صرف ایک جہت پر قناعت نہ کر کے ہمہ جہت بننے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے ہمیں یتیندر مشرا کی ترتیب دی ہوئی اس کتاب کے مشمولات کا بغور جایزہ لینا ہوگا۔

یتیندر مشرا کا نام آیا ہے تو ان کا تحریر کردہ پیش لفظ ''کتنا عرصہ ہوا کوئی امید جلائے'' بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ پہلی سطریں ہی گلزار کو تین صدیوں کے اردو شعرا کے انبوہ در انبوہ ہجوم سے نکال کر ایک دوسری ہی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں، جس میں ہندوستان میں تو ایک درجن سے بھی کم لوگ کھڑے ہوئے ہیں اور پاکستان میں شاید کوئی نہیں ہے۔

اردو اور ہندی کی دہلیز پر کھڑے ہوئے شاعر اور گیت کار گلزار کا تعارف ہی یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری اور نظموں کو تھوڑا ہچکتے ہوئے ہندی میں سنگرہ نکالنا کہتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی کے دوآبے میں ہندوستانی الفاظ میں پکنے والی ان کی شاعری کی فصل دراصل ہندی میں اتنا ہی سنگرہ ہے، جتنا کہ اردو میں نظموں کا 'مجموعہ'۔ ایسے میں ان کی شاعری، جو ہندی کی زمین سے نکل کر دور آسمان تک اردو کی پتنگ بن کر

اڑتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

میں یتیندر جی کے پیش لفظ پر زیادہ تکیہ نہ کرتے ہوئے کچھ باتیں اپنی دانست میں وہ کہنا چاہتا ہوں جو بہت کم لوگوں نے کہی ہیں۔ ان کے چاروں طرف بکھری ہوئی زندگی کے تئیں ان کے attitudinal response کو کئی نام دیے گئے، لیکن بہت کم احباب نے اس عمل پر روشنی کا کوئی ہالہ مرکوز کیا ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ کتنی آسانی سے گلزار ایک اکہرے امیج کو ایک ایسی شاخ کی سی شبیہہ دیتے چلے جاتے ہیں جس میں ہر نئے لفظ کے ساتھ انکھوے پھوٹتے ہیں، بُور آتا ہے، پھول کھلتے ہیں اور ظاہری سطح پر امیج کو استعارے میں تبدیل کرنے میں کیسی کیسی علامتیں، تمثالیں، اشارے اور کنایے اس میں جُڑتے چلے جاتے ہیں جنہیں ایک بار دیکھ چکنے کے بعد لامحالہ ایک بار پھر لوٹ کر بنظرِ غور دیکھنا پڑتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ ظاہری سطح کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جو زیرِ آب ہے اور. نیمے دروں نیمے بروں. جھلملاتا ہوا جھانک رہا ہے۔

ایک امیج استعارے کی اوڑھنی اوڑھ کر کر اس میں سے تانک جھانک کیسے کرتا ہے اس کی موزوں ترین مثال گلزآر کی ایک تین سطری نظم ہے۔

ایک سے بکھرے ہیں رات دن جیسے
موتیوں والا ہار ٹوٹ گیا
تم نے مجھ کو پِرو کے رکھّا تھا

☆

۔ دھوم تھیکے اُٹھلوجے ۔

وہ بنگالی زبان ہو، مٹھائی، شاعری یا۔۔۔! میں نے بنگالی لڑکی (راکھی) سے شادی کی ہے۔ میرے گرو رابندر ناتھ ٹیگور ہیں۔ دوسرے گرو بمل رائے جن کی وجہ سے میں فلموں میں داخل ہوا۔ اُن کی فلم ''بندنی'' میں پہلا گانا ''میرا گورا انگ لئی لے'' لکھا۔ بنگالی بولنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ لَو لیٹرز لکھ لکھ کر بنگالی لکھنے پڑھنے کی پریکٹس کی تھی۔ بنگالی میں کئی کویتائیں بھی لکھیں، پہلی بار کسی نے بنگالی فلم کے لیے گانے لکھنے کی فرمائش کی۔ کُل تین گانے تھے۔ دو سنجیدہ گانے تو میں نے لکھ لئے۔ تیسرا ڈھول دھپّے والا نہ لکھا سکا۔ وہ گانا سپن چکرورتی نے لکھا۔ تب لگا تھا کاش! بنگالی بھی میری مادری زبان ہوتی تو کیا مزہ آتا۔ زمین پر روڑے مٹی میں اُگی مادری زبان کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

○

''عاشق کا گریباں''

ڈاکٹرسید تقی عابدی (کینیڈا)

گلزارؔ ایک ہمہ جہت شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ فطری شاعر بھی ہیں۔یقیناً محنت، ریاضت، صداقت اور ذہانت تو ان کی تخلیقات میں شامل ہیں لیکن ان سب کے علاوہ اور ان سب سے اہم چیز خیال وفکر اور تخیّل کی وہبی دین ہے جو:

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

اکتوبر 2011ء کے پہلے ہفتہ میں گلزار صاحب سے دوحہ میں ملاقات رہی۔مجلسِ فروغِ اُردو قطر کے روحِ رواں جناب محمد عتیق صاحب نے عالمی سالانہ مشاعرہ بیادِ فیضؔ اور جلسہ تقسیم ایوارڈ منعقد کیا تھا جس میں بھارت سے گلزارؔ صاحب اور پاکستان سے محمد کاظم صاحب کو اس سال منتخب کیا گیا تھا۔اس تقریب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے گلزارؔ صاحب کی شخصیت ان کی شاعری اور کہانیوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔گلزارؔ صاحب نے کلام شاعر بزبان شاعر کے تحت اپنی چند عمدہ نظمیں سنا کر ایک تازہ نظم غالبؔ پر کہہ کر پیش کی کہ یہ نظم ابھی ان کے شعری مجموعہ میں شامل نہیں۔انھوں نے بتایا کہ ابھی حال میں دہلی میں غالبؔ کے رہائشی مکان گلی قاسم جان میں ترمیم اور تعمیر کر کے ایک میوزیم بنایا گیا ہے۔ہر سال 27 دسمبر کو غالبؔ کی پیدائش کی مناسبت سے ایک جلوس ہاتھوں میں شمعیں لیے ٹاؤن ہال دہلی سے غالبؔ کی حویلی قاسم جان گلی جاتا ہے اور خود گلزارؔ صاحب اس میں شرکت کرتے ہیں۔جب گلزارؔ صاحب نے یہ تازہ نظم پڑھی تو سامعین نے بہت پسند کیا خصوصاً محفل میں موجود کراچی کی دو بڑی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرس جناب پیرزادہ قاسمؔ صاحب اور جناب محمد علی صدیقی صاحب نے بہت تعریف کی۔راقم نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس نظم کا تجزیہ کر کے عوام تک پہنچایا تو حسنِ یوسف بازارِ مصر میں پیش ہو سکتا ہے۔ چناں چہ میری گذارش پر گلزارؔ صاحب نے نظم کے ٹائپ شدہ صفحات میرے حوالے کر دیئے۔

گلزارؔ صاحب کے اب تک تین شعری مجموعے ''چاند پکھراج کا''، ''رات پشمینہ کی'' اور ''پندرہ پانچ پچھتر'' ادبی اور شعری حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی کہانیوں کے مجموعوں میں ''راوی پار'' اور ''دھواں'' سے انہیں ایک خاص مقام بھی مل چکا ہے۔ یہاں ہم صرف اس ایک ترسیلی نظم کی تشریح سے اُن کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈال کر یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ کن کن اقدار نے اس نظم کو اعلیٰ اور عمدہ ترین نظموں کی صف میں سرفہرست کر دیا ہے۔کسی بھی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ یہ المیہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس کی بعض عمدہ قدریں پرستاروں کی نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ آرٹ اور لٹریچر میں وقت کے تقاضوں کے تحت تخلیقی قدروں کی قدر و قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔عوامی پسند اور آرٹ کے مخصوص شعبوں کی بڑھتی ہوئی مانگ ایک بڑے وولٹیج (Voltage) کے بلب کی طرح تو دوسرے کم وولٹیج لوگوں کے نور کو بے نور کر کے ان کے ظاہری وجود کو ختم کر دیتی ہے۔

گلزارؔ دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ بیسوی صدی کے کئی عظیم شاعر جنہوں نے اگر چہ کئی اصناف میں شاعری کی لیکن وہ بھی نظم ہی کے شاعر کہلائے جن میں اقبالؔ، جوشؔ اور فیضؔ سرفہرست ہیں۔

آج سے سو برس پہلے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنے مقالہ ''شمس العلماء حضرت آزاد مرحوم'' میں محمد حسین آزاد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا۔''چاسر اور ایڈسن نے جو احسان انگریزی نظم ونثر پر کئے ہیں، کیٹو اور پدما کرنے جو خدمات ہندی کا ویہ کے حق میں کیں ان سے زیادہ گراں مایہ خدمات اور احسانات آزادؔ نے اُردو نظم بالخصوص اُردو زبان پر بالعموم کئے ہیں۔ اگر امیر خسروؔ نے اُردو کا پہلا شعر موزوں کیا، اگر ولیؔ نے پہلا دیوان اُردو نظم کا مرتب کیا اگر بیجو باورے نے پہلا دُھرپد ہندی بولوں میں باندھا اگر رودکیؔ نے پہلا شعر فارسی کا کہا تو حضرت آزادؔ نے پہلی نظم نئی طرز کی موزوں کی۔اگر آزادؔ نے اس خیالِ نو کی اشاعت وتعمیل نہ کی ہوتی تو آج ہم اُن نظموں سے ناآشنا ہوتے''۔

گلزارؔ صاحب کی نظم کا مطالعہ اور تجزیہ مابعد جدیدیت کے شعری چار چوب میں کیا جا سکتا ہے۔ہم نے دانستہ طور پر عمیق ادبی تجزیہ سے گریز کیا ہے تا کہ مضمون کو خشک اور سنگلاخ بنانے کے بجائے زعفران کی طرح نرم رنگین اور خوشبو سے بھرا رکھیں۔ملٹن نے اچھی شاعری اور اچھے شعر کی نسبت تین قدروں کا ذکر کیا ہے۔اس میں صداقت یا حقیقت ہو، اس میں جوش یا جذبات ہوں اور اس میں سادگی یا شگفتگی ہو۔گلزارؔ صاحب کی یہ نظم سراپا صداقت، جذبات سے لبریز اور سادگی وسلاست میں بہتے ہوئے پانی کی روانی رکھتی ہے۔

جہاں تک ابلاغ اور ترسیل کے مسئلہ کا تعلق ہے یہ نظم بڑی تیزی اور کامیابی کے ساتھ قاری تک پہنچ جاتی ہے۔اس نظم میں ادق، غیر مانوس اور عربی فارسی کے الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔اس میں قصص اور اساطیر کی اصطلاحات اور تلمیحات پیش نہیں ہوئیں اور نہ ہی ضائع لفظی اور معنوی کی مدد سے اسے گورکھ دھندہ کی دستاویز بنایا گیا، بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں شگفتگی کے ساتھ اُردو ہندی کے رسیلے شبدوں سے عام فہم لہجہ میں نغمہ سرائی کی گئی ہے۔تمام نظم میں مشکل سے ایک یا دو اضافتیں نظر آتی ہیں وہ بھی غالبؔ ہی کے شعر کو پیش کرتے ہوئے ورنہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر لفظ اپنی جگہ ایک آبدار موتی ہے جو نظم کے مصرعوں میں نغمگی اور ترنم کے رشتے سے جڑا ہوا ہے۔نظم اور غزل میں یہ بھی ایک فرق ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنے موضوع کی اکائی ہوتا ہے۔یعنی نظم کی طرح

شعر ایک دوسرے سے جڑے نہیں رہتے اِسی لئے غالبؔ جیسے یکتائے روزگار نے تنگنائے غزل کا شکوہ کیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ گلزارؔ نے غالبؔ جیسے عظیم، مشکل اور پیچیدہ غزل کے شاعر کو نظم کے سہل ممتنع میں سجایا ہے۔

گلزارؔ کی نظم عقیدت کی حاضری سے شروع ہو کر غالبؔ ہی کے اُس شعر پر ختم ہوتی ہے جس میں غالبؔ کی شعری عظمت، عدم اور وجود کی حقیقت، حیات اور ممات کی حالت، سود و زیاں کی کیفیت اور واجب و ممکن کی قیمت اور عظمت کے رموز کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

(آغاز)

گلی قاسم میں آ کر

تمہاری ڈیوڑھی پر رُک گیا ہوں، مرزا نوشہؔ!

تمہیں آواز دوں پہلے۔

چلی جائیں ذرا پردے میں اُمراؤ

تو پھر اندر قدم رکھوں

(اختتام)

بس اک آواز ہے جو گونجتی رہتی ہے اب گھر میں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!!

گلزارؔ باریک بین اور دقیق نگار شاعر ہیں۔ انہوں نے غالبؔ کے خطوط کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے۔ غالبؔ کے (886) اُردو خطوط اور تقریباً ساڑھے تین سو فارسی خطوط مطبوعہ حالت میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ گلزارؔ کی 1988ء کی غالبؔ سیریل ہو یا 2005ء کی کتابی شکل میں مرزا غالبؔ کا ایک سوانحی منظر نامۂ غالبؔ کے خطوط اور ان کے اشعار کے مستند اور معتبر استفادہ نے غالبؔ کی حیات اور شخصیت کی کتابی پینٹنگس کو خواص کے دیوان خانوں سے نکال کر گھروں اور گھروندوں کی چلتی پھرتی تصویروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ قاسم جان کی گلی کا تذکرہ غالبؔ کے خطوط میں یوں بھی ملتا ہے، جو غدر کے موقع کی عکاسی ہے۔

''قاسم جان کی گلی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خان کے پھاٹک تک بے چراغ ہے''۔ مصرعہ میں مرزا نوشہؔ کے نام کی رعایت شاعر کی محبت اور سپردگی کی علامت ہے جو غالبؔ کے قریبی دربار اور بازار کے احباب کو حاصل تھی۔ گلزارؔ نے پہلے ہی مصرعہ میں قربت اور خلوص کا اظہار کر کے سننے والوں کو بتا دیا کہ وہ غالبؔ کے قریبی نیاز مند یا خود ان کے قول کے مطابق تیسرے قریبی خدمت گزار ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ رستے اور رشتے دل سے دل کو ہوتے ہیں۔ مشہور فارسی کہاوت ہے۔

دل با دل راہ دار

امراؤ جان غالبؔ کی اکلوتی بیوی تقریباً غالبؔ کی ہم عمر تھیں اور غالبؔ کے انتقال کے بعد ایک برس سے زیادہ زندہ بھی نہ رہ سکیں۔ نماز وروزہ اور پردہ کی پابند۔ غالبؔ نے جہاں طنز و مزاح میں شوخیاں کیں وہیں زندگی بھر امراؤ کی ستائش بھی کی۔ گلزارؔ نے ڈیوڑھی کی دہلیز پر غالبؔ اور امراؤ کو یاد کر کے ہر گوپال تفتہؔ اور مہدی مجروحؔ کی یاد تازہ کر دی۔

ایک کامیاب نظم کے الفاظ ذہن میں سہ بُعدی (Three dimensional) پیکر بنا کر اس کو متحرک کر دیتے ہیں یعنی سامع اور قاری کی نظر کے سامنے یکے بعد دیگر آتے رہتے ہیں۔ اگر شاعر کسی منظر یا واقعہ کی نقش نگاری کر رہا ہے تو اس کے نقش کو اصل کے مطابق ہونا چاہیے، یہاں وہ امیجری کے رَخش کو بے لگا نہیں کر سکتا۔ غالبؔ 27 جولائی 1862ء کو مرزا علاؤ الدین خان علائیؔ کو خط میں لکھتے ہیں ''میاں''۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔''

غالب میر مہدی مجروحؔ کو 26 ستمبر 1862ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

''برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی، سعادت خان کی نہر ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئیں ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹا بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانے میں، فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔''

گلزار کہتے ہیں۔

چلمچی لوٹا سینی اٹھ گئے ہیں

برستا تھا جو دو گھنٹے کو مینہ، چھت چار گھنٹے تک برستی تھی

اُس چھلنی سی چھت کی اب مرمت ہو رہی ہے۔

شاعر نے ماضی کو حال سے جوڑ کر نظم کے مضمون میں صورتِ حال کو بیان کر دیا۔ یہ ایک قسم کی مکالمہ نگاری ہے جو غالبؔ کے وجود کو درک کر کے کی جا رہی ہے تا کہ لوگ باخبر ہو سکیں۔ یہ کام صرف ایک کامیاب ناظم ہی اپنی نظم میں کر سکتا ہے۔ اس واقعہ میں غالبؔ کے خطوط کی یادداشت سے حظ اور موجودہ تعمیر سے اطلاع اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔

پھر شاعر واجب کفائی کی مثال بن کر تمام خلقت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لے کر افسوس کرتا ہے کہ اس کام کے لئے ایک صدی سے زیادہ وقت لگا کیوں کہ ذیل کے مسائل در پیش تھے۔

صدی سے کچھ زیادہ وقت آنے میں لگا

افسوس ہے مجھ کو

اصل میں گھر کے باہر کوئلوں کی ٹال کی سیاہی لگی تھی

وہ مٹانی تھی

اُس میں بس!

کئی سرکاریں بدلی ہیں تمہارے گھر پہنچنے میں۔۔۔

یہ امر واقعہ تھا کہ غالبؔ کے گھر کے باہر کا علاقہ کوئلوں کی ٹال سے گھیر کر سیاہ ہو چکا تھا۔ یہاں شاعر نے مصرعہ میں کوئلہ، سیاہی اور مٹانے کا عمدہ

برتاؤ کیا ہے اور سیاسی حالات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

گلزار کی نظم سے ان کی غالب سے محبت اور ان کی نظر میں غالب کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ اس نظم میں غالب کے چار پانچ اشعار یا مصرعوں کے فقروں کی تضمین کر کے نئے نئے مضمون تراشے گئے ہیں جو نظم کا اچھوتا تخلیقی رُخ ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

یہیں شیشوں میں لگوائے گئے ہیں
پیرہن اب کچھ تمہارے

پھر فوراً پیرہن کی نسبت سے مضمون باندھتا ہے۔

ذرا سوچو تو قسمت چار گرہ کپڑے کی اب غالب
کہ تھی قسمت یہ اُس کپڑے کی غالب کا گریباں تھا

یہاں ذہن میں اچانک غالب کا مشہور شعر ابھرنے لگتا ہے۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریبان ہونا

عاشق کا گریباں ہمیشہ چاک رہتا ہے۔ غالب نے تو اس تار تار پیرہن کی قسمت پر ترس کھایا تھا لیکن گلزار نے مضمون کو الٹ کر اُسے وقار اور عظمت کا مینارہ بنا دیا کہ وہ چار گرہ کپڑا کتنا خوش نصیب تھا جو غالب کا گریباں تھا جس کا تار تار غالب کی گردن کے رگ و پے سے مَس ہوتا تھا۔ گلزار نے ''مرزا غالب ایک سوانحی منظر نامہ'' کے مقدمہ میں اپنی غالب سے الفت اور جذباتی قربت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''میں اکثر کہا کرتا ہوں۔ غالب کے ہاں تین ملازم تھے جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔ ایک کلّو تھے جو آخر دم تک ان کے ساتھ رہا، دوسری وفادار تھیں جو تتلاتی تھیں اور تیسرا میں تھا۔ وہ دونوں تو اپنی عمر کے ساتھ رہائی پا گئے، میں ابھی بھی ملازم ہوں۔ غالب کا ادھار لینا، اُدھار نہ چکا سکنے کے لیے پُر مزاح بہانے تراشنا پھر اپنی خفت کا اظہار کرنا جذباتی طور پر (emotionally) مجھے غالب کے قریب لے جاتا ہے۔ کاش میری حیثیت ہوتی اور میں غالب کے سارے قرض چکا دیتا۔ اب حال یہ ہے کہ میں اور میری نسل اس کی قرض دار ہے''۔ اس ایک لفظ ''کاش'' میں گلزار کے جذبات اور عقیدت کا سمندر سمایا ہوا ہے۔ شاعر نے بہت صحیح کہا ہے کہ تمام برصغیر غالب کا قرض دار ہے۔ یہ تو غالب ہی کے دل سے پوچھیں کہ اس جینئس (Gneius) پر دنیا کتنا تنگ ہو چکی تھی جس کو اُس نے ہنس ہنس کر جھیلا لیکن آخر غالب بھی انسان تھے کبھی کبھار اپنی ناقدری پر شکوہ بھی کیا۔ مالک رام کی کتاب خطوط غالب میں غالب کا وہ خط جو غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام ہے اور جو غالب کے انتقال سے صرف کچھ مہینے پہلے لکھا گیا ہے اُس سے غالب کے اندرونی دکھ درد، دنیا کی ناقدری اور ان کی کسمپرسی کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

حضرت!

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے۔ اصلاح دینے سے توبہ کی ہے۔ شعر سُننا تو ممکن ہی نہیں، بہرا ہوں، شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں، ساٹھ برس بکا، نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔ بقول انوری

اے دریغا نیست ممدوح سزاوارِ مدیح
وے دریغا نیست معشوق سزاوارِ غزل

(افسوس کہ ممدوح اس قابل نہیں کہ اس کا قصیدہ لکھا جا سکے اور معشوق اس قابل نہیں کہ اُس پر غزل کہی جا سکے)

سب شعرا سے اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔

1868ء اسداللہ خان غالب

اے کاش غالب جانتے کہ آج ان کے چاہنے والے اور ان کے خطوں کو پڑھنے والے کروڑوں پرستار موجود ہیں۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

پرستاروں کی گنتی بھی اسد اب تو کروڑوں ہے!
تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے صفحات رکھے جا رہے ہیں

غالب کی ایک بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ وقت سے پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ وہ خود کہتے تھے: میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں۔ اُن کا بیان تھا۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ کبھی کہتے تھے۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا اور اپنے اشعار کی داد بھی آپ ہی دی۔

غالب کے اس ترسیلی اور ابلاغی دشوار مسئلہ کو گلزار نے بڑی سلیس اور شگفتہ زبان میں یوں پیش کیا ہے۔

تمہیں تو یاد ہو گا
مسودہ جب رام پور سے لکھنؤ سے آگرہ تک
گھوما کرتا تھا
شکایت تھی تمہیں
''یارب نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
انہیں دل اور دے یا مجھ کو زباں اور
زمانہ ہر زباں میں پڑھ رہا ہے اب تمہارے سب سخن غالب
سمجھتے کتنا ہیں یہ تو وہیں سمجھیں یا تم سمجھو۔

یہ غالب کے کلام کا جادو ہے کہ اب غالب کا اُردو کلام ہندی، رومن کے علاوہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں دستیاب ہوتا ہے۔ غالب نے سچ کہا تھا کہ میری شہرت میرے مرنے کے بعد ہو گی۔

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کے خطوط اُردو نثر کا نیا رخ مانے جاتے ہیں۔ غالب نے

پہلے فارسی میں پھر اُردو خطوط میں مکالمہ نویسی سے قدیم تشریعاتی تحریری عبارتوں کو نکال کر زندہ بات چیت میں تبدیل کر دیا یعنی غالبؔ نے قلم کی زبان سے ہمیں بات کرنے کا سلیقہ اور لہجہ سکھایا اور اس کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کرنے کے لیے اس شربت گفتار میں مزاح اور طنز کی شراب بھی ملا دی۔ اس اہم اور دلکش موضوع کو گلزارؔ نے خاص منظر کشی اور اپنی علامتی شاعری کے ہنر سے شاہکار بنا دیا اور پھر نہ صرف ماضی سے ملایا بلکہ اس کو مستقبل سے جوڑ کر ہزاروں داستانیں ایک ہی سانس کے جھونکے میں سُنا دیں۔ خطوط کے مطالعہ اور لفافوں کے نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ خاص اور خصوصی لفافے آگرہ اور دلّی میں چھپواتے تھے اور پھر ان کو گھر میں بیٹھ کر لفافے کی شکل میں جوڑ لیتے تھے۔ گلزار کہتے ہیں:

جہاں کلّن کو لے کر بیٹھتے تھے یاد ہے؟
بالائی منزل پر
لفافے جوڑتے تھے تم لیئی سے
خطوں کی کشتیوں میں اُردو بہتی تھی
اچھوتے ساحل اُردو نثر چھونے لگ گئی تھی
وہیں بیٹھے گا کمپوٹر۔
وہاں سے لاکھوں خط بھیجا کرے گا
تمہارے دستخط جیسے، وہ خوشخط تو نہیں ہوں گے
مگر پھر بھی

جن لوگوں نے غالبؔ کا دستخط دیکھا اور مصرعہ آخر کی داد دیں گے۔ غالبؔ بہت خوشخط تھے۔ غالبؔ کے بہت سے خطوط آج بھی محفوظ ہیں جن پر متن کے علاوہ غالبؔ کی مہریں، کچھ ہندسے اور علامتیں بھی ہیں۔ بڑا شاعر نہ صرف قطرہ میں دجلہ دیکھتا ہے بلکہ قطرہ میں دجلہ دکھاتا بھی ہے

خطوں کی کشتیوں میں اُردو بہتی تھی
اچھوتے ساحل اُردو نثر چھونے لگ گئی تھی

یہاں گلزارؔ صاحب نے سمندر کو نہ صرف کوزہ میں بند کیا ہے بلکہ اس میں تلاطم بھی پیدا کیا ہے۔ کیا غالبؔ کے خطوط کا جدید اور موثر اثر اُردو نثر پر اس سے بہتر بیان کیا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ''غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور'' سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ کا نہ صرف بیان بلکہ ان کے رہنے کا مکان اور ان کی شخصیت کا جہان بھی جداگانہ تھا۔ جب کسی معمولی شاعر کا تخلص بھی اسدؔ سنا تو اپنا پرانا تخلص اسدؔ کو بدل کر غالبؔ رکھ لیا۔

غالبؔ نے اپنے مرنے کی تاریخ اپنی زندگی ہی میں کہہ لی تھی۔

مرد غالبؔ بگو کہ غالبؔ مرد

جس کی رو سے 1277 ھجری نکلتے تھے۔ اتفاق سے 1277 ھجری میں دہلی میں ہیضہ پھیلا۔ میر مہدی مجروحؔ نے غالبؔ کو سال ختم ہونے پر لکھا اب تو یہ سال بخیر گزر گیا۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ غالبؔ نے جواب دیا۔

''میاں'' 1277 ہجری کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔

غالبؔ مرزا حاتم علی مہرؔ کو لکھتے ہیں۔'' مگر یہ یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وادی ہے عام۔ ملاّ، حافظ، بساطی، پنچہ بند۔ دھوبی۔ سقہ، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر لمبے بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اُسی دن سر منڈایا۔ غالبؔ کی ہر ادا اور ان کی وضع قطع کی طرح جداگانہ تھی۔ اسی لیے تو تمام لوگوں سے جداگانہ اونچی ٹوپی پہنتے تھے۔ گلزارؔ نے اس تکلف کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔

تمہاری ٹوپی رکھی ہے
جو اپنے دور سے اونچی پہنتے تھے

اس میں صنعت ابہام ہے شاعر نے اپنے دور سے کہہ کر غالبؔ کو تمام ہم عصروں شاعروں پر غالبؔ اور بلند قامت کر دیا۔ پھر غالبؔ کی جوتیوں کا ذکر بھی ایک خوبصورت لطیفہ کے اشارے کے ساتھ

تمہارے جوتے رکھّے ہیں
جنہیں تم ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے
شکایت تھی کہ سارے گھر کو ہی مسجد بنا رکھا ہے بیگم نے

یہاں شاعر نے غالبؔ کے اُس مشہور لطیفہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں غالبؔ نے اپنی بیگم سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ یہ گھر تو میرا تھا لیکن تم نے ہر جگہ نماز پڑھ کر اس کو اللہ کا گھر یعنی مسجد بنا دیا ہے۔ پھر اگر کوئی قدم رکھّے تو کہاں رکھّے اور کرے تو کیا کرے اس لیے جوتے اتار کر ہاتھ میں رکھ لیے ہیں۔

اس نظم کا آخری حصّہ نتیجہ خیز اور بڑا ہی دلکش ہے جو ایک کامیاب نظم کے عمل کا نقطۂ اوج یا (Climax) ہی ہو سکتا ہے۔ گلزارؔ نے اس آخری حصّے کو غالبؔ کے تین اشعار سے سجا کر محراب نظم کی مینا کاری کی ہے۔ یہاں الفاظ و معانی کے سنگ و تیشہ سے نادر مضامین کے بت تراشے ہیں جن کی بے زبانی دور حاضر کی زبان بن گئی ہے۔

تمہارا بت بھی اب لگوا دیا ہے اونچا قد دے کر
جہاں سے دیکھتے ہو اب، تو سب بازیچۂ اطفال لگتا ہے!

سبھی کچھ ہے مگر نوشہؔ (غالبؔ)
اگرچہ جانتا ہوں، ہاتھ میں جنبش نہیں بت کے
تمہارے سامنے اک ساغر و مینا تو رکھ دیتے
بس اک آواز ہے جو گونجتی رہتی ہے اب گھر میں
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!!

یہ نظم دراصل ایک مکمل ترسیلی نظم ہے جس میں ماضی اور حال کو مستقبل سے جوڑا گیا ہے اس نظم میں گزشتہ اور موجودہ واقعات نگاری کے ساتھ

ساتھ شاعر کی جذبات نگاری نظم کے ہر ہر لفظ سے نمایاں ہے جو پڑھنے اور سننّے والے کو مسحور کرنے کے لیے کافی ہے۔ نظم میں غالبؔ کے شعر، مصرعے اور فقرے اس طرح پروئے گئے ہیں جیسے موتیوں کی مالا میں کچھ کچھ فاصلوں پر لعل و یاقوت اور زمرّد کے ٹکڑے۔ نظم کے تسلسل اور حسنِ بیان کو برقرار رکھنے کے لیے اور مزید بحر کی نغمگی کے فطری بہاؤ کو تیز کرنے کے لیے بعض لفظوں کو موڑ کر، جوڑ کر، کچھ کچھ الفاظ چھوڑ کر صحیفہ عشق کی مرقع کشی کی گئی ہے چناں چہ جیسے ہی نظم کا مصرعہ صدا بن کر گونجا فوراً سننّے والے کے ذہن میں اُس کی تصویر ابھرنے لگتی ہے۔ اسی کا نام جادو بیانی اور شعری کرشمہ ہے۔ بعض غزل اور نظم کے شاعروں نے تنگ دامنی کا شکوہ کیا ہے لیکن اس نظم کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ

سلیقہ ہو تو گنجائش بہت ہے

یقیناً جب تک غالبؔ کا کلام ہمارے درمیان موجود ہے ہم غالبؔ سے کسبِ فیض کرتے رہیں گے۔ دنیا اُس جینئس (Genius) نابغۂ روزگار دیدہ ور کے لیے بازیچۂ اطفال کیوں نہ ہو جس نے سوال کیا تھا؟

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

آخر میں ہم یہ کہیں گے کہ نظم کا لطف اس کے تسلسل میں ہے اس لیے ہم یہاں گلزار صاحب کی پوری نظم کو بطور قند مکرّر پیش کرتے ہیں۔

گلی قاسم میں آ کر
تمہاری ڈیوڑھی پر رُک گیا ہوں، مرزا نوشہؔ!
تمہیں آواز دُوں پہلے۔۔۔
چلی جائیں ذرا پردے میں اُمراؤ
تو پھر اندر قدم رکھوّں

چلمچی، لوٹا، سینی، اُٹھ گئے ہیں
برستا تھا جو دو گھنٹے کو مینہہ، چھت چار گھنٹے تک
برستی تھی۔۔۔
اُس چھلنی سی چھت کی اب مرمّت ہو رہی ہے
صدی سے کچھ زیادہ وقت آنے میں لگا،
افسوس ہے مجھ کو!
اصل میں گھر کے باہر کوئلوں کے ٹال کی سیاہی لگی تھی
وہ مٹائی تھی۔۔۔
اُسی میں بس،
کئی سرکاریں بدلی ہیں تمہارے گھر پہنچے میں!
لفافے جوڑتے تھے تھے تم لیئی سے
خطوں کی کشتیوں میں اُردو بہتی تھی

اَچھوتے ساحل اُردو نثر چھونے لگ گئی تھی
وہیں بیٹھے گا کمپیوٹر،۔۔۔
وہاں سے لاکھوں خط بھیجا کرے گا
تمہارے دستخط جیسے، وہ خوشخط تو نہیں ہوں گے
مگر پھر بھی۔۔۔
پرستاروں کی گنتی بھی اَسدؔ، اب تو کروڑوں ہے!
تمہارے ہاتھ کے لکھّے ہوئے صفحات رکھّے جا رہے ہیں
تمہیں تو یاد ہوگا۔۔۔
''مسودہ'' جب رامپورؔ سے، لکھنؤ سے، آگرہؔ تک
گھوما کرتا تھا
شکایت تھی تمہیں، ''یارب نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے وہ میری بات
اُنہیں دل اور دے یا مجھ کو زباں اور۔۔۔''

(یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور)
یہیں شیشوں میں لگوائے گئے ہیں
پیرہن اب کچھ تمہارے
ذرا سوچو تو قسمت چار گرہ کپڑے کی اب غالبؔ
کہ تھی قسمت یہ اُس کپڑے کی، غالبؔ کا گریباں تھا!

تمہاری ٹوپی رکھّی ہے۔۔۔
جو اپنے دَور سے اُونچی پہنتے تھے
تمہارے جوتے رکھّے ہیں
جنہیں تم ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے،
شکایت تھی کہ سارے گھر کو ہی مسجد بنا رکھّا ہے بیگم نے!

تمہارا بُت بھی اب لگوا دیا ہے، اُونچا قد دے کر،
جہاں سے دیکھتے ہو اب، تو سب بازیچہ اطفال لگتا ہے!

سبھی کچھ ہے مگر نوشہؔ (غالبؔ)
اگرچہ جانتا ہوں، ہاتھ میں جُنبش نہیں بُت کے
تمہارے سامنے اک ساغر و مینا تو رکھ دیتے
بس اِک آواز ہے جو گُونجتی رہتی ہے اب گھر میں
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا مَیں تو کیا ہوتا!!

''عبادت کی گونج''

صفوت علی صفوت

(یو۔ایس۔اے)

گلزؔار شاعری ہے اک گلزارِ ہند میں
نغمے ''چہارسُو'' ہیں یہ سارے پرند میں

پرواز میں اُدھر جو عبادت کی گونج ہے
نغمات بھی اِدھر ہیں خیابانِ رند میں

ہم نے تو نوکِ خشت پہ کچھ بھی نہیں لکھا
اُنکی محبتوں کا ہے چرچہ درند میں

محشر میں یوں کریں گے سفارش کے اے خدا
اپنی نجات، اُنکی ہے فلمی دِھند میں

عصفور کہہ رہی ہیں کہ گلزؔار کے لیے
صفوؔت نے لکھ دیئے ہیں یہ اشعار زند میں

اشعار لکھتے لکھتے نہ جانے کیا سوچنے لگا۔نہ کبھی گلزؔار صاحب سے ملاقات ہوئی نہ ٹیلی فون پر ہی علیک سلیک۔آخری مصرعہ میں ''زند'' پر قافیہ موزوں نظر آیا۔فارسی زبان میں، خاص طور پر آگ کی پرستش کرنے والوں کی مقدس کتاب کیوں ذہن میں آئی اور زند بمعنی ''روح'' کیوں اُتر گئے واللہ اعلم۔کیا یہ ''قابِ قوسین اوادنیٰ'' والی نزدیکی پسِ ذہن تھی؟ یہی سوچ رہا تھا اور رات گذرتی جاتی تھی۔کرسی پر ہی جھومنے لگا۔اور کاغذ اپنی جگہ سراب کی صورت بنتا چلا گیا۔

اگلی صبح مزید خیالات نازل ہوئے۔شیطان نے بھی بہکایا۔سوچنے لگا کہ ''چہارسُو'' کو گلزار نمبر نکالنے کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔صفوت بھی اُنکی شان میں چند جملے لکھ سکیں۔اگر گلزؔار صاحب یہ جملے پڑھیں تو ان سے درخواست ہے کہ مسکرائیں۔اور یہ لکھنے کے بعد مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ راقم جس قدر ریسرچ کرتا ہے اور علم کا خزانہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اُسی قدر اُسے اپنی کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔

گفتگو اگر گلزار صاحب کی نظموں کے حوالے سے کی جائے تو ن۔م راشد، اختر الایمان، میراجی، علی سردار جعفری، مجید امجد، وزیر آغا، ستیہ پال آنند اور فیض احمد فیض سے ہوتی ہوئی گلزار صاحب پر آ کر ہی ختم ہوگی کیونکہ گلزار صاحب نے جس طرح کی تشبیہات استعارے اور علامات اپنی نظموں میں برتی ہیں وہ انہیں نظم کے بڑے ناموں کی کہکشاں میں لامحالہ شامل کرتی ہیں۔

بات اب افسانہ نگاری ہی کی لیجیے۔گلزار صاحب نے اگر منٹو، عصمت، کرشن چندر جیسا بے باکانہ یا رومانی طرزِ تحریر اختیار نہیں کیا تو اس میں گلزار صاحب کی ذاتی اپروچ کے ساتھ اُس تربیت کا بھی دخل ہے جو انہوں نے بمل رائے کے معاون کے طور پر حاصل کی۔مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ گلزار صاحب نے اپنے پیش رو یا ہم عصر سے کوئی اثر نہ لیا ہو۔اُن کے افسانوں کو بغور پڑھنے کے بعد راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، جوگندر پال، انتظار حسین سب سے بڑھ کر ستیہ جیت رے کے اثرات باآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔گلزؔار اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ:

ذکر ہوتا ہے جہاں بھی مرے افسانوں کا
صدر دروازہ سا کھلتا ہے کُتب خانوں کا

لفظ صدر میں ''د'' پر جزم ہے۔اور ''یوپی'' کے کلچر میں دیوان خانے کے سامنے والے یا بڑے دروازے کے لئے لفظ ''پھاٹک'' یا ''صدر دروازہ'' استعمال کیا جاتا ہے۔تاہم اگر پسِ ذہن ''د'' پر زبر آئے تو پھر یہ ''دل کا دروازہ'' اور اگر پسِ ذہن افسانوی پر تو پھر لفظ کُتب (عربی میں پڑھا) آنے لگتا ہے تو مصرع کا اختتام اچھا لگنے لگتا ہے۔کتب خانے یعنی پڑھنے لکھنے پر۔اور اگر پسِ ذہن پر مزید اجتہاد کیا جائے تو پھر پہلا مصرع، اُسے دوبارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔اور مرے کی بجائے، ترے میں سارے دروازے کھلے نظر آتے ہیں۔اچھا شعر وہی ہے کہ جسے اگر کوئی عالم پڑھے تو اُس پر ایک افسانہ لکھ ڈالے۔اب گلزؔار صاحب کا یہ شعر دیکھئے۔

ہونٹ کچھ کہتے نہیں، کانپتے ہونٹوں پہ مگر
کتنے خاموش سے افسانے رُکے رہتے ہیں

آج کل راقم کا واسطہ کثیرِ عمر پانے والے مریضوں سے رہتا ہے۔ان لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو نہ صرف بوڑھے ہیں بلکہ کچھ نہ کچھ ذہنی بیماری میں بھی مبتلا ہیں۔ویسے تو بوڑھاپا بذاتِ خود ایک بڑی کمزوری ہے مگر ذہن بھی پوری طرح مستعد نہ ہو تو اردگرد تمام لوگوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔میرا مشاہدہ ہے کہ امریکہ جیسے ملک میں بھی ایسے لوگوں کے ساتھ سُلوک اچھا نہیں۔اور بجائے اس کے کہ بیماری کو قصوروار سمجھا جائے، خود مریض کو لعنت ملامت کی جاتی ہے لہٰذا جب میں نے یہ شعر پڑھا تو بڑی دیر تک سوچتا رہا۔اور مجھے اپنی لکھی ہوئی ''مثنویِ نیوران'' یاد آئی۔میں ہمیشہ فکرِ فردا اور حقیقت سے جُڑا رہتا ہوں۔مگر افسانے سے ایک محبت ہے۔یہی کہ ان افسانوی باتوں میں ایک حقیقت چھُپی رہتی ہے۔ربطِ خفی کی شناخت؟

گلزؔار صاحب کی تحریروں میں خاص کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے تقریباً ہر مضمون پر کچھ نہ کچھ تحریر کیا ہے۔ اور اُنکے مشغلوں میں فلمی گانے، مصوری موسیقی اور آرٹ کی ہر وہ قسم موجود ہے جو آرٹ کہلانے کے قابل ہے۔ اُنکی سائنسی تخلیق سے متعلق ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صاحب کا مضمون انتہائی ٹھوس اور اعلیٰ مضمون ہے۔ ''رات پشمینے کی''۔ یہ علمی مضمون ڈاکٹر صاحب نے 2007ء میں ف۔س۔اعجاز کی تعریف یافتہ مرتب ''انشاء کا گلزار نمبر'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر نشیط صاحب کے اس مضمون کے بعد میری طرف سے اگر کوئی افسانہ ہے تو بس یہی کہ:

''ان ریشم روشن رنگوں میں ترا چہرہ جیسے بکھر گیا''

بہت پرانی بات ہے۔ میں ابھی طفلِ مکتب تھا اور ریڈیو پاکستان لاہور سے کسی ڈرامے میں کسی بچے کی آواز کی ضرورت تھی۔ شائد کہ میرا اُردو کا لہجہ دوسرے بچوں سے بہتر تھا، مجھے یہ کردار دیا گیا۔ اور پھر میں کئی سال تک ریڈیو کے ڈراموں میں بچوں کی آواز کا رول ملتا رہا۔ اس دوران بزرگ شعراء اور ادیبوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور اُنکی آپس کی گفتگو سننے کا موقع فراہم ہوتا۔ میں خاموش اُنکی باتیں سنتا کہ بچوں کو بزرگوں کی باتوں میں دخل اندازی کی اجازت نہ تھی۔ ایک بار ہند میں بنی ہوئی فلموں کا موضوع تھا اور موسیقی پر بات چل رہی تھی۔ ایک بزرگ نے کہا کہ وہ فلمی گانا وہ غزل، وہ نظم، وہ گیت، جسکی دی گئی موسیقی، جس کے بول، اور جہاں گائک کی آواز میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو پھر ایسا گانا، موسیقی طرز اور گائک امر ہو جاتے ہیں۔

گلزار کے لکھے ہوئے بول، اُنکی موسیقی اور گائک کی مترنم آواز میں جو ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اگر چہ میں نے چالیس برسوں میں (جب سے امریکہ آیا ہوں) ہندی فلم بہت کم دیکھی ہے تاہم بعض بول یاد ہیں مثلاً ''چھپہ چھپہ چرخہ چلے'' یا پھر ایک جگہ غالبؔ کی یاد آتی ہے ''تاروں کو دیکھتے رہیں۔۔۔''

گلزار کی فلمی کاوشوں پر لکھنے والے مجھ سے زیادہ پارکھ ہیں۔ میں تو صرف شاعرانہ اندازِ بیان کی تعریف کر سکتا ہوں جو مجھے پسند ہے۔ آپ کی دلچسپی کے لیے یہ بتلانا ضروری ہے کہ میری گلزار صاحب سے محبت اور اُنس کی پہلی وجہ غالبؔ سے اُن کا بے پناہ اور لازوال عشق ہے جو اُن کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ دوسری وجہ اُن کا آبائی شہر ''دینہ'' ہے جو ہمارے ادبی پیرومرشد سید ضمیر جعفری کا آبائی شہر بھی ہے۔ یہ نسبت جعفری صاحب کو ہمیشہ عزیز رہی اور جب بھی اُن کے سامنے گلزار صاحب کا ذکر ہوا تو اُن کے رخسار کی لالی اور آنکھوں کی چمک دیدنی ہوا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ گلزار صاحب کو ادبی جینئس کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

آخر میں گلزار کے لیے مولانا روم کی ایک بات یاد آتی ہے۔ بہت ہی مشہور فارسی کے مصرعے میں فرماتے ہیں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر

یعنی میں نے دیکھا کہ ایک بہت ہی سن رسیدہ، ایک شیخ، ایک بزرگ ایک چراغ لیے ہوئے گلی گلی پھرتے ہیں۔ جیسے اُنہیں کسی چیز کی تلاش ہو۔ باقی کے فارسی مصرعے میں یہاں تحریر نہیں کرتا کہ بات لمبی ہو جائے گی۔ تاہم شیخ سے پوچھنے پر یہ پتہ چلا کہ وہ ان چوپایوں میں رہتے رہتے پریشان ہیں اور ایک انسان کی تلاش میں ہیں۔ گلزؔار صاحب بھی اُن چند لوگوں میں ہیں کہ جن کو ''انسان'' کہا جا سکتا ہے۔ جنہیں چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔

۔ غیر فلمی میوزک البم ۔

دل پڑوسی ہے (آر ڈی برمن اور آشا بھونسلے)	1987
بوڑھے پہاڑوں پر (وشال اور سریش واڈیکر)	1997
مراسم (جگجیت سنگھ)	1999
وعدہ (استاد امجد علی خان)	1999
سن سیٹ پوائنٹ (بھوپندر، چترا اور وشال)	2000
وصال (غلام علی)	2001
اداس پانی (ابھیشیک رائے)	2002
عشق عشق (ریکھا اور وشال بھاردواج)	2002
عابدہ سنگز کبیر (عابدہ پروین)	2003
کوئی بات چلے (جگجیت سنگھ)	2006

''میرا کچھ ساماں''

ڈاکٹر ظفر حسن

(بھارت)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں نیو تھیٹرز کی فلموں مثلاً ''چنڈی داس''، ''میرا بائی''، ''پورن بھگت''، ''یہودی کی لڑکی'' اور ''دیوداس'' وغیرہ نے سنجیدہ موضوعات پیش کئے جن میں ایک مربوط مضمون اور کہانی بھی ہوتی تھی۔ پھر شانتا رام کی فلمیں یا ایسی موضوعاتی فلمیں جیسے کیدار شرما کی ''چتر لیکھا'' کاردار کی ''پاگل'' اور ''پوجا''، ڈبلیوز یڈ احمد کی ''من کی جیت'' شوکت حسین رضوی کی ''زینت'' اور محبوب خان کی ''انمول گھڑی'' آئیں۔

آزادی کے بعد کمال امروہوی کی ''محل'' راجکپور کی ''برسات'' اور ''آوارہ'' محبوب کی ''انداز''، ''امر'' اور ''مدر انڈیا'' اور کے آصف کی ''مغل اعظم'' وہ فلمیں تھیں جنہوں نے فلمی صنعت کو بامقصد اور باوقار طور پر آگے بڑھایا۔ عام خیال ہے کہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشرے ہندوستانی فلم کے سنہری دور کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے بعد ماسوائے چند فلموں کے ہندوستانی فلمیں زیادہ تر اپنا سکّہ نہ جما سکیں اور زوال پذیر ہوئیں۔ بے شک چند فلمیں مثلاً ''گرم ہوا''، ''ارتھ''، ''امراؤ جان'' وغیرہ نے اچھا مظاہرہ کیا لیکن بالعموم ہندوستانی فلمی صنعت زیادہ متاثر نہ ہو سکی۔ اس پس منظر میں گلزار نے قدم رکھا جنہیں ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں کے ''دو بیگھہ زمین''، ''مدھومتی'' اور ''بندنی'' جیسی کامیاب اور بااثر فلموں کے خالق بمل رائے (بمل دا) سے فلمی تکنیک اور فنی رموز سیکھنے اور سمجھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

گلزار کی فلمی کارکردگی میں کئی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اول تو وہ کہانی اور اسکرپٹ پر بڑا زور دیتے ہیں۔ ان کے یہاں فلم بنانے میں پیشہ ورانہ نظم وضبط بھی ہوتا ہے۔ وہ خود ایک شاعر اور نامور افسانہ نگار بھی ہیں جس کی وجہ سے ان کی فلموں میں ایک تسلسل اور باقاعدگی بھی آجاتی ہے۔ یہ تمام عناصر ان کی فلموں کی ایک الگ پہچان بنا دیتے ہیں۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ گلزار نے مختلف النوع موضوعات پر فلمیں بنائی ہیں جن سے ان کے فن پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی بعض فلموں میں فسادات اور نئی نسل کی بے راہ روی کی عکاسی ہوتی ہے۔ بچوں کی دلچسپی کا بھی کافی سامان ملتا ہے۔ ان کی فلموں میں معذوروں کی مشکلات کی نشاندہی، مشرقی عورت کے مسائل اور اس کی اولا العزمی بھی، سیاسی میدان میں خواتین کا رول، غیر شادی شدہ افراد کے مسائل، بچوں کے مسائل اجاگر ہوئے ہیں، طربیہ فلمیں بھی انہوں نے بنائی ہیں۔ نفسیاتی موضوعات اور اداکاروں کے مسائل، سیاست اور اقلیتوں کے مسائل بھی ان کی فلموں میں سامنے آتے ہیں۔ اتنے موضوعات کو نباہنا ایک منجھے ہوئے فنکار ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ کیوں نہ ان کی فلموں کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے۔

میرے اپنے:

گلزار نے اپنی پہلی فلم میں ہی یہ ظاہر کر دیا کہ وہ فلم سازی کے بنیادی رموز سے آشنا ہیں۔ یہ مینا کماری کی آخری فلم تھی۔ اس میں پرانی اقدار جن کا وجود آج بھی دیہاتوں میں پایا جاتا ہے، اس کا شہری زندگی سے موازنہ کیا گیا ہے۔ گلزار نے اس فلم میں دکھایا ہے کہ کس طرح شہری زندگی میں آج کل کے نوجوانوں نے باغیانہ اور شرپسندانہ رویہ رائج الوقت سماجی انتظام کے خلاف اپنایا ہوا ہے۔ اس طرح انہوں نے ناراض اور ناخوش نوجوانوں کی ترجمانی کی ہے جنہیں مینا کماری اپنی کوشش سے تہذیبی اور روایتی دائرہ کار میں لانا چاہتی ہے۔ مگر اس مخلصانہ کوشش میں بدقسمتی سے مینا کماری کی حادثاتی طور پر موت واقع ہو جاتی ہے جب اسے جرائم پیشہ نوجوانوں کے ایک ٹولے کی آپس کی مار دھاڑ میں گولی لگ جاتی ہے۔ حالانکہ نوجوانوں کا یہ گروہ اس کی تعظیم بھی کرتا ہے اور اسے ماں کے روپ میں بھی دیکھتا ہے۔

''میرے اپنے'' نے ایک نیا موضوع دریافت کیا جس کا اظہار بعد میں فلم ''زنجیر'' (۱۹۷۴ء) میں ملتا ہے جہاں ناراض اور بے چین نئی نسل کے لڑکے دکھائے گئے ہیں۔ یہ موضوع بعد میں ہندوستانی فلموں کی مرکزی دھارا میں شامل ہو گیا۔

پریچے:

اس کی کہانی میں بچوں کی تفریح کا کافی سامان مہیا کیا گیا ہے۔ برصغیر کی فلموں میں عموماً کسی باقاعدہ کہانی یا پلاٹ کا اہتمام نہیں کیا جاتا جو ایک اچھی فلم بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ گلزار یہ احتیاط کرتے ہیں کہ اپنی فلموں کے لیے ایک اچھی کہانی کا انتخاب کر لیتے ہیں جو کہ فلم کے بنانے میں بہت مددگار اور معاون ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر فلم ''پریچے'' جو انہوں نے جتیندر کے لیے ۱۹۷۲ میں تیار کی جس کا مرکزی خیال مشہور فلم ''Sound of Music'' سے اخذ کیا گیا لیکن گورنس (Governess) کے زنانہ رول کو ایک آدمی کے کردار میں بدل دیا جسے کئی بچوں کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری دے دی جاتی ہے اور وہ سرکش بچوں کو تہذیب کے دائرے میں لاتا ہے۔

''پریچے'' میں طربیہ یا ظرافت کا پہلو بھرپور پایا جاتا ہے۔

کوشش:

گلزار کی تیسری فلم ''کوشش'' ان کی بہترین فلموں میں سے ہے۔ یہ ایک گونگے اور بہرے جوڑے کے بارے میں ہے۔ مرکزی کرداروں کو جیہ بہادری اور سنجیو کمار نے بڑی مہارت سے ادا کیا ہے حالانکہ دونوں نے ہاتھ کے

اشاروں سے کہانی اور جذبات کو بیان کیا ہے۔ مدن موہن کی موسیقی نے اس فلم کی کہانی کو مزید موثر بنا دیا ہے۔ اندھے، گونگے اور نابینا لوگوں کے جذبات کو گلزار نے نہایت حساس، دل گرفتہ اور قابل ستائش انداز میں پیش کیا ہے۔ ''کوشش'' جیسی فلمیں احساس دلاتی ہیں کہ ایسی فلمیں بنانا بھی ممکن ہے جو بغیر جنسیت کے فرسودہ فارمولے، بے محل گیت اور ناشائستہ ناچ کے بھی کامیاب ہو سکتی ہیں اور جن کی عوامی پذیرائی بھی ہوتی ہے۔

اچانک:

خواجہ احمد عباس کی لکھی ہوئی ایک کہانی پر بنی اس فلم میں وقت کا دھارا سیدھے خطوط، Linear طریقے سے نہیں بہتا۔ گلزار وقت کو اس طور سے برتتے ہیں جیسا کہ جیمس جوائس (James Joyce) اور ورجینا وولف (Virgina Wolf) نے اپنے معرکتہ الآرا ناولوں میں پیش کیا ہے۔ اس طرح سے کے تسلسل اور تواتر کو حقیقی انداز میں دکھایا گیا ہے اور گزرے زمانے کو احتیاط سے دور حاضر میں لا کر سچائی کو دکھایا گیا ہے۔

خوشبو:

فلم ''خوشبو'' میں مشرقی نظریۂ محبت کو پیش کیا گیا ہے جو کہ مغربی طرز محبت سے مختلف ہے۔ مشرقی ممالک میں جب ایک عورت اپنے عاشق کو دل دے دیتی ہے تو وہ ایک پختہ اور کامل فعل ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی طاقت بھی اسے اپنے عاشق سے جدا نہیں کر سکتی۔ گلزار یہ تاثر ایک حسین انداز میں پیش کرتے ہیں کہ جو محبت بچپن میں ہو جاتی ہے وہ پائدار ہوتی ہے۔ مشرقی خواتین کے عزم اور ارادوں کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنی خاموشیوں اور انتظار میں ہی وقت گزارتی ہیں تاوقتیکہ انہیں اپنی مردانہ مل جائے اور وہ اپنے عاشق کو پا نہ لیں۔

آندھی:

گلزار کی جرأت ہی تھی کہ انہوں نے آنجہانی اندرا گاندھی کے سیاسی خدوخال کو بنیاد بنا کر ایک سیاسی کہانی فلمائی جس میں ایک رومانی عنصر بھی تھا۔ اس فلم میں بنگال کی درجۂ اول کی اداکارہ سچترا سین سے گلزار نے ایک نہایت موثر رول کروایا ہے۔ سنجیو کمار کی اداکاری بھی ان کی بہترین فارمنس میں سے ہے۔ اس فلم کے تمام گیت بہت مقبول ہوئے۔

موسم:

فلم ''موسم'' کی خوبی یہ تھی کہ اس میں ایسے مرد عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو صاحب اولاد تو ہوتے ہیں لیکن جن کی شادی نہیں ہوئی ہوتی۔ کملیشور کے اس ناول کو گلزار نے بڑی نزاکت سے فلمایا ہے۔ اگر چہ اس فلم میں موضوع نہایت سنجیدہ ہے لیکن گاہے گاہے ہلکی (شرمیلا ٹیگور جس نے ماں اور بیٹی یعنی دونوں کے رول ادا کئے ہیں) فلم میں ایک دلچسپ چٹکیلے پن کا مظاہرہ کرتی ہے۔ فلم کے گانے ''دل ڈھونڈتا ہے'' اور ''رُکے رُکے سے قدم'' موقع محل کے لحاظ سے بہت موزوں ہیں۔

کنارہ:

گلزار شاذ و نادر ہی اپنی کسی فلم کی کہانی، موضوع یا منظر کو دہراتے ہیں۔ وہ ہمیشہ نئی کہانیاں نئے حالات میں نئی نئی شکلوں میں پیش کرتے ہیں۔ اکثر گلزار کی فلمیں سماجی موضوعات، معاشرے کی الجھنوں اور انسانی رشتوں کی کشمکش کو پیش کرتی ہیں۔ فلم ''کنارہ'' عام کہانیوں سے ہٹ کر بنائی گئی ہے جس میں تاریخی پس منظر دکھایا گیا ہے۔ اس فلم کا ایک اہم جز وہیما مالنی کا بھارت ناٹیم ہے جس کی معرفت ہیما مالنی نے مختلف النوع احساسات کا اظہار کیا ہے۔

کتاب:

گلزار نے بچوں کی نگہداشت اور ان کے مسائل پر ایک فلم ''کتاب'' بھی بنائی تھی۔ اگر چہ اس فلم میں ان کی اپنی زندگی کے حالات کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ لیکن یہ فلم بچوں کی نفسیات کے لئے ایک اچھی اور دلچسپ پیشکش ہے۔ اس میں بنگال کے درجہ اول کے اداکار اتم کمار اور ماسٹر راجو نے اونچے درجے کی اداکاری پیش کی تھی۔

انگور:

گلزار کی ایک اور فلم ''انگور'' ہے جس میں انہوں نے ہندوستانی فلموں میں وسعت لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ فلم شیکسپیئر کے مشہور زمانہ ڈرامہ Comedy of Errors پر مبنی ہے۔ یعنی ایسی طربیہ کہانی جس کی بنیاد انسانوں کی آپس کی غلط فہمیوں پر رکھی گئی ہے۔ اس میں انسانوں کی روزمرہ کی غلطیوں اور ان کے طنز اور قابل تضحیک اعمال پر ایسے حالات دکھائے گئے ہیں جن پر انسان ضرور مسکراتا اور ہنستا ہے۔ فلم میں سنجیو کمار کی تیز و طرار گفتگو پر موسی چڑجی کے چست، فی البدیہہ اور برجستہ جوابات بے مثال ہیں۔

نمکین:

فلم ''نمکین'' کو برصغیر کے نامور ہدایت کار جناب ڈبلیو زیڈ احمد (وحید الدین، ضیاء الدین احمد) صاحب نے ایک کلاسیک فلم کا درجہ دیا ہے۔ فلم میں سنجیو کمار کے علاوہ چوٹی کی اداکاراؤں وحیدہ رحمٰن، شبانہ اعظمی اور کرویرال نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ کہانی ایک المیہ کی شکل میں شروع ہوتی ہے جب ایک باپ اپنی ہی بیٹیوں کو ناچ، گانا اور بازاری کاروبار کی طرف دھکیلتا ہے۔ فضا گمبھیر ہوتی جاتی ہے لیکن آخر کار فطرت کی مداخلت، بچیوں کی ماں کی محنت اور سنجیو کمار کی انسان دوستی سے حالات نسبتاً سنور جاتے ہیں۔ اس فلم کی ایک پیچیدہ کہانی ہے جس میں بیک وقت کئی انسانی رشتوں کی ترجمانی کی گئی ہے۔ آخر کار شرمیلا ٹیگور اور سنجیو کمار کا رشتہ گٹھ جاتا ہے۔ اب تک ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سنجیو کمار کی اداکاری گلزار کے ہاتھوں میں بتدریج مختلف فلموں میں اپنے عروج کو پہنچتی ہے۔

میرا:

فلم ''میرا'' گلزار کے لیے ایک اہم فلم تھی جسے گلزار نے بڑے چاؤ سے بنایا۔ اس پر گلزار نے بڑی محنت بھی کی اور بہت تحقیق بھی کی چونکہ میرا بائی دراصل کوئی خیالی شخصیت نہیں تھی بلکہ اس کا ایک تاریخی وجود ہے۔ کوشش تو گلزار کی تھی کہ فلم ''میرا'' کو زیادہ سے زیادہ تاریخی تناظر میں حقائق پر مبنی بنایا جائے جو کہ انہوں نے کیا بھی۔ غالباً فلم میں وہ پراسرار حالات شامل نہ ہونے سے جو لوگوں نے میرا بائی کے بارے میں گڑھ لئے تھے فلم زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ حالانکہ میرا بائی کے بھجن بہت مقبول ہوئے۔ پنڈت روی شنکر نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔

اجازت:

اس فلم کی شروعات میں عشق و محبت کا وہ ابدی مثلث نظر آتا ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ شروع میں نصیرالدین شاہ کو انورادھا پٹیل سے عشق ہو جاتا ہے لیکن مجبوری کے تحت اس کا رشتہ ریکھا سے ہو جاتا ہے جس سے بچپن میں اس کی سگائی ہو چکی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تینوں کردار زندگی کے اپنے اپنے سفر پر چلتے رہتے ہیں۔ لیکن قدرت کے ایک پھیر کے نتیجے میں تینوں ایک عجیب لیکن معمول کے انداز سے پھر مل بیٹھتے ہیں۔

اس فلم میں بھی گلزار نے وہ بنیادی اجزا استعمال کئے ہیں جو انسانی رشتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ گلزار نے یہ کام نہایت حساس طریقے سے نبھایا ہے جس میں انسانی رشتوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فلم کے مکالمے چست اور طرحدار ہیں جنہیں ہر طبقے کے لوگوں نے پسند کیا۔ اس فلم کی ایک خصوصیت وہ دل پسند گانا ہے جو گلزار نے انورادھا پٹیل کے لیے لکھا یعنی ''میرا کچھ سامان......'' یہ نثر یہ نظم جس کو آشا بھونسلے نے آر۔ڈی۔ برمن (پنچم کی) موسیقی پر نہایت ہی انوکھے اور دل پذیر انداز میں گایا ہے ہندوستانی فلموں کے مقبول ترین گیتوں میں سے ہے۔

لیکن:

فلم ''لیکن'' میں ہردے ناتھ منگیشکر کی موسیقی پر گلزار کا ''یارا سیلی سیلی'' مشہور پرکشش اور پراسرار گیت ہے۔ یہ موضوعاتی نغمہ اور اس کی تکرار ڈمپل کپاڈیہ پر بہترین طریقہ سے فلمایا گیا ہے جو کہ ایک روح کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔ فلم ''لیکن'' کولتا منگیشکر نے پروڈیوس کیا کیونکہ اس وقت (۱۹۹۰ء) یہ احساس ہو چلا تھا کہ فلمی گیتوں کا معیار زوال پذیر ہے اور اس میں بہتری کی ضرورت ہے۔ انھی دنوں اخباروں میں مافوق الفطرت واقعات یا کہانیوں کا ذکر چھپتا تھا لیکن لوگ اس کی حقیقت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ طے پایا کہ ایک فلم اسی نام سے یعنی ''لیکن'' بنائی جائے جس میں کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو غیر یقینی یا مافوق الفطرت واقعات کی وضاحت کر سکے۔

لباس:

گلزار کی پندرھویں فلم ''لباس'' ہے جو فلم بنانے والوں اور اس میں کام کرنے والوں کے درمیان جھگڑوں کے تحت ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی۔ اس پر ظاہر ہے کہ گلزار رنجیدہ بھی ہیں اور بے بس بھی۔

روایت ہے کہ اس فلم میں اداکاروں کو دکھایا گیا ہے کہ وہ کس طرح دوسرے اداکاروں سے تعلقات رکھتے ہیں اور ان کے روابط یعنی ایک اداکار کے دوسرے اداکار سے کیسے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر یہی واقعات ان کی اصل زندگی میں رونما ہوں تو ان کا ردعمل دوسرا ہوتا ہے۔

ماچس:

فلم ''ماچس'' نوجوانوں کا ایک نفسیاتی جائزہ ہے جو کہ آپریشن بلیو اسٹار (Operation Blue Star) کے پس منظر میں لیا گیا ہے۔ جس کے ردعمل میں وزیراعظم اندرا گاندھی کا قتل ہوا تھا۔ گلزار کا موقف ہے کہ یہ پولیس اور سیاست دانوں کی بدمعاشی ہے جو نوجوانوں کو بغاوت یا دہشت گردی پر اکساتے ہیں۔ ''ماچس'' ایک نہایت حساس سیاسی ڈرامہ ہے جو دور حاضر کی عکاسی کرتا ہے اور جس میں عوام کی دلچسپی قائم ہے۔ یہ فلم اس سیاسی نتیجے کا تجزیہ کرتی ہے جب ایک فرقے کو حد سے زیادہ پریشان اور معتوب کیا جاتا ہے۔ پختہ کار اداکار کلبوشن کھڑبندا کا کہنا ہے کہ ''میں نے گلزار کی دو فلموں میں اداکاری کی، ''ماچس'' اور ''ہوتوتو''۔ جو چیز مجھے ''ماچس'' میں پسند آئی وہ یہ تھی کہ اس میں بلاوجہ شدت یا مبالغہ آمیز ڈرامہ نہیں تھا۔ اس میں صرف اشاروں سے مفہوم سمجھایا گیا ہے۔ جب میں کئی سالوں بعد پنجاب گیا تو میرے ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ ''ماچس'' میں جو کچھ پنجاب میں ہوا تھا اس کا صرف تین فیصد دکھایا گیا ہے۔ البتہ فلم نے لوگوں کے دل جیت لئے ہیں۔

ہوتوتو:

اس فلم میں سیاسی انحطاط اور معاشی بے چینی کو بلاجھجک پیش کیا گیا ہے۔ کوئی خیالی کہانی نہیں ہے بلکہ برے معاشی اور سیاسی حالات کو آنکھ سے آنکھ ملا کر دیکھتی ہے۔ گلزار اس فلم میں روزمرہ واقعات کو بیان کرتے ہیں جو دورِ حاضر میں رونما ہو رہے ہیں۔ دور جدید کی سفاک سیاسی حقیقتوں کو صاف صاف پیش کر کے ان کا تاریخی اندراج کر دیا گیا ہے۔ محبت کو بھی فلم میں جگہ دی گئی ہے جو سیاسی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ متوازی انداز سے کارفرما ہے۔ فلم ''ہوتوتو'' ایک سماجی ڈرامہ ہے، جس میں ہر کردار اپنا اپنا الو سیدھا کرتا ہے اور اس عمل سے تشدد اور خونریزی کو بلاتامل دکھایا گیا ہے جو معاشرے میں رائج ہے۔

گلزار نے ٹیلی ویژن کے لئے بھی فلمیں بنائیں جن میں ''غالب'' ''کردار'' اور ''تحریر منشی پریم چند'' شامل ہیں۔

''کردار'' کی کہانیاں جو احمد ندیم قاسمی، گلزار اور ایک آدھ دیگر ادیبوں کی لکھی ہوئی ہیں ان میں انسان کی روزمرہ زندگی کے مسائل یعنی فطرت کی کارگزاریاں، دھوکہ دہی، رشوت کا لالچ اور خاندانی مسائل کو اچھی طرح پیش کیا گیا ہے۔

باقی صفحہ ۴۶ پر ملاحظہ فرمائیے

"دسمبر کی آخری رات"

ڈاکٹر ہری دیو کرشن سرے
(بھارت)

انگلینڈ میں حساب کے ایک پروفیسر تھے چارلس ڈگلس۔ ان کے دوست کی بیٹی تھی ایلس۔ انہوں نے ایک دن ایلس کو ایک کہانی سنائی۔ بعد میں انہیں محسوس ہوا کہ کہانی اچھی بن گئی ہے اس لئے اسے قلمی کتاب کی شکل میں تیار کر کے انہوں نے ایلس کو اسکی برتھ ڈے کے دن تحفہ کے طور پر دی۔ یہی کتاب "ایلس ان داونڈر لینڈ" کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی۔

اپنے خود کے بچوں یا کسی خاص دوست کے بچے کیلئے لکھے جانے والے ادب کی روایت نئی نہیں ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ کچھ لوگوں جیسے چارلس ڈگلس نے اپنے اس کام کو فرضی ناموں سے شائع کیا۔ "مارک ٹوین" بھی ایک ایسا ہی فرضی نام ہے۔ شاید یہ لوگ بچوں کیلئے بچگانہ ادب کے رائیٹر کہے جانے سے خوف زدہ تھے۔ بھارت میں بچوں کے ادب کیلئے ایسی کوئی بات نہیں ہے، ربندر ناتھ ٹھاکر، سُبرامنیم بھارتی، میتھلی شرن گپت سے لے کر بچن جی تک نامور لکھنے والوں نے بچوں کیلئے لکھ کر فخر محسوس کیا۔ گلزار نے اپنی بٹیا بوسکی کیلئے بھی ایسی ہی کتابیں لکھی ہیں۔ یوں تو گلزار نے بچوں کے لیے فلمیں بنانے میں بھی مہارت حاصل کی ہے، جس سے بچوں کیلئے ان کے دل کی گہرائی میں محبت اور دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن بوسکی کے ذریعہ سے انہوں نے مختلف عمر کے بچوں کیلئے ادب تصنیف کیا ہے۔ بچے شروع میں تُتلا کے بولتے ہیں یہ پیار کی زبان انکی اپنی ہوتی ہے۔ ماں باپ بھی ان سے اسی زبان میں باتیں کر کے آسانی سے رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ پنڈت شری دھر پاٹھک اور سُبدھرا کماری چوہان نے بچوں کیلئے لکھے ادب کو یہی طریقہ استعمال کر کے بہت بامعنی اور نتیجہ خیز بنا دیا ہے۔ گلزار نے بچوں کی توتلی زبان میں لکھتے ہوئے اور بوسکی سے باتیں کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دنیا میں وہ کب اور کیسے آئی۔ کچھ لوگ انکے لکھے اس حصے پر شک ظاہر کر سکتے ہیں کہ ایک سال کے بچے کیلئے اس کے معنی کیا ہیں۔ لیکن یہ ایک سال کے بچے کیلئے ماں باپ کی میٹھی بات چیت ہے، ایک سال کے بچے سے تو ماں باپ آپ سے آپ ہی نہ جانے کتنی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

حقیقت میں بوسکی کی یہ باتیں اسی روپ میں پیش کی گئی ہیں لیکن یہ پیشکش جب چھپ کر ان بچوں کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے جو پڑھ لکھ سکتے ہیں یا جنکی سمجھ چار پانچ سال کی عمر پا چکی ہے تو انکے دل میں اٹھنے والے سوالات کے جواب یہ کتاب دیتی ہے۔ خود بوسکی کو بھی اسے پڑھ کر اپنے کئی سوالوں کے جواب پا کر خوشی اور تسکین ملی ہوگی۔ ساتھ ہی کوئی بچہ بھی اپنے مستقبل میں ایسی دلچسپ تفصیل پڑھ کر کتنا خوش ہوگا، کتنا ہنسے گا۔

"چھب پوچھتے تھے آپ کا نام کیا ہے؟ تو ماں میگھنا میگھنا بول دیتی تھی، بچھ وہی نام لکھا دیا، لیکن آپ اچھے لیشم جیچھے ملائم ملائم لگتے تھے کہ ہم تو بوچھکی بلانے لگ گئے، بوچھکی ایک بہت مشہول کپلے کا نام ہے معلوم؟ آپ چھوٹی شی مینڈ کی تھیں تب اِچھ لئے آپ کو بھی جُکام ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹل گوکھلے انکل ہیں ناوہی آپ کا علاج کلتے تھے ہمیچھ"۔

بوسکی کے دوسرے حصے میں کچھ آسان نظمیں ہیں، ان میں بچوں کی حرکتوں اور عمر کے حساب سے انکی عادتوں کو بڑی ہنرمندی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ بچے کے ہاتھ میں جیسے ہی کوئی چیز آتی ہے اسے وہ مونہہ میں ڈال لیتا ہے پھر بوسکی بھی ایسا ہی کرے تو تعجب کی بات کیا ہے؟ جب بھی اس کو رونا ہو، لاکر کوئی کھلونا دو۔ فوراً یہ چکھ لیتی۔ ہونٹوں میں رکھ لیتی ہے۔ اس طرح بوسکی دھیرے دھیرے ایک سال پورا کر لیتی ہے لیکن ماں باپ کے محبت بھرے یہ دن کیسے بیت گئے پتہ ہی نہ چلا۔

دیکھتے دیکھتے دیکھو تو کیسا کمال کیا۔ جمع جمع کتنے دن۔ اس نے پورا سال کیا۔ لیکن بوسکی اکیلی نہیں ہے اس کے ساتھ وہ تمام بچے بھی ہیں جنہیں چھوٹے چھوٹے گیت کہانیاں اور چٹکلے سننا اچھا لگتا ہے، اسلئے کچھ مزیدار کتھائیں بھی ہیں اور گیت بھی۔

"چوپٹ نگری اندھیر راجہ" میں گلزار نے بچوں کے سامنے آج کی سماجی خرابیوں کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ حقیقت میں بچوں میں معاشرتی سوجھ بوجھ اور دانائی لانے اور انہیں مستقبل کی آگاہی اور صحیح وغلط میں تمیز کرنے والا شہری بنانے کیلئے ایسی کوششیں بہت ہی کامیاب اثر چھوڑتی ہیں۔ یہ باتیں آج انہیں انوکھی اور گدگدانے والی لگیں گی اور جب وہ بڑے ہوں گے تو یہی باتیں ایک ایسے سچ کے روپ میں انہیں یاد آئیں گی جو صحیح راہ دکھاتی ہیں۔

'بوسکی کی گنتی" اسکے دوسرے جنم دن پر دی گئی تھی۔ اسمیں دو دوسطروں کے ذریعے گنتی سکھائی گئی ہے، گنتی کو نظم میں لکھے جانے کا یہ تجربہ نیا تو نہیں ہے لیکن کہیں کہیں اچھا لگتا ہے اور کئی جگہ کھٹکتا بھی ہے، جیسے۔۔۔ لالٹین کی لمبی لو۔ بوسکی نے کہنا سیکھا نو۔ آج سبق ہے اتنا بس۔ بوسکی نے سیکھ لیا دس۔ تو اچھی نظمیں ہیں، گیتا گرنتھ قرآن حدیث۔ بوسکی پڑھتی ہے چھبیس۔ جوڑ گانٹھ گرہ یا گٹھ۔ بوسکی سیکھتی ہے اب چھیاسٹھ۔۔۔ بوجھل ہیں اور اسمیں گلزار سے کچھ نئے الفاظ کی توقع کی جاسکتی ہے۔

"بوسکی کی گپّیں" ایک ایسی عمر کے بچوں کیلئے ہیں جب ان کی اپنی زندگی میں سوچ بچار کی شروعات ہوتی ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ لیکھک بیحد سادگی اور اپنے پن سے بچوں کے دلی احساسات میں گھل مل کر باتیں کرتا ہے، چھوٹے بچوں کیلئے کہانیاں لکھنے کا یہ طریقہ بہت دلچسپ اور پُر اثر ہوتا ہے۔ اور گلزار اسمیں کامیاب ہوئے ہیں، کہانی کہنے کی نظر سے دیکھیں تو "بوسکی کا

کوّا نامہ'' گلزار کی سب سے کامیاب تحریر ہے۔ چڑیوں کیلئے بچوں کے دل میں جو پریم ہوتا ہے اسے رشتہ مان کر گلزار آگے بڑھتے ہیں۔ بوسکی زخمی کوّے کا علاج کرتی ہے۔ وہ اس کوّے کے بچے کو اسکے ماں باپ سے ملانا چاہتی ہے۔ اس طرح وہ کوّوں کے نام، انکی عادتیں اور کوّے کی کہانیوں کی جانکاری حاصل کرتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ بہت آسان زبان میں اور دلچسپ طریقے سے ان کہانیوں کی تفصیل بچے کے ذہنی معیار کے مطابق لکھی گئی ہے۔۔۔ بوسکی ''پیاسا کوّا'' کی کہانی سناتی ہے۔ اگلے دل چھت پر مٹکے میں پانی اور کچھ پتھروں کا ڈھیر رکھ کر بیٹھ جاتی ہے، وہ پتھر کیوں رکھے ہیں پانی کے پاس؟ پوچھنے پر وہ بولی۔۔۔ ''بابو جی! اسکے بچے آئیں گے پانی پینے تو ملا دوں گی۔ یہاں تو کوئی سڑک بھی نہیں بن رہی بیچارے پتھر ڈھونڈنے کہاں جائیں گے۔۔۔ کوّے کے گھونسلے کی تلاش جاری رہتی ہے، کوّے کا علاج بھی چالو رہتا ہے۔ اسے بخار ہو گیا تو بوسکی نے جٹ ڈاکٹر کو بلایا، اسکی نوکرانی نے جھوٹ بولا تو کوّے نے کاٹ لیا۔ بوسکی نے یہ بھی جانا کہ رامائن کی کہانی بھی کوّے نے ہی سنائی تھی۔ اسکا نام تھا، ''کاگ بھوشنڈ''۔۔۔ پھر آئی وہ کہانی جس میں لومڑی نے کوّے کو بہکا لیا تھا، بدلے میں اسے روٹی نہیں ٹوسٹ ملا۔۔۔ کوّے اپنے انڈے کوئل کے گھونسلے میں رکھ آتے ہیں، یہ بات بھی بوسکی نے جان لی۔ پھر جنگل کے جانوروں کی دوستی کی کہانی سنی، شاہجہاں کی کہانی سنی، بوسکی نے اپنے کوّے کا نام رکھا میرا اکبر کوّا، اور اسے چھوڑ دیا تب سے بوسکی اس کا انتظار کرتی ہے۔

بیان کی سادگی اور روانی اس کتاب کی خاص بات ہے۔ کہیں بھی بوجھل پن نہیں آنے پایا۔ لیکھک پڑھنے والے بچوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ان کے دل، ذہن اور ان کے چہروں پر ہونے والے ردِعمل کو نوٹ کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی بات کو موڑ دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسکا پڑھنے والا کہاں بے چین اور پریشان ہوگا اور کہاں اطمینان کی سانس لے گا۔ اسی لئے ''بوسکی کا کوّا نامہ'' ایک بہت ہی کامیاب تحریر ہے۔ ''بوسکی کا پنچ تنتر'' اور ''بوسکی کے برہمان'' پنچ تنتر کی کہانیوں کی کتابیں ہیں، ہماری قدیم کہانیاں دلچسپ ہونے کی وجہ سے ہزاروں سال سے چل رہی ہیں لیکن سماجی تبدیلیوں نے ان کہانیوں کے دوبارہ لکھنے کی ضرورت کو حوصلہ دیا ہے۔

یہ کہانیاں نظموں کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ گیت کتھاؤں کے ایسے تجربات ہندی میں کم ہوئے ہیں لیکن گلزار نے بڑی کامیابی سے یہ تجربہ کیا ہے۔ ساتویں کتاب ''بوسکی کے دھنوان'' بھی اسی کڑی میں ہے۔ آٹھویں کتاب ''بوسکی کے آسمان''، بچوں کے احساسات کا دھیان رکھ کر انکی نظروں سے دور اور پوشیدہ برائیوں کی بہت آسان، دلچسپ ہے اور خوشی اور دگی کے بھرپور ڈھنگ سے لکھی گئی علمی کہانی ہے۔ نویں کتاب ''بوسکی کے سونالی'' مصیبت کی ماری ایک بیچاری لڑکی کی دل کو چھو لینے والی داستان ہے۔ یہ ہنس کرستیان اینڈ رسن کی انگریزی کہانی ''دالٹل'' ''مرمیڈ'' کسی فرق کے بغیر نظم کی شکل میں کامیاب ہے۔ شروع کی کچھ سطریں ہیں۔۔۔۔

پہاڑوں پہ اس رات اتنی گری برف......اتنی گری
کہ سارا شہر برف سے ڈھک گیا
ہر اک پیڑ لگتا تھا اک سانتا کلاز
ہر اک چھت پہ روئی کی اُجلی رضائی بچھی تھی
تھا سارا شہر برف اوڑھے ہوئے
دسمبر کی وہ آخری رات تھی......

گلزار کا لکھا بچوں کا ادب، بچوں کی فطرت اور عادتوں کا آسان اور سادہ اظہار ہے۔

☆

بقیہ:
''میرا کچھ ساماں''

گلزار کی حالیہ (۲۰۰۴ء) کی ٹیلی سیریل ''گئودان'' ہندوستان کے چالیس کروڑ نادار بے بس غریبوں کے ابتر حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ حالات بدستور قائم ہیں اگرچہ جاگیرداری نظام نصف صدی سے زیادہ عرصہ پہلے ختم کر دیا گیا تھا۔ یہ کہانی منشی پریم چند کی نہایت اہم اور موثر تحریروں میں سے ہے۔

گلزار کی ''استاد امجد علی خان'' پر اور ''پنڈت بھیم سین جوشی'' پر بنائی گئی دونوں دستاویزی فلمیں ہیں۔ اگر امجد علی خان ''فرماں روائے'' سرود ہیں تو بھیم سین جوشی اپنے کلاسیکی گانے کا جادو جگاتے ہیں۔ گلزار امجد علی خان سے کرانہ گھرانے کی کلاسیکی روایت کے بارے میں کافی حد تک معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسی طرح گلزار پنڈت بھیم سین جوشی سے ان کے آبائی استاد یعنی سوامی گندھاروا اور ان کے شاگرد استاد عبدالکریم خان کے بارے میں کلاسیکی موسیقی کے کئی رموز اور روایات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ پاکستان میں اس گھرانے کی نمائندہ مرحومہ روشن آراء بیگم تھیں جن کی گائیکی مدھم اور ملائم لہجے سے عبارت تھی۔

''آئینوں کو عادت نہیں ہے''

ستیہ پال آنند

(یو۔ایس۔اے)

اردو کی ایک کم ظرفی یہ رہی ہے کہ اس نے اپنے آس پڑوس کی لسّانی اکائیوں سے بہت کم تعلق خاطر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اردو کے لکھنے والے اپنے ہی شہر کے ان اہل قلم کی تخلیقات سے نابلد ہیں جو اردو میں نہیں لکھتے۔ اب اس صورت حال کا تھوڑا بہت ادراک تو ہونے لگا ہے، لیکن اس کے تدارک کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ برصغیر کی دوسری علاقائی زبانوں کے ادب کو اردو قارئین سے متعارف کروایا جائے۔ گلزؔار کا یہ قدم قابل تحسین ہے کہ انہوں نے مراٹھی کے ایک عظیم کوی کسم اگرؔج کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور اس قدر خوبصورتی سے کیا ہے کہ ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ یہ نظمیں اردو قارئین کے لیے ایک نایاب تحفہ ہیں، اس لیے بھی کہ بیشتر اردو قارئین تو کجا، مہاراشٹر سے باہر رہنے والے اردو کے اہل قلم بھی مراٹھی کے ہم عصر لکھنے والوں کے نام سے ناواقف ہیں اور اس لیے بھی کہ اردو کی روایت پسند غزلیہ شاعری (اور کسی حد تک نظمیہ شاعری) کے لیے یہ نظمیں تازہ ہوا کے اس جھونکے کی طرح ہیں جو کمرے میں بند، حبس سے بوجھل فضا میں چپکے سے در آیا ہو۔

کسم اگرؔج کی نظمیں جمالیاتی انکشافات کی وہ نظمیں ہے جو شاعر نے اپنی شعری نبض کی رفتار سے ہم آہنگ کی ہیں۔ انہیں پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ قاری بھی اس تجربے کو محسوس کرنے کے لیے نظم کی انگلی پکڑ کر چلے جسے شاعر نے اپنی حسیّت کی سطح پر ایک تخلیقی لمحے میں اپنے شبدوں کے جال میں قید کیا تھا۔ یہ نظمیں جمالیاتی ارتعاشات aesthetic vibrations پیدا کرتی ہیں اور قاری کے دل کو تو چھوتی ہی ہیں، اس کے دماغ میں بھی بسا اوقات کھلبلی سی مچا دیتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظمیں جمالیاتی انبساط تو بخشتی ہی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہیں۔ یہ خوبی ان مختصر نظموں میں زیادہ ابھرتی ہے، جن کی تہہ داری اتنی گنجلک نہیں ہے کہ عام قاری کی گرفت میں نہ آسکے۔ ''احسان'' صرف چھ سطروں کی نظم ہے، لیکن ''گھر'' ایک ایسی علامت ہے جو بچے سے لے کر بوڑھے تک سبھی سمجھتے ہیں۔

میرے گھر کی دیواریں
تھیں بھوسے کی
آج اچانک چاروں طرف سے
میرے بدن پر گرتے گرتے
سنگ مرمر بن کے گریں
مالک
آپ کا احسان ہے!
پر بے رحم بہت ہے!!

گھر کی علامت، گھر کے بھوسے اور کیچڑ سے بنے ہونے کی علامت، گھر کے ڈھے جانے کی علامت، اور اس منہدم ہونے کی داستان کو اپنے احساس کی لوح پر ایسے محسوس کرنے کی علامت جیسے وہ دیواریں بھوسے کی نہ ہوں بلکہ ایک محل کی وزنی اور بیش قیمت سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہوں اور گھر کے مالک کے جسم پر گریں.... یہ ہے ان چھ سطروں کا کمال جن میں بارود کی طرح علامتی معانی بھر دیے گے ہیں۔ اور یہاں بھی کُسم اگرج قاری کو نہیں بخشتے، بلکہ آخری دو سطروں میں طنز کی اس چوٹ سے نظم کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں، جن میں ''مالک'' کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

دوسری خوبی جو راقم الحروف نے ان نظموں میں محسوس کی، وہ fable یا parable کا فنکارانہ استعمال ہے۔ تاریخی، دیومالائی، یا ماضی بعید میں لکھے گئے قصص سے مستعار واقعات۔۔ یہ ہے پورانک کتھا یا خود گھڑی ہوئی 'مثالی داستان' کا کمال جس کے چوکھٹے میں رکھ کر شاعر عصر حاضر کے واقعات پر ''شعری تبصرہ'' کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک نظم ''جواب'' ہے۔ ہم جانتے ہوں کہ ''سپت رشی''، یعنی سات تارے وہ سیاّرے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہماری تقدیر کے زائچے کو بنا سکتے ہیں یا بگاڑ سکتے ہیں۔ نظم مکالمانہ انداز میں لکھی گئی ہے اور اس طرح سوال در سوال اور جواب در جواب کے فارمیٹ میں گہرے معانی کے باب وا کرتی ہے۔

بیچ آسمان، سات رشی
ایک صبح میں نے پوچھا
میں اور آپ ہمیشہ ہی
تاریکی کے ماحول میں چلتے رہتے ہیں
میرا تو زمیں سے
بندھن ہے.... لیکن
آپ فلک کے رشی مُنی، لافانی ہیں!
آپ کو اس گردش کا مقصد کوئی سمجھ میں آتا ہے کیا؟

ایک رشی نے منہ پھیرا اور
مایوسی کے سُر میں بولا
مقصد سمجھ گئے ہوتے تو...
ختم ہوگئی ہوتی گردش

گردش میں ہی انت بھی ہوگا
بے مقصد اس گردش میں ہی
سارا کھیل، تمہارا میرا
پھنسا ہوا ہے!

"بے مقصد" اس نظم میں ایک کلیدی لفظ ہے۔ سات رشیوں کے لیے بھی اور ہم بیچارے انسانوں کے لیے بھی جن کی کنڈلیوں میں ان کا بیٹھنا نیک طالع یا بدطالع سمجھا گیا ہے....سبھی لایعنیت Absurdity کے مارے ہوئے ہیں۔ نہ کچھ ہم کر سکتے ہیں، نہ کچھ وہ کر سکتے ہیں۔ یہ parable جو شاعر نے گھڑی ہے، قاری کی فہم سے بالاتر نہیں ہے، کیونکہ اسے ایسی پورانک کہانیاں سننے کا تجربہ ہے۔

ایسی ہی اور کئی نظمیں جو پورانک کہانیوں یا مثالی داستانوں کے فریم ورک میں آویزاں کی گئی ہیں، کافی تعداد میں ہیں۔ "ریڑھ"، جو سرفہرست ہے، اسی قماش کی نظم ہے۔ تخلیقی قوت کی کارکردگی کا مظہر، یعنی "نظم"، بنفس نفیس، ایک آکار گرہن کیے ہوئے، جب شاعر کے سامنے آتی ہے، تو اپنی دوشیزگی اور کنوارے پن کے تقدس میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس باقرہ کی کہانی "بے داغ" میں ہے۔ آیئے، اسے دیکھیں:

جُڑے نورتن زیور
اتارے سارے انگوں سے
وہ میرے سامنے آ کر کھڑی تھی، بالاخر
بڑی باریک سی اک اوڑھنی جسم سے
لپٹی ہوئی وہ بھی اُتاری
اسے بھی دور پھینکا
بڑی حیرت سے دیکھا میں نے
کورا پاک رُوپ اس کا
اور پوچھا....
کون ہو تم؟
ذرا سی مسکرائی اور بولی
وہی....تمہاری نظم ہوں میں!

جیتے جاگتے، صرف بصری پیکر کے طور پر ہی نہیں، ہمارے سارے حواس خمسہ کو جگاتے ہوئے یہ امیج اس نظم کو ڈرامائی، مکالماتی انداز میں ایک لڑی کی طرح پرو کر پیش کرتے ہیں۔ نظم، پاک، کوری، کچی، کنواری، باکرہ.....جسے شاعر کے تخلیقی شعور سے گذر کر اپنا سنگھار کرنا ہے، اب اس کے سامنے کھڑی ہے، اور اسے جیسے چیلنج کر رہی ہے، "آؤ، مجھے خلق کرو اور دلہن بنا دو!"

فیبل fable (قدیم قصہ، کہانی، داستان) اور پیرابل parable (مثالی داستان) کی تکنیک میں کسم اگرج کی کئی نظمیں ہیں۔ سبھی کی سبھی ایک کہانی کے چوکھٹے میں رکھ کر حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتی ہیں۔ یہ تبصرہ بسا اوقات، کوئی moral اخذ کیے بغیر قاری کی فہم وفراست پر چھوڑ دیا جاتا ہے، لیکن کئی بار شاعر بذات خود بھی بولتا ہے۔ دونوں حالتوں میں نظم کے تخلیقی حسن پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا، یعنی نعرہ بازی کی نوبت نہیں آتی۔ بہر حال زمانہ حال کے قفل کو ماضی کی کلید کے توسط سے کھولنا یا ایک فرضی قصے کا تانا بانا بُن کر اس میں اپنی بات کو چھپا کر پھر کھول دینا ایک ایسا فن ہے، جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔ "کلوجس"، "حیرت"، "ساتواں"، "تہہ خانہ"، "خاموشی"، "جھگڑا"، "باورے"، "دوپہری"، "گربھ گرہ"، اور بہت سی دیگر نظمیں مثالی داستانوں کی نور بافی میں بُن دی گئی ہیں۔ ہر ایک کا اپنا ایک "ویوہ چکر" ہے، جس سے نکلنے کے لیے، یعنی پیدا ہونے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور ہر ایک اس داستان کے تانے بانے سے اپنی زندگی کا کوئی مقصد تلاش کرنا چاہتی ہے۔

کُسم اگرج ایک "آگاہ" شاعر ہیں، اور آگاہ شاعر ہونے کا مطلب ہے کہ وہ صرف اندر کی آواز پر لبیک کہہ کر ہی نظم نہیں لکھتے۔ باہر جو کچھ ہو رہا ہے، اس پر بھی کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اب المیہ یہ ہے کہ باہر کی دنیا جیسی بھی ہو، اس کا روزمرّہ کا کاروبار اتنا خوبصورت نہیں، جتنا کہ ہماری اندر کی دنیا کا ہے۔ باہر بدصورتی بھی ہے، بے حیائی بھی ہے، انسان انسان کا دشمن ہے، صرف دشمن ہی نہیں، خون کا پیاسا ہے۔ اس بدصورت دنیا کو ایک خوبصورت نظم کا چولا کیسے پہنایا جائے، یہ سوال سب باحس اور باضمیر شاعروں کے لیے تکلیف دہ ہے۔ وہ اسے بجنسہ ایک فوٹوگراف کی طرح کاغذ پر نہیں اتار سکتے۔ وہ ایک ایسا خاکہ نہیں بنا سکتے جسے دیکھ کر گھن آئے، اس سے نفرت پیدا ہو، انہیں تو اس بدصورت دنیا کی تصویر بھی اپنے فن کی غربال سے چھان کر نکالنی ہے۔ ایک علامت نگار شاعر کئی بار ترازو کے ایک پلڑے میں ایک خوبصورت امیج رکھ کر اور دوسرے پلڑے میں دوسرا بدصورت امیج رکھ کر فیصلہ اپنے قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ ایسی ہی ایک نظم "دنگوں کا دن" ہے۔ عنوان خود اپنے آپ میں ہی پوری نظم کا نچوڑ پیش کر دیتا ہے۔ لیکن نظم کو پڑھنا ضروری ہے۔

بارہ کا گھڑیال بجا
اور دل بھر کے دو ہاتھوں میں
اس نے اپنی انگلیوں سے
توے کے اوپر روٹی ڈالی
تھک ہار کے جب گھر لوٹتا ہے وہ
روٹی چاہیئے گرم اسے
اور وہ بھی اس کے ہاتھوں کی!

یعنی منظر نامہ ایک عام سے خوبصورت گھر کا تیار ہے۔ پتنی انتظار میں ہے، روٹی سینک رہی ہے، کیونکہ اسے گرم روٹی پسند ہے اور وہ بھی

اسکے ہاتھوں کی۔۔۔اور وہ اب آنے ہی والا ہے۔ یہ ایک خوبصورت، جان بخش، امرت سے لبریز منظر ہے، جو زندگی کے تئیں ہمارا عقیدہ پختہ کرتا ہے۔ لیکن نظم یہاں ختم نہیں ہوتی۔ فوراً بعد ترازو کے پلڑے میں دوسرا بدصوت منظر رکھ دیا جاتا ہے:

جلنے لگی تھی روٹی پر
گیلا ہاتھ نہ پھیر سکی
ہاتھوں سے جان
آنکھوں میں آئی
اور دہلیز پر گڑھ کے رہ گئی
ایک بلاوا آیا تھا
''ہسپتال کے مردہ گھر تک چلو، اٹھو
چل کر اس کی لاش کی پہچان کرو!''

یاد رہے، کہ عنوان ''دنگوں کا دن'' ہے۔ پتی کی موت کسی حادثے میں نہیں ہوئی، بلکہ کسی مذہبی جنونی نے دنگوں کے بھڑک اٹھنے کے بعد سڑک پر گھر لوٹتے ہوئے کامگار کی جان لے لی ہے۔ یہ دوسرا زہر بھرا ہوا منظر نامہ ہے۔ یہ نظم، کسم جی کی کئی دیگر نظموں کی طرح، ارتعاشات Vibrations چھوڑتے ہوئے ختم ہوتی ہے اور یہ کپکپی دیر تک قاری کے اعصاب پر سوار رہتی ہے۔

ایسے ہی اور روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جو بظاہر غیر اہم اور چھوٹے لگتے ہیں لیکن کچھ غور کرنے سے ان میں گہری رمز نظر آتی ہے جو آج کل کی زندگی کے کسی ایسے پہلو کو چھوتی ہے جو قاری کا جانا پہچانا ہے، اور جسے نظم میں (دیکھ کر) قاری کہہ اٹھتا ہے، ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!'' اب اسی نظم کو دیکھیں۔ ''آئینہ'' اردو شاعری کا ایک ایسا استعارہ ہے جسے ہر اردو شاعر اپنی غزلوں میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے برت چکا ہے۔ ایک مشہور اردو شاعر کا مصرع یاد آتا ہے، ''آئینہ سامنے تھا کہ آئینے سے شرماتے رہے!'' اب مطلب تو سیدھا سادہ ہے، وہ، یعنی محبوب (اردو والوں کو محبوبہ کی جنس میں تذکیر لانے کی قبیح عادت ہے!) آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور اپنے آپ کو دیکھ کر شرما رہا تھا۔ نرگسیت کا حوالہ یوں ہے کہ Narcissus نے، جو ایک یونانی نوجوان تھا اور بہت خوبصورت تھا، اپنا عکس چشمے کے ساکن پانی میں دیکھا اور خود پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ اب اس استعارے کو لے کر اردو شاعروں نے وہ دھوم مچائی ہے کہ خدا کی پناہ! خیر، کسم اگرج کی نظم کو دیکھیں۔ وہی جانا پہچانا چھوٹے سے گھر کا ماحول ہے، جس میں ایک دیوار پر آئینہ ٹنگا ہوا ہے، اور ''وہ'' یعنی کہ (محبوبہ؟ بیاہتا استری؟ پڑوس کی لڑکی؟) اس کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں میں پھول ٹانک رہی ہے۔ اس ہمہ جہتی multi - dimensional استعارے میں ''وہ'' یعنی بالوں میں پھول ٹانکنے والی نہیں شرماتی، آئینے کو ہی کوئی عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔

آئینوں کو عادت نہیں ہے
جو روپ دیکھیں، وہ پاس رکھ لیں
مگر یہ آئینہ.....کچھ الگ ہے!
لگا رہی تھی وہ پھول بالوں میں
اور جھانکا تھا اس میں، اس نے
انوکھے اس آئینے میں، تب سے
مقررہ وقت پر، ہمیشہ
یہ فریم بھر کے
نمایاں ہو جاتا ہے وہ چہرہ!

اس سادہ اور سلیس نظم میں کیا چھپا ہوا ہے جو باہری سطح پر نظر نہیں آتا، لیکن ذرا اندر جھانکیں تو ہیرے کی طرح جگمگا رہا ہے؟ یہ ہے وہ استعارہ جو آئینے کو صرف آئینہ نہیں سمجھتا بلکہ دیکھنے والے (شاعر یا اس کے واحد متکلم) کی آنکھ سمجھتا ہے جس میں ہمیشہ کے لیے بالوں میں پھول ٹانکنے کا نظارہ محفوظ ہو گیا ہے۔ ایک ہی لفظ ''انوکھے آئینے'' پر غور کریں تو بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔

یہ کمال بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے کہ کم سے کم لفظوں میں بہت بڑی بات کہہ دیں۔ کسم اگرج کے پاس یہ جادو ہے۔ ''قلعہ'' ایک ایسی ہی نظم ہے۔ ایک بے ہودہ، بے معنی، ماضی کا استعارہ جو ہر وقت سویا رہتا ہے، جاگتا صرف اس وقت ہے، جب کچھ سیاح آتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سیاحی ایک شوقیہ شغل ہے، تاریخ دانی نہیں ہے۔ sight seeing ہے اور ٹورسٹ Tourist تو کسی پرانے قلعے میں مافوق الفطرت باتوں، بھوت پریت کے قصوں سے دل بہلانے کی خاطر ہی آتے ہیں۔ یہ قلعہ، ماضی کا 'سمبل' جاگتا ہے تو یہ قصے سنانے کے لیے یا ان پکوانوں کی خوشبو سونگھنے کے لیے جو ٹورسٹ اپنے تھیلوں میں بھر کر لاتے ہیں۔ جونہی وہ چلے جاتے ہیں، وہ پھر سو جاتا ہے۔

۔۔۔لیکن کچھ نظموں میں ایک قسم کی 'انقلابی' لہر بھی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، جو نعرے بازی نہیں ہے، لیکن جسے پہچاننا مشکل بھی نہیں ہے۔ سادہ سی، سلیس سی، آسانی سے سمجھ آ سکنے والی کہانی، لیکن ختم ہوتے ہوتے یہ کہانی بہت سے سوالیہ نشان چھوڑ جاتی ہے، جو اپنی بڑی بڑی، لال انگارہ، غصیلی آنکھوں سے قاری کو گھورتے ہیں۔ ''ہامی'' ایک ایسی ہی نظم ہے، جس میں لہولہان ہوئی ''وہ'' یعنی بظاہر ایک عورت، (لیکن بباطن شاعر یا اسکے متکلم کی انا، عزت، باغی اور سرکش جذبہ، ظلم نہ سہنے کا ارادہ؟) اس کے پاس آتی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے۔

لہو سے لتھ پتھ سامنے آ کر کھڑی ہوئیں
اور بولیں تم
''مجھے نہیں جینا اب!''
میں نے کہا تھا،
جینا پڑے گا،

''چہارسُو''

وہ بھی میرے ساتھ تجھے
جنہوں نے تجھ کو چھلنی کیا ہے
ان کے لیے.....اسلحہ خانے میں
وہ خنجر اور تلواریں ہیں،
جنہیں کڑکتی بجلیوں پر دھار لگی ہے
پلّو سے چہرے پر بہتی لہو کی دھاریں
پونچھیں تم نے، اور کہا
''تو چلو.....!''

اس نظم کی تہہ داری صرف ''تم'' یعنی پلّو سے اپنے چہرے پر لہو کی دھاریں پونچھتی ہوئی عورت کی identity ہے۔ ایک بار قاری اگر اس کا راز سمجھ لے تو نظم شیشے کی طرح چمکتی ہوئی اپنے معانی کے موتی اپنے دامن سے انڈیل دیتی ہے۔ خودکشی تو کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس ظلم کا جو مظلوم کے چہرے پر لہو کے دھارے چھوڑ گیا ہے۔ اور اگر مظلوم یہ طے کرتا ہے کہ اسے خودکشی کرنی ہے تو شاعر یا شاعر کے واحد متکلم کا کیا فرض ہے؟ یہی جو اس نظم میں ہے۔ ''جینا پڑے گا، وہ بھی میرے ساتھ تجھے!'' اور تب مظلوم کا حوصلہ بندھتا ہے، اور وہ کہتی ہے، ''تو چلو!''

ایک سو نظمیں.... مختصر، کچھ مختصر تریں اور کچھ تھوڑی سی طوالت کی حامل۔۔۔ یہ ہے اس شعری مجموعے کی ظاہری شکل و صورت، لیکن ان نظموں کے اندر اردو قاری کے لیے بہت کچھ ہے۔ اردو قاری کے دسترخوان پر سجی ہوئی شیرینی، اب تک تو غزل کی نازک خیالی، استعارہ در استعارہ ایسی ملفوفیت اور مدوریت رہی ہے جس کا کچھ مطلب ڈیڑھ سو برس پہلے تک تو تھا، لیکن اندھا دھند استعمال سے وہ اپنا تصویری مفہوم تو کیا، لغوی مفہوم بھی کھو چکی ہے۔ اگر ایسی نظمیں اردو کے قاری تک پہنچیں گی تو اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ اسے پتہ چلے گا کہ اردو کے آس پڑوس میں پننپنے والی دوسری ہندوستانی زبانوں میں کیسا شعری ادب تخلیق ہو رہا ہے، اور دوسرا یہ کہ سادہ، جانی پہچانی، روزمرّہ کی زندگی سے اپنی inspiration پا کر بھی خوبصورت نظمیں خلق ہو سکتی ہے، اس کے لیے شاعر کو کلاسیکی فارسی اور اردو شعراء کا تتبع نہیں کرنا پڑتا۔ کسم اگرج صاحب! آپ کا اردو کی اس محفل میں سواگت ہے، اور گلزار جی کا بہت شکریہ کہ وہ آپ کو بڑی سج دھج، سجاؤ اور سلیقے کے ساتھ اس محفل میں لے کر آئے!

''خوشبو جیسے لوگ''

آج کے گلا کاٹ مسابقتی دور میں جب ہر شخص کہیں نہ کہیں پہنچنے کے لیے کسی پاگل دوڑ میں مبتلا ہے اور جہاں بے ڈھنگ اونچائیاں اور یادوں سے چپکے رہنا وغیرہ عام گھریلو باتیں ہوگئی ہیں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ گلزار صاحب جیسے شریف اور خلیق شخص سے ملاقات ہو جائے۔

گلزار صاحب سے ہمارا سلسلہ 1994ء میں شروع ہوا جب ہم ان کی اولین کتاب ''پکھراج'' شائع کر رہے تھے جسے زبردست کامیابی ملی۔ اس کتاب نے جاری ہوتے ہی (لوگوں میں) کافی اشتیاق جگایا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

ان برسوں میں ایک سے دوسری کتاب تک آتے آتے ہمارا رابطہ بڑھتا گیا۔ اُن کے اس (کتابی) سفر کے دوران ان کی ہر کتاب سے ہمارا تعلق صاف ظاہر ہوتا رہا ہے۔ جس فکر اور جذبے سے وہ ہر کتاب کی پرورش کرتے رہے وہ قابل قدر تھا۔ گلزار صاحب کو اپنے مصنفوں کی فہرست میں شامل پا کر ہمیں ہمیشہ بڑا فخر ہوا ہے۔ گرچہ سبھی مصنف خاص ہوتے ہیں، کچھ البتہ زیادہ خاص ہوتے ہیں۔ اور گلزار صاحب ان میں سے ایک ہیں۔ ان کا انکسار، انکی لگن، گیتوں میں ان کا چلتا جادو خاصا مشہور ہے لیکن ہمارے لیے ان کی تحریر بے مثال رہی اور ہمیشہ رہے گی۔

آر۔ کے۔ مہرہ
(روپا اینڈ سنز، دہلی)

''فنا کا منظر''

(جناب گلزار کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب)

اقبال بھٹی

(برمنگھم، یوکے)

○

آ گ میں لپٹا ہوا ہے، آرزُو کا ایک چہر، اللہ ھُو
رات کا کالا سمندر، روشنی کا اک جزیرہ، اللہ ھُو

بار بار اُس آنکھ میں ساون اُمڑتے دیکھا، پر برسا نہیں
جھیل کی تہ میں اُبلتا، موتیوں کا ایک ذخیرہ، اللہ ھُو

اُس کے لب اور اُس کا لہجہ، اور ہمارے رُوبرو بیٹھا ہُوا
رات بھر بہتا رہا، مہکی ہوئی باتوں کا شیرہ، اللہ ھُو

اک اداسی اور دل کی ہلکی ہلکی روشنی، چھنتی ہوئی
چشمِ نم نے پلکوں پہ پہنا ہوا تھا، ایک ہیرا، اللہ ھُو

چاندنی میں اُس کے رُخساروں پہ دیکھے تھے بھنور بہتے ہوئے
ہم نے دریا پر اُٹھا کے رکھ دیا ہے اپنا ڈیرہ، اللہ ھُو

...... ☆ ......

○

تنکا تنکا کانٹے توڑے، ساری رات کٹائی کی
کیوں اتنی لمبی ہوتی ہے، چاندنی رات جدائی کی

نیند میں کوئی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے
کال کنوئیں میں گونجتی ہے، آواز کسی سودائی کی

سینے میں دل کی آہٹ، جیسے کوئی جاسوس چلے
ہر سائے کا پیچھا کرنا عادت ہے ہرجائی کی

آنکھوں اور کانوں میں کچھ سناٹے سے بھر جاتے ہیں
کیا تم نے اُڑتی دیکھی ہے، ریت کبھی تنہائی کی

تاروں کی روشن فصلیں اور چاند کی ایک درانتی تھی
ساہُو نے گروی رکھ لی تھی میری رات کٹائی کی

☆

○

ذکر آئے تو مرے لب سے دعائیں نکلیں
شمع جلتی ہے تو لازم ہے شعائیں نکلیں

وقت کی ضرب سے کٹ جاتے ہیں سب کے سینے
چاند کا چھلکا اُتر جائے تو قاشیں نکلیں

دفن ہو جائیں کہ زرخیز زمیں لگتی ہے
کل اِسی مٹی سے شاید مری شاخیں نکلیں

چند اُمیدیں نچوڑی تھیں تو آہیں ٹپکیں
دل کو پگھلائیں تو ہو سکتا ہے سانسیں نکلیں

غار کے منہ پہ رکھا رہنے دو سنگِ خورشید
غار میں ہاتھ نہ ڈالو کہیں راتیں نکلیں

☆

○

آنکھوں میں جل رہا ہے پہ بُجھتا نہیں دُھواں　　اُٹھتا تو ہے گھٹا سا' برستا نہیں دھواں
پلکوں کے ڈھانپنے سے بھی رُکتا نہیں دُھواں　　کتنی انڈیلیں آنکھیں پہ بجھتا نہیں دُھواں
آنکھوں سے آنسوؤں کے مراسم پرانے ہیں　　مہماں یہ گھر میں آئیں تو چبھتا نہیں دُھواں
چولھے نہیں جلائے کہ بستی ہی جل گئی　　کچھ روز ہو گئے ہیں اب اٹھتا نہیں دُھواں
آنکھوں کے پونچھنے سے لگا آگ کا پتہ　　یُوں چہرہ پھیر لینے سے چھُپتا نہیں دُھواں

...... ☆ ......

○

ایک پرواز دکھائی دی ہے
تیری آواز سُنائی دی ہے
صرف اک صفحہ پلٹ کر اس نے
ساری باتوں کی صفائی دی ہے
پھر وہیں لوٹ کے جانا ہوگا
یار نے کیسی رہائی دی ہے
جس کی آنکھوں میں کٹی تھیں صدیاں
اس نے صدیوں کی جدائی دی ہے
زندگی پر بھی کوئی زور نہیں
دل نے ہر چیز پرائی دی ہے
آگ میں کیا کیا جلا ہے شب بھر
کتنی خوش رنگ دکھائی دی ہے

☆

○

خوشبو جیسے لوگ ملے افسانے میں
ایک پرانا خط کھولا انجانے میں
جانے کس کا ذکر ہے اس افسانے میں
درد مزے لیتا ہے جو دوہرانے میں
شام کے سائے بالشتوں سے ناپے ہیں
چاند نے کتنی دیر لگا دی آنے میں
رات گُزرتے شاید تھوڑا وقت لگے
دھوپ انڈیلو تھوڑی سی پیمانے میں
دل پر دستک دینے کون آ نکلا ہے
کس کی آہٹ سُنتا ہوں ویرانے میں
ہم اس موڑ سے اُٹھ کر اگلے موڑ چلے
اُن کو شاید عمر لگے گی آنے میں

☆

''چہارسُو''

O

گرم لاشیں گریں فصیلوں سے　آسماں بھر گیا ہے چیلوں سے
سولی چڑھنے لگی ہے خاموشی　لوگ آئے ہیں سن کے میلوں سے
کان میں ایسے اتری سرگوشی　برف پھسلی ہو جیسے ٹیلوں سے
گونج کر ایسے لوٹتی ہے صدا　کوئی پوچھے ہزاروں میلوں سے
پیاس بھرتی رہی مرے اندر　آنکھ ہٹتی نہیں تھی جھیلوں سے
لوگ کندھے بدل بدل کے چلے　گھاٹ پہنچے بڑے وسیلوں سے

...... ☆ ......

O

پھولوں کی طرح لب کھول کبھی
خوشبو کی زباں میں بول کبھی
الفاظ پرکھتا رہتا ہے
آواز ہماری تول کبھی
انمول نہیں لیکن پھر بھی
پوچھو تو مفت کا مول کبھی
کھڑکی میں کٹی ہیں سب راتیں
کچھ چورس تھیں، کچھ گول کبھی
یہ دل بھی دوست زمیں کی طرح
یہ جاتا ہے ڈانوا ڈول کبھی

☆

O

کہیں تو گرد اُڑے یا کہیں غبار دِکھے
کہیں سے آتا ہوا کوئی شہسوار دِکھے
خفا تھی شاخ سے شاید کہ جب ہوا گزری
زمیں پہ گرتے ہوئے پھول بے شمار دِکھے
رواں ہیں پھر بھی رُکے ہیں وہیں پہ صدیوں سے
بڑے اداس لگے جب بھی آبشار دِکھے
کبھی تو چونک کے دیکھے کوئی ہماری طرف
کسی کی آنکھ میں ہم کو بھی انتظار دِکھے
کوئی طلسمی صفت تھی جو اس ہجوم میں وہ
ہوئے جو آنکھ سے اوجھل تو بار بار دِکھے

☆

''چہارسُو''

○

دکھائی دیتے ہیں، دُور تک اب بھی سائے کوئی — مگر بُلانے سے وقت لوٹے نہ آئے کوئی
چلو نہ پھر سے بچھائیں دریاں، بجائیں ڈھولک — لگا کے مہندی، سُریلے ٹپّے سُنائے کوئی
پتنگ اُڑائیں، چھتوں پہ چڑھ کے، محلّوں والے — فلک تو سانجھا ہے، اُس میں پیچے لڑائے کوئی
اُٹھو کبڈی کبڈی کھیلیں گے، سرحدوں پر — جو آئے اب کے، تو لوٹ کر پھر نہ جائے کوئی
ضعیف برگد کے ہاتھ میں رعشہ آ گیا ہے — جٹائیں آنکھوں پر ،گر رہی ہیں، اُٹھائے کوئی

...... ☆ ......

○

رُکے رُکے سے قدم رُک کے بار بار چلے
قرار لے کے ترے در سے بیقرار چلے
اُٹھائے پھرتے تھے احسان جسم کا جاں پر
چلے جہاں سے تو یہ پیرہن اُتار چلے
نہ جانے کون سی مٹّی وطن کی مٹّی تھی
نظر میں دھول، جگر میں لیے غبار چلے
سحر نہ آئی کئی بار نیند سے جاگے
تھی رات، رات کی یہ زندگی گزار چلے
ملی ہے شمع سے یہ رسمِ عاشقی ہم کو
گناہ ہاتھ پہ لے کر گناہ گار چلے

☆

○

ایسا خاموش تو منظر نہ فنا کا ہوتا
میری تصویر بھی گرتی تو چھنا کا ہوتا
یوں بھی اک بار تو ہوتا کہ سمندر بجتا
کوئی احساس تو دریا کی اَنا کا ہوتا
سانس موسم کی بھی کچھ دیر کو چلنے لگتی
کوئی جھونکا تری پلکوں کی ہَوا کا ہوتا
کانچ کے پار ترے ہاتھ نظر آتے ہیں
کاش خوشبو کی طرح رنگ حِنا کا ہوتا
کیوں مری شکل پہن لیتا ہے چُھپنے کیلئے
ایک چہرہ، کوئی اپنا بھی خدا کا ہوتا

☆

تلاش۔۔۔

گلزار

پُورا سوٹ کیس کھلوایا دہلی ائیر پورٹ پر۔ کپڑے اُوپر نیچے کر کے دیکھنا تو سمجھ میں آ جاتا ہے۔ لیکن مردسپاہی جب ''براز'' اُٹھا کر جھاڑتے تھے اور واپس رکھتے تھے تو بدن میں ایک سنسنی دوڑ جاتی تھی۔ ''براز'' کے اندر چھپا کر کون سے گرینیڈس (grandes) لے جاتی میں! تین چار لپ سٹک اُٹھا کر جب غور سے دیکھنے لگے تو میں نے کہا!

''یہ بُلیٹ (bullet) نہیں ہیں۔ لپ سٹک ہیں۔ رکھ لیجیے۔ رائفل میں چلتی ہوں تو چلا لیجیے گا۔''

بے شرم، بڑے پیلے دانت نکال کر بولا۔ ''دونالی کے زمانے گئے میم صاحب، اب تو سَو سَو کے کارتُوس آتے ہیں۔''

اُس کی ساتھی لیڈی پولیس کو شاید میرا لہجہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ بولی ''سرینگر کی فلائٹ میں کچھ زیادہ احتیاط کرنی پڑتی ہے میڈم۔ آیئے۔ اِدھر آ جایئے'' اور باڈی سرچ کے لیے وہ پردے لگے آدھ کھلے بوکس میں لے گئی۔

میں کشمیر جا رہی تھی۔ اپنے رُوٹس تلاش کرنے۔ اپنی جڑیں! حالانکہ میں کشمیری نہیں ہُوں۔

اتنا پتہ تھا مجھے کہ میرے ماں باپ شادی کے بعد ہنی مُون کے لیے کشمیر گئے۔ اور جب لوٹے تو میں ''کنسیو'' (Conceive) ہو چکی تھی۔ میرا جنم۔۔۔ شروع ہو چکا تھا۔

''جہلم کے برفاب پانی میں تیرتے ہوئے ایک بوٹ ہاؤس میں، اخروٹ کی لکڑی کے منقّش پلنگ پر، جب دو مقدس رُوحیں ایک مقدّس لمحے کو جنم دے رہی تھیں۔۔۔۔''

ماں بڑے مزے لے کر، بڑے شاعرانہ انداز میں اپنی ڈائری سے مجھے کشمیر کی داستانیں سُنایا کرتی تھیں۔ کشمیر میں اپنی اور پاپا کی کہانیاں! کہتیں۔

''گھوڑے پر چڑھنا تو آتا نہیں تھا۔ ٹیبل لگا کر، گھوڑے کو پاس لا کر کھڑا کر دیا جاتا۔ پاپا پہلے ٹیبل پر چڑھتے، سائیس گھوڑے کو دھکیل کے ٹیبل کے ساتھ لگا دیتا، اور پاپا گھوڑے پر سوار ہو جاتے۔۔۔ پھر بھی دس میں پانچ بار گر ہی جاتے تھے۔۔۔''

چہرے سے اخبار ہٹا کر، پاپا ٹوک دیتے۔ ''جھوٹ مت بولو۔ صرف ایک ہی بار گرا تھا۔''

''اور وہ جو آپ کی پتلون شریف پھٹ گئی تھی۔۔۔'' ماں لکھؤ سے تھیں اور پاپا کولکا تا سے۔

''وہ تو ٹیبل گر گیا تھا۔ میں تھوڑا ہی گرا۔''

''اور جو سائیس کے اُوپر چڑھ گئے تھے؟''

''گھوڑا ہی بھاگ گیا۔ میں کیا کرتا؟۔۔۔ اچھا اب چوپ کرو۔ جب شونالی کو لے کر جاؤں تو دکھاؤں گا اُس کو۔''

ماں ایک لمبی سانس لے کر چُپ ہو جاتی۔

''اب کیا جاؤ گے کشمیر؟ وہی دن تھے، جو ہر سال چلے جاتے تھے۔ اب تو گولیاں چھوٹتی ہیں۔ اب کلیاں نہیں پھوٹتیں، وہاں سر پھوٹتے ہیں دن رات۔۔۔''

یہ اکیاسی بیاسی کی بات ہے۔ یا بیاسی تراسی کی ہوگی، جب میں سکول میں پڑھ رہی تھی۔ خبریں سُنتی تو مجھے غصّہ آتا۔ یہ پاکستانی ہوتے کون ہیں میرا کشمیر ہتیانے والے۔ کشمیر جیسے میری کوئی پرسنل ملکیت تھی۔

پھر کسی دن ماں بتاتیں:

''ہمارا ایک کشمیری نوکر تھا۔ لڑکا سا ہی تھا۔ ہم جب بھی جاتے، اُسے رکھ لیا کرتے تھے۔ ایک مہینے کے لیے۔ وزیرا نام تھا۔ وزیر علی۔ کبھی بوٹ ہاؤس میں رُکتے تھے تو کبھی او بروئے ہوٹل میں۔ او بروئے میں ہمیشہ اُس کی ''انیکسی'' میں ہی ٹھہرتے تھے۔ جہاں سامنے کے لان میں دو چنار تھے۔ بڑے اونچے، تندرست، بھرے ہوئے، بلند قد کے۔ مجھے ہمیشہ بادشاہ اور بیگم لگتے تھے۔ ہاتھ سینے پر باندھے، ڈل لیک کا نظارہ کرتے تھے، اور ہم سب خادموں کی طرح لان میں پڑے رہتے تھے۔ دونوں بڑے خودّدار تھے۔ ایک جہانگیر، ایک نُور جہاں!''

ماں سچ مچ شاعر ہی تھیں۔ مگر صرف ڈائری لکھا کرتی تھیں۔ میں نے یاد دلایا: ''آپ وزیرا کا کچھ بتانے لگی تھیں۔''

ہاں تو شام کے وقت وہ تمہیں گھمانے لے جایا کرتا تھا۔ پرام میں بٹھا کے۔ ایک روز بہت دیر ہوگئی، تو ہمیں فکر لگ گئی۔ یہ تمہیں ڈھونڈنے نکلے۔''

''یہ کون۔۔۔؟''

''تمہارے پاپا۔ ارُون بیز جی! اُنہیں بھی بہت دیر لگ گئی۔ اور جب لوٹے تو ایک ٹیکسی میں، تم تھیں، پرام تھی، وہ تھے، مطلب تمہارے پاپا اور ایک دوسرا ہی کوئی کشمیری تھا۔ وزیرا نہیں تھا۔ میں نے پوچھا: وزیرا کہاں ہے تو منہ سُو جا ہوا تھا۔ تمہیں میری گود میں ڈالا، پرام اٹھا کر برآمد میں پھینکی اور ساتھ آئے اُس کشمیری کو آواز دی۔۔۔ ''مورتی لال'' نکال کے پچاس روپے دیئے اُسے۔ بہت بڑ بولا تھا وہ۔ کہنے لگا۔

''صاحب اتنی سی بچّی کو آپ نے کیسے اُس کے حوالے کر دیا۔ گھر نہ جاتا، کہیں اور لے کے بھاگ جاتا تو۔۔۔'' اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے دفع ہونے کے لیے کہا، اور وہ چُپ چاپ چلا گیا۔

''میری قیمت کُل پچاس روپے؟'' میں نے ایویں ہی بیچ میں پوچھ لیا۔

''پچاس بھی، بہت ہوتے تھے اُس زمانے میں۔''

مجھے اپنی فکر تھی کہ مجھے کہاں لے گیا تھا وہ۔۔۔

''تمہیں اپنے گھر لے گیا تھا۔ اپنی نانی کو ملانے۔ یتیم تھا۔ ماں باپ ایک برفانی ''ایوالانچ'' میں دب کے مر گئے تھے۔ اور لاش بھی نہیں ملی تھی۔ وزیرے کو ہوٹل میں کئی کئی دن نائٹ ڈیوٹی کرنی پڑتی تھی، اس لئے نانی جب کوستی کہہ دیتا کہ اُس نے شادی کر رکھی ہے اور اُس سے ایک بچی بھی ہے۔ اور نانی کے گرم مزاج کی وجہ سے اُسے گھر نہیں لاتا۔''

من ہی من مجھے وزیرا بہت اچھا لگا۔ کہانیوں کے ہیرو جیسا۔ اور اُس کی کہانی بھی ایک پَری کی کہانی جیسی لگی۔ اب بھی لگتا ہے۔ پَری کی کہانیاں سب کشمیر ہی میں پیدا ہوتی ہوں گی اور جب برف پڑتی ہے تو نیچے اُتر آتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر وہ سچ مچ ہی مجھے لے کر بھاگ گیا ہوتا تو میں کشمیر میں پلی ہوتی۔ لیکن کہانی میں ماں باپ سے بچھڑنا مجھے پسند نہیں آیا۔۔۔

میں نے پوچھا۔

''وزیرا، پھر نہیں آیا؟''

''آیا۔ بہت معافیاں مانگیں۔ ہم نے پھر رکھ لیا۔ لیکن پھر اُس کے ساتھ گھُومنے کبھی نہیں بھیجا۔''

گھر میں ایک البم بھی تھی۔ پُرانی تصویروں کی۔ وزیرا اُن میں کہیں نہیں تھا۔ لیکن گلمرگ، یُوزمرگ، پہلگام، چندن واڑی میں کھینچی ہوئی میری بچپن کی تصویریں، مجھے کسی پری کہانی کی السٹریشن (illustration) لگتی تھیں۔

کالج میں تھی، جب ماں سے پوچھا تھا میں نے۔

''میں کشمیر دیکھ کر آؤں اِن چھٹیوں میں؟''

''خبریں نہیں پڑھتی؟ دیکھتی نہیں ٹی وی پر۔ کیا قہر مچا رکھا ہے کشمیریوں نے؟''

میں کالج ہی میں تھی۔ کوئی کرکٹ میچ تھا اور کشمیری نوجوان لڑکے ہندوستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ بہت سے سِکھ بھی شامل تھے اُن میں۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا اُن دِنوں میں۔ ٹیررسٹ ایک منسٹر کی لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے۔ میں کہنے ہی والی تھی کہ ''نانی کو دِکھانے لے گئے ہوں گے۔'' مگر پاپا کا غصّہ دیکھ کر چپ ہو گئی۔ پاپا کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ اچانک مڑ کے گرجے۔۔۔ ''سمجھوتے کئے جا رہے ہیں۔ پکڑے ہوئے ٹیررسٹوں کو چھوڑا جا رہا ہے! کسی عام شہری کی بیٹی ہوتی تو کیا ہوتا؟ کسی کے کان پر جُوں بھی نہ رینگتی۔ بیان ہوتے۔ ڈسٹربڈ (disturbed) وقتوں میں ہوتا ہے یہ سب! تقسیم کے دنوں میں کیا نہیں ہوا تھا؟''

ماں نے پوچھا ''تو پاکستان کے ساتھ کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔ وہی تو یہ سب کروا رہا ہے۔''

پہلی بار پاپا کے منہ سے سُنا۔ ''اپنے لوگ بھی کم نہیں ہیں۔ حکومت (طاقت) میں رہنے کے لئے، دونوں ہی بیچاری بھیڑوں کی کھال اُتارتے رہتے ہیں۔''

مجھے بُرا لگا۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے کشمیر بہت اپنا لگتا تھا۔ نہ پاپا وہاں سے تھے نہ ماں۔ پھر بھی۔۔۔!

اُنہیں دنوں پاپا کے آفس میں ایک روز دیکھا، ایک خوبصورت کشمیری نوجوان نوکری مانگنے کے لیے آیا تھا۔ پاپا نے پوچھا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

بیچارا بڑی دبی سی آواز میں بولا: ''کشمیر سے، کشمیری ہوں سر۔ لیکن دنگئی نہیں ہوں۔ ٹیررسٹ نہیں ہوں میں!''

پاپا نے بڑی نرمی سے ٹال دیا۔ ''اس وقت تو کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر کبھی پتہ کر لینا۔''

میں جانتی تھی وہ جھوٹ ہے۔ پاپا کسی انکوائری کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ اُن دنوں باقی ملک میں اُترے اور بسے ہوئے کشمیریوں پر پولیس کڑی نظر رکھتی تھی۔ کشمیری ہی نہیں، مسلمانوں کا نام سُن کر ہی لوگ مکان، جگہ دینے سے انکار کر دیتے تھے۔

ایک بار پاپا ہسپتال میں تھے۔ اُنہیں دیکھنے گئی تھی۔ وہیں ہمارے ڈاکٹر باسو نے بات چھیڑ دی۔ اور میرے رشتے کی بات نکل آئی۔ میری پڑھائی آخری درجوں پر تھی۔ میں نے ہندوستان ٹائمز میں رپورٹر کی نوکری کر لی تھی۔ ماں نے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔

''کر لوں گی، اگر وہ ہنی مون کے لیے کشمیر لے جائے تو!''

''کشمیر اب۔۔۔'' پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے کہا بھُول جاؤ۔

اس سے زیادہ وہ بول نہیں پائے۔ اُنہیں بولنا منع بھی تھا۔ میں نے ماں سے کہا۔ ''تمہیں نے تو کہا تھا کہ میرا جنم وہیں شروع ہوا تھا''۔ پاپا نے ہوا میں ہاتھ لہرایا اور چلے گئے۔ ہمیشہ کے لیے!!

اب اتنے برسوں بعد اپنے روٹس کو تلاش کرنے جا رہی تھی۔ دِل سینے میں ربڑ کی گیند کی طرح اُچھل رہا تھا، جب پلین سرینگر کے ایئر پورٹ پر اُترا۔ ایئر پورٹ سے باہر آتے ہی جو دیکھا وہ ہندوستان میں اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔

پہلا خیال یہ آیا، کیا جنگ شروع ہو چکی ہے۔ کیا پاکستان نے حملہ کر دیا؟ سرینگر کی سڑکوں پر، کشمیری کم، ہندوستانی فوج زیادہ نظر آ رہی تھی۔ ٹینک، ٹرک، بندوقیں، چیک پوسٹ ہر سڑک پر بنکر، ہر گلی کے موڑ پر پہرہ!

جس بس میں نکلے، سرینگر پہنچتے پہنچتے تین جگہ رُکی۔ تین بار رائفلیں تانے فوجی اندر آئے۔ اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا۔ سامان ٹٹولا۔

''یہ کس کا ہے؟''

''اس میں کیا ہے؟''

اور پھر اُتر گئے۔ بس آگے چل دی۔

اتنی سی دیر میں میری سانس گھٹنے لگی تھی۔ تیسری بار جب بس رُکی تو ایک سپاہی نے جاتے جاتے مجھے ریپ کرتی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

''تُو کہاں جارہی ہے؟''

مجھے تُو کا خطاب اچھا نہیں لگا۔ میں نے دھماکے سے پوچھا۔

''وہاٹ ڈو یُو مین؟ بائے وہیئر ایم آئی گوئنگ؟''

اُس نے ایک لمبی سی ''ہوں'' کی اور مُڑ کے نیچے اُتر گیا۔ مجھے لگا انگریزی نہیں جانتا تھا۔ لیکن بس میں کوئی کُسکا نہیں۔

رہنے کے لیے مجھے ایک نارمل سی ''لوجنگ'' کی ضرورت تھی۔ چاہتی تھی ڈل کے پاس ہی کوئی جگہ مل جائے۔ پیسے ہوتے تو اوبروئے کی انیکسی میں جا کے رہتی۔

جھیل ڈل پر کائی کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں اور سبزہ اُوپر تک آ کے سڑ رہا تھا۔ چند ہاؤس بوٹ تھیں۔ ایک کنارے پر مجرموں کی طرح سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ اُجڑی ہوئی، خستہ، شاید گلتے گلتے وہیں پانی میں دفن ہو جائیں گی۔

بار بار میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ بار بار میں چڑ کے پونچھ رہی تھی۔ اور کوس رہی تھی خود کو۔ کس کشمیر کی بات کر رہی تھی؟ کہاں ہے تیرا اخروٹ کی لکڑی کا منقش پلنگ جہاں۔۔۔ میرا اگلا مستقل طور پر رُندھ گیا۔ اُس کے بعد میں نے اپنی نارمل آواز نہیں سُنی۔۔۔!

ایک لڑکی کو کوئی لوجنگ ہاؤس یا ہوٹل میں رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ نہ میری انگریزی کام آئی۔ نہ پرس میں پڑا ہندوستان ٹائمنز کا آئی ڈینٹی کارڈ۔ پولیس یا ملٹری کی مدد لینا اور بھی نامناسب لگتا تھا۔ اُن کے ساتھ جُڑتے ہی لوگوں کی آنکھیں فوراً بیگانی ہو جاتی تھیں۔

خلیل نے پھر اپنی آٹو میں سامان رکھتے ہوئے کہا مجھ سے!

''آپ اکیلی ایں میم ساب، کوئی نئیں رکّے گا۔ کشمیری بوت ڈرتے ایں اندوستانی فوجیوں سے۔ کسی کو بھی پکڑ کے لے جاتے ایں اور پھر۔۔۔'' اُس نے وقفہ لیا۔ ''۔۔۔وہ آدمی کبھی واپس نئیں آتا۔ پتہ نئیں کس جیل میں گُم ہو جاتے اے۔'' اس کے اندر کا غصّہ آٹو کی غوں غوں پر اُتر رہا تھا۔ پتہ نہیں اب کہاں لے جا رہا تھا۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ شاید اپنے اندر کا ڈیزل جلا رہا تھا۔ ''کوئی آپ کو اوٹل میں نئیں رکّے گا۔ فوج کو چھاپہ مارنے کا باہانہ مل جائے گا۔ پکڑ لے جائے گا اوٹل والے کو۔ مالک بُوڑا ہوگا تو اُس کو نئیں لے جائے گا۔ اُس کا جوان بیٹا ہوگا، داماد ہوگا، بانجا، بتیجا (بھانجہ، بھتیجا) کوئی بی۔ اُن کی نظر کشمیری کے جوانوں پر اے۔ سب ختم کرتے جاتے ایں۔۔۔'' اُس کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک ایک گلی میں اُس نے اپنا آٹو روک دیا، اور مُڑ کے دیکھا میری طرف۔۔۔ ''آپ لوگ کیا چاہتے ایں۔ کیا چاہیے اُم سے۔ اُم کو امارے آل پر چوڑ دو بین۔ اب تو امارا سبزہ بھی لال ہوگیا اے۔ اماری زمین کی گاس بھی لال ہوگئی اے۔۔۔!'' اُس کی آواز بھی میری طرح ہوگئی میں اپنی ہتھیلیوں میں منہ ڈھانپ کر بیٹھی رہی۔ ہندوستانی ہونے پر اتنی شرمندگی پہلے کبھی نہیں ہوئی مجھے۔

خلیل میرا سوٹ کیس اُٹھائے اپنی بُوّا کے گھر میں داخل ہوا۔ بزرگ تھی۔ ادھیڑ عمر کی۔ اکیلی تھی وہ۔

''تُم اِدرای رُک جاؤ بین۔ اماری بُوا کے پاس۔ اُم روز صبح آ کے لے جائے گا۔ جِدر جانا ہوگا۔ اکیلی مت جانا کِدر۔۔۔'' اور مُڑ کے چلا گیا، جانے کس بات آنکھیں پونچھتا ہوا۔ نہ پیسوں کا پوچھا۔ نہ کرایے کا!

مگر میں مانی نہیں۔ بُوا کو سمجھا کر نکل آئی۔ وہ گلی بھی ڈل سے بہت دُور نہیں تھی۔ کنارے کنارے چلتی ہوئی، اوبروئے پیلیس کے سامنے آ گئی۔ گیٹ بند تھا اور دُور تک کانٹے دار تاریں کھینچ دی گئی تھیں۔ داخلے کا راستہ شاید بدل گیا تھا۔ میں ایک طرف سے تاریں اٹھا کر، اندر داخل ہوگئی۔ کچھ پرندے پھڑ پھڑائے اور آپس میں بولے بھی۔ کچھ اُڑ کے دوسری شاخ پر بیٹھ گئے۔ چوکنّے ہوگئے۔ میں دھیرے دھیرے اُوپر پیلیس کی طرف چڑھ گئی۔

مین گیٹ کے برآمدوں میں چھت سے لے کر، زمین تک ترپالیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ ہوٹل بند پڑا تھا۔ ایک حصّے میں فوجوں کی ایک ٹکڑی رہ رہی تھی۔ اور اُن کا اپنا فوجی کچن چل رہا تھا۔ برآمدوں میں سیلن بس گئی تھی۔ ناک پر رُومال رکھ کے چلنا پڑتا تھا۔ انیکسی بند تھا۔ لان کُوڑے کباڑ سے اٹا پڑا تھا۔ اور دونوں چنار مُنہ پھیرے سر جھکائے، ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ غلاموں کی طرح۔ اُن کے کندھوں میں خم آ گیا تھا۔ وہ بوڑھے لگ رہے تھے۔

گھُٹی گھُٹی سانس لئے میں بُوا کے پاس لوٹ آئی۔ بُوا نے بیچ کی میانی میں میرا بستر لگا دیا تھا۔

صبح صبح بچّوں کی چہچہانے کی آواز سن کر جاگ گئی۔ جب سے آئی تھی، پہلی بار کوئی خوشگوار آواز کانوں میں پڑی تھی۔ اُٹھ کر پیچھے کی کھڑکی کھول دی۔

بُوا کے گھر کے پیچھے ہی ایک قبرستان تھا۔ جہاں بچے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ پُرانی گری ٹوٹی قبروں کے بیچ بیچ میں بے شمار تازہ کچی پکی، مٹی سے ڈھکی قبریں تھیں۔ شاید یہی سب سے محفوظ جگہ تھی اُن کے کھیلنے کے لیے!''

میں نیچے آئی تو بُوا تھیں نہیں۔ غُسل کے لیے پانی رکھّا تھا۔ تولیہ اور صابن تھا۔ مجھے عادت نہیں ہے ٹھنڈے پانی سے نہانے کی، لیکن اب یہ ہوٹل تو تھا نہیں۔

آہستہ آہستہ پہلے ہاتھ سے بدن گیلا کیا۔ پانی سے مانوس کیا بدن کو۔ بہت ٹھنڈا تھا۔ پھر نہانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر پانی ڈالا، تو پانی لباس بن گیا۔ رُکتی تھی تو ٹھنڈ لگتی تھی۔ نہاتی گئی۔ نہاتی گئی۔ اور ساری رنجش ڈُھل گئی۔

بُوا کا جوان بیٹا تھا۔ عزیز علی۔ کمپیوٹر سیکھ رہا تھا، جب دُکان ہی سے پولیس والے پکڑ کے لے گئے۔ سُنا ہے کسی پاکستانی سے ملا تھا۔ اُسی کے حوالے

سے پکڑا گیا۔نو سال ہو چکے، ابھی تک اُس کی کوئی خبر نہیں۔جتنی لاشیں این کاؤنٹر میں گرتی ہیں۔بُوا جا کر دیکھ آتی ہے۔کبھی تھانوں میں، کبھی مُردہ گھروں میں۔جس جیل کا ٹھکانہ پتہ چلتا ہے وہاں ڈھونڈ آتی ہے۔سارے کشمیر کی جیلیں گھوم چکی ہے۔مگر اب تک لَو کی امید پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔جلتی رہتی ہے۔ماننے کو تیار نہیں۔آنکھیں خشک ہو چکی ہیں، لیکن روتی ہے۔میں نے کہا:

''بُوا ہو سکتا ہے پاکستان چلا گیا ہو۔ہو سکتا ہے، تہار جیل میں لے گئے ہیں۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''دِلّی میں۔۔۔!'' اُس کا چہرہ لٹک گیا۔لیکن میں یہ نہ کہہ سکی، ہو سکتا ہے مَر گیا ہو۔

ایک دن صبح صبح، پَو پھٹنے سے پہلے سارے علاقے کو گھیر لیا گیا۔ ملٹری کے ٹرک چاروں طرف آ کر کھڑے ہو گئے۔دو سرچ لائٹ، دو ٹرکوں پر لگا دی گئیں۔اور لاؤڈ سپیکر پر حُکم ہوا کہ سب لوگ باہر آ کر قبرستان میں جمع ہو جائیں۔تمام گھروں کی تلاشی لی جائے گی۔سہمے ڈرے لوگ، منٹوں میں ایسے باہر آ گئے جیسے بہت بار اس کی ریہرسل کر چکے ہوں۔دن نکلا۔دوپہر ہو گئی۔ بھُوکے پیاسے تمام لوگ، بغیر کسی حیل وحجّت کے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ گھروں کی تلاشی جاری رہی۔

دوپہر کے وقت میں نے ہمت کی۔کرنل سے انگریزی میں جا کر بات کی۔اُس نے بُوا کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی جو بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہی تھی۔بُوا کو جب میں گھر چھوڑ کر لوٹی تو لوگوں کی نگاہوں میں شک تھا۔حقارت تھی، اور بیگانگی تھی۔میں سہم کر، ایک کونے میں جا کے بیٹھ گئی۔

شام ہونے سے پہلے ملٹری پولیس کا ڈرامہ ختم ہو گیا۔لوگ گھروں کو لوٹنے لگے۔میں لوٹی تو بُوا کے دروازے پر تالا لگا تھا، اور میرا سامان، سوٹ کیس سمیت دروازے کے باہر رکھا تھا۔

سامان گھسیٹتی ہوئی میں سڑک تک آ گئی۔اور ڈل لیک کے کنارے بنی دیوار پر آ کر بیٹھ گئی۔میں سب کچھ کھو چکی تھی جب ایک شخص نے رُک کر پوچھا۔

''آپ کو کِدر جانا اے میم ساب؟''

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔''ایک رات کے لئے کسی بوٹ ہاؤس میں ٹھہرنا چاہتی ہوں''۔

''بوٹ آؤس میں تو اب کوئی گیسٹ نہیں رہتا میم ساب! بوٹ آؤس نہیں اے۔ایک آدمی اے، وہ خود ای رہتا اے۔اُس کا اپنا گرا اے۔''

''کہاں۔۔۔؟''

اُس نے اشارے سے بتایا۔

''وہ اُدر وزیرے کا بوٹ آؤس اے!''

''کس کا۔۔۔؟'' میں اچانک اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔وہ بھر بولا۔

''وزیر علی، اُس کا نام اے۔بُزرگ آدمی اے۔''

''مجھے وہاں تک پہنچا دو گے؟ میں اُس سے ریکوسٹ (request) کروں گی، منّت کروں گی، رکھ لے گا۔صرف ایک رات کے لیے!''

کُچھ حیرت، کچھ بے دِلی کے ساتھ وہ شخص تیار ہو گیا۔اور میرا سوٹ کیس اُٹھا لیا۔''چلو میم ساب۔مگر وہ کسی گیسٹ کو لیتا نہیں اے۔کوئی آتا بی نہیں اے۔گیسٹ تو کیا میم ساب۔۔۔'' وہ چلتے چلتے بول رہا تھا: ''اب تو رُوس اور وہ جانے کاہاں کاہاں سے برڈ آتے تھے۔وہ بھی نہیں آتے اس جھیل میں۔''

پتہ نہیں کیوں، مجھے اُمید ہو گئی تھی کہ وزیر علی وہی ہو گا۔جو بچپن میں مُجھے چُرا کے لے گیا تھا۔یا میں چاہتی تھی کہ لے جاتا۔

مگر وہ نہیں نکلا۔وہ کوئی اور تھا۔پھر بھی ایک رات کے لیے مجھے اُس بوٹ ہاؤس پہ رکھنے کے لیے تیار ہو گیا۔میرے لیے بستر بھی بچھا دیا۔فرش پر۔وہاں کوئی منقش پلنگ نہیں تھا۔

اگلے روز میں واپس آ گئی۔ایئر پورٹ پر۔تین بار، تین جگہ۔پُورا سامان کھول کر چیک کیا گیا۔میرے ''براز'' اور پینٹیاں جھٹک جھٹک کر دیکھی گئیں۔وہ دیکھ دیکھ کر میری چھاتیوں میں درد ہونے لگا۔ہر جگہ دو دو قطاریں تھیں دو دو خیمے تھے اور باڑی سرچ کے لیے عورتیں جس طرح چھوتی تھیں، لگتا تھا لیسبئن ہیں۔سب کے سب۔تیسرے خیمے میں جب جُوتے موزے اُتروا کے پُورے بدن پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' مجھے کہنا پڑا۔

''ماہواری سے ہوں۔مینسٹرل پیریڈ چل رہا ہے''۔اُسی وقت ساتھ کے خیمے سے کوئی پہچانی سی، رُندھی ہوئی آواز سُنائی دی!

''کون ہے وہاں؟'' میں نے پوچھا۔اور تقریباً دھکیل کر ساتھ کے خیمے میں گھُس گئی۔سامنے بُوا کھڑی تھی۔ہاتھ میں دلّی کا ٹکٹ جھول رہا تھا۔ناڑا کھُلا تھا۔شلوار نیچے گر گئی تھی اور کُرتا اُٹھائے، رسّی کی طرح پھنسی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

تلاشی کو بس یہی ایک جگہ بچی تھی، وہ بھی دیکھ لو۔۔۔'' مجھے دیکھتے ہی اُن کی گھگھی بندھ گئی۔

''یہ میں کیسے مُلک میں آ گئی ہوں؟ یہ میرا ہی مُلک ہے کیا؟''

اور وہیں اپنی شلوار پر ڈھیر ہو گئیں۔

مجھے خلیل کی چیختی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''آپ لوگ کیا چاہتے این۔کیا چاہیئے اُم سے۔اُم کو امارے آل پر چوڑ دو بین، اب تو امارا سبزہ بھی لال ہو گیا اے۔اماری زمین کی گاس بھی لال ہو گئی اے۔۔۔!''

دی سٹون ایج

گلزار

بم گِرا تو دُور تھا، لیکن گھر کی دیواریں اُس دھماکے کی تاب نہ لاسکیں۔مٹّی کی تھیں۔دیکھتے دیکھتے ڈھیر ہوگئیں۔اُسی میں اُس کی چھوٹی بہن دب کے مَر گئی۔بڑی آپا اُسے اٹھا کر بے نقاب دوڑ لی۔گلی کے دُھوئیں نے پردہ کر رکھا تھا، باپ نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور ایک پوٹلی، صندوق جو ہر وقت تیار رہتے تھے، اُٹھا کے بھاگ لئے۔

تب اُس کی عمر چار برس کی تھی۔

''ابو۔۔۔اِدھر۔۔۔اُدھر گورا ہے!''

وہ آپا کی بغل سے کُود گیا۔اُس کی آنکھیں بڑی تیز تھیں۔سامنے کی سڑک سے ایک جیپ گولیاں برساتی ہوئی گزر گئی۔

''نصیر نے بچا لیا!'' بہن نے بہت چُوما۔ماں نے بہت بلائیں لیں۔

نصیر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔جیسی چیتے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔نصیر اب اِس جنگل کی زندگی کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔اب تو گھر کی پہچان بھی گُم ہونے لگی تھی۔دو دو تین تین مہینے گھر سے باہر رہنا، پھر لوٹ آنا۔گھڑے مٹکے، ڈبّے بوریاں سنبھالنا اور کچھ ماہ بعد پھر سے بھاگ لینا۔ایک دادی تھی۔بس بھُوسے کی گٹھری کی طرح پڑی رہتی تھی۔

وہ دو برس کا تھا جب پہلی بار اُس نے ہوائی جہاز کی گرج اور بموں کے دھماکے سُنے تھے۔سارا گھر ہل رہا تھا اور وہ ماں کے سینے سے لپٹا ہوا کانپ رہا تھا۔امّاں نے ایک چوڑے پٹّے سے اُسے اپنی چھاتیوں پر باندھ رکھا تھا۔ایک ہاتھ میں گٹھری تھی اور دوسرے میں بانو، اُس کی چھوٹی بہن۔باپ نے ایک صندوقچی بغل میں دبا رکھی تھی۔مُنہ ہی مُنہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔اپنی امّاں کو گھسیٹتے ہوئے وہ دروازے پر لے گیا۔اور بولا۔

''امّاں، کوشش کر۔اللہ کی اُنگلی پکڑ اور چل مسید (مسجد) میں چلتے ہیں۔''

دادی بھی پتہ نہیں کسے کوس رہی تھی۔اُس کے باپ کو، یا اللہ میاں کو۔نصیر کی آنکھیں تب بھی چمک رہی تھیں۔اُس نے آسمان سے ستارے گرتے دیکھتے تھے۔اور زمین پر سُورج پھٹ رہے تھے۔ایک معصوم سا خیال اُس کے ذہن سے تب بھی گذرا تھا۔

''اللہ اتنا دہشت ناک کیوں ہے؟۔۔۔ڈراتا کیوں ہے؟''

دو سال کی عمر بہت کم ہوتی ہے لیکن آنکھیں اُس عمر میں بھی بہت زیادہ نگل جاتی ہیں۔اور جمع کر لیتی ہیں۔اُس غذا کو، بعد میں جگالی کرنے کے لیے، اونٹوں کی طرح!

مسجد خون کی بُو سے بھری ہوئی تھی۔زخمی ہاتھ کہنیاں، کندھے، گردن! پورے سالم آدمی بہت کم تھے۔نصیر کے لیے دنیا کی نارمل صورت یہی تھی۔اسی میں آنکھ کھولی تھی۔اسی میں بڑا ہو رہا تھا۔زمین پر خون دیکھ کر اُس میں پیر مارنا اُس کے لیے ایسا ہی تھا، جیسے بارش کے پانی میں پیر پٹخنا۔

مسجد میں نئے نئے نام بہت پڑے کانوں میں۔اپنے قبیلے کے ناموں سے تو وہ مانوس تھا۔لیکن رُوسی، امریکی، بُش، ترگنوف، گرگنوف، فرنگی، کوپٹر، ہیلی کوپٹر۔۔۔لگتا تھا کسی دوسرے قبیلے کے نام ہیں۔کسی اور جنگل کے۔اُن پہاڑوں کے پیچھے ہوں گے وہ جنگل، جہاں سے وہ سب کو پٹر اڑا کرتے ہیں۔جہاں سے آگ کے گولے آتے ہیں۔ان کے گھر توڑنے کے لیے۔اپنی بالشت بھر بہن کی موت کو وہ بھولا نہیں تھا۔

''گھر گِر پڑتے ہیں ناں ابّو!۔۔۔پھر ہم گھر میں کیوں رہتے ہیں؟''

وہ تین سال کا تھا۔جب اس نے سوال کیا تھا۔اُن دنوں میں وہ پکّے گھروں والے شہر میں آ گئے تھے۔

''باہر آگ برستی ہے ناں بیٹا، بم جو گِرتے ہیں۔'' باپ نے کہا تھا۔

''کون گِراتا ہے؟''

''وہ۔۔۔گورے، جو ہیلی کوپٹر میں آتے ہیں۔''

''بم کیوں گِراتے ہیں؟''

''ہمارے دشمن ہیں ناں!''

''ہم بھی اُن کے دشمن ہیں؟''

''اور کیا؟''

اُس کے ڈیڑھ سال بعد اُس نے سوال کیا تھا۔

''تو ہم بھی اُن کے پہاڑ پر بم گرا سکتے ہیں؟''

''ہمارے پاس ہیلی کوپٹر نہیں ہیں ناں بیٹا''

''تو بم کیسے گرائیں گے؟''

''فدائین ہیں ناں! اِسی لیے تو فدائین بھیجتے ہیں۔''

اُسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔اِملا مشکل ہوتی جا رہی تھی۔۔۔فدائین! ایک اور لفظ اس نے اپنی گلّک میں جمع کر لیا۔بڑا ہو کے خرچ کرے گا۔وہ چُپ تو ہو جاتا۔اُس کی تسلی نہ ہوتی ان جوابوں سے۔لیکن مکھیوں کی طرح سوال اُس کے چہرے پر بھنبھناتے رہتے۔وہ باہر جا کر بیٹھ جاتا اور اپنی غلیل بنانے لگتا۔

دادی بہت یاد آتی تھی اُسے۔چند مہینے جو قندھار کی ''آبنوسی'' مسجد میں کٹے تھے، اُس میں دادی نے بہت کہانیاں سُنائی تھیں اُسے۔

''دیو قامت عیّار نے پری کو لے جا کر دو فلک بوس میناروں میں

بند کر دیا۔ ایک مینار میں پری رہتی تھی۔ ایک میں وہ خود رہتا تھا۔ اُس نے پری کے پنکھ کاٹ دیئے، تا کہ اُڑ بھی نہ سکے۔ مینار اتنے اُونچے تھے کہ دنیا کا کوئی آدمی اُوپر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ نیچے جب خلقت شور کرتی وہ پنکھ کا ایک پَر اُتار کے اُڑا دیتا۔ خلقت اُسے لُوٹنے کے لیے ہزاروں میلوں تک دوڑتی چلی جاتی۔''

''شہزادہ بھی؟'' اُس نے پوچھا تھا۔

''وہ وہیں تھا لیکن شہزادہ کیا کر سکتا تھا؟ نہ اُوپر چڑھ سکتا تھا۔ نہ اُڑ سکے۔۔۔''

اچانک گُلّک سے ایک سکّہ باہر آ گیا۔ ''فدائین'' وہ اپنے آپ سے بولا۔

''فدائین کو کیوں نہیں بھیجا؟''

اُسے فدائین کا مطلب سمجھ آ گیا۔ دادی ہوتی تو اُسے بتاتا۔ اُس نے ابّا سے پوچھا، تو ابّا نے کہا۔

''وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔۔۔ وہ لے گئے اُسے''

''دادی کو بھی؟''۔۔۔ وہ پھر سے چُپ ہو گیا۔

پتہ نہیں مسجد کے مینار چھوٹے ہو رہے تھے یا اُس کا قد بڑا ہو رہا تھا۔ دادی کی کُٹھری سے نکل کے وہ مینار کی سیڑھیاں چڑھ جاتا تھا۔ بوری سے نکلے چوہے کی طرح۔ وہاں سے پورا شہر نظر آتا تھا۔ اُوپر سے پُورا شہر اینٹوں کا بھٹّہ لگتا تھا۔ جگہ جگہ سے دُھواں اُٹھتا رہتا تھا۔ نانبائی کی دکانیں ہوں گی۔ گوشت پک رہا ہوگا۔ کباب بھُن رہے ہوں گے۔

نصیر بڑی جلدی جلدی بڑا ہو رہا تھا۔ بار بار کپڑے تنگ ہونے لگتے تھے۔ دادی پتہ نہیں کہاں سے، کس کے کپڑے اُتار کے لے آتی تھی۔ اُسی مینار سے اُس نے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سُنی تھی۔ جب وہ بازار سے گذرتے تھے تو ساری زمین ہل جاتی تھی۔ دادی کی طلسمی کہانیوں میں جو آہنی گینڈے چلتے تھے، وہی ہوں گے۔ تھوتھنی اُوپر اُٹھائے، آگ اُگلنے کے لئے۔

پھر ایک اور حملہ ہوا۔ مسجد کو گینڈوں نے گھیر لیا۔ اور کئی دن تک گھیرے رکھا۔ روز تہ خانے کے دروازے سے کچھ لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح رات کے اندھیرے میں باہر نکال دیا جاتا۔ چوپایوں کی طرح، کہنیوں اور گھٹنوں پر رینگتے رینگتے، لوگ گلی سے گذر کے میدان پار کر جاتے۔ آپا اور امّی کے ساتھ نصیر بھی نکل گیا۔ ابّا اور دادی وہیں رہ گئے۔

پہاڑی کے پیچھے ایک اور گاؤں تھا، کچّے مکانوں کا۔ ایک طبیلے میں کچھ خاندانوں کو پناہ مل گئی۔ یہاں گولوں کا شور کم سُنائی دیتا تھا۔ ابّا بیچ بیچ میں آ کر لوٹ جاتے تھے۔ ایک بار ابّا کئی دن تک نہیں لوٹے۔ امّی بار بار سجدے میں گر جاتی۔ دُعائیں مانگتی۔ اُس کی آنکھیں ہر وقت پانی سے بھری رہتیں۔ نصیر نے فرش پر لیٹے لیٹے اُن سے پوچھا۔

''کیا دعا مانگ رہی تھی امّی؟''

''اللہ سے تیرے ابّا کی خیریت مانگ رہی تھی بیٹا۔''

نصیر لیٹا رہا۔ آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بڑے دھیرے سے پوچھا۔

''امّی، اللہ کس کی طرف ہے؟ ہماری طرف؟ کہ اُن کی طرف؟''

پھر مُڑ کر دیکھا۔ امّی جا چکی تھی۔

ایک رات نصیر نے اپنی غلیل شلوار میں اڑسی، اور اندھیرے میں رستہ سُونگھتا ہوا اُسی تہ خانے کے راستے سے مسجد میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا اُس نے اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ مسجد اندر سے تحس نحس ہو چکی تھی۔ ملبے سے بھری ہوئی تھی اور ایک سڑاند تھی۔ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو کچھ لاشوں کے ہاتھ پاؤں ملبے کے نیچے نظر آئے۔ ناک منہ صافوں میں لپیٹے ہوئے۔ ہاتھوں میں پھاوڑے تھے۔ شاید ملبہ اٹھانے والے لوگ تھے۔ چھپتا چھپتا نصیر باہر نکل گیا۔ لیکن باہر ایک مجمع لوگوں کا دیکھ کر، وہ دیوار سے لگے ٹرک کے اندر گھس گیا۔

آدھی پونی، کٹی سڑی لاشوں کے ڈھیر ٹرک میں گرنے لگے۔ اور نصیر ایک کونے میں دُبکا، اُن کے نیچے پڑا رہا۔ قصائی کی دکان پر ایسے ہی ادھ کٹے، ادھ چھلے بکروں کے ڈھیر آیا کرتے تھے ٹھیلے میں لد کر۔ وہ پڑا رہا۔ ٹرک چل دیا۔ پتہ نہیں کس قصائی کی ہٹی پر جا کر پھینکے گا۔ چند گھنٹوں کے سفر میں نہ معلوم نصیر کو غشی آ گئی یا وہ سو گیا۔ لیکن ایک پہاڑی کے دہانے میں جب ٹرک نے اپنا سامان اُلٹا تو وہ اُسی کے ساتھ گرا اور آنکھ کھل گئی۔ ایک بہت بڑے گڈھے کے پاس، ٹرک سامان پھینک کر لوٹ گیا۔ نصیر رینگتا ہوا اُس انسانی ملبے کے نیچے سے نکلا۔ اُوپر ننگا پتھریلا پہاڑ تھا، جس میں چھچھوندروں کے بلوں جیسے غاروں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پیروں پر ڈری لومڑی کی طرح وہ جلدی جلدی اوپر چڑھ گیا۔ ایک غار جیسے شگاف میں پناہ لی۔

اُوپر سے ملبہ نظر آتا تھا۔ شام تک گڈھا بھر کے بند کر دیا گیا۔ نصیر وہ رات بھی وہیں رہا۔ رات کے اندھیرے میں کچھ انسانی آوازیں بھی سرسراتی ہوئی سنائی دیں۔ شاید آس پاس کی غاروں میں کچھ لوگ رہتے تھے۔ بہت سی آنکھیں کُودتی نظر آئیں، جنگلی خرگوش تھے شاید۔ ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کے نصیر نے کچھ پتھر جمع کر کے رکھ لئے۔ غلیل ابھی تک اُس کی شلوار میں اُڑسی ہوئی تھی۔ اُس نے باہر نکال لی۔ ایک نوکیلا پتھر ٹٹول کر اُسے بڑے پتھر پہ گھسنے لگا۔ دادی یاد آ گئی۔

''شروع شروع میں انسان نے پتھروں کے ہتھیار بنائے۔ وہ شکار کرتے تھے اور غاروں میں رہتے تھے۔ جن قبیلوں کے پاس آگ تھی۔ وہ افضل مانے جاتے تھے۔ وہ میدانوں میں رہتے تھے۔ سفر کرتے تھے اور جگہ جگہ جا کر زمینیں فتح کیا کرتے تھے۔۔۔''

نصیر بڑے پتھر پر گھس کر، ایک نوکیلے پتھر کا ہتھیار تیار کر رہا تھا۔

''نظم کی ٹھنڈی خوشبو''

(گلزار صاحب کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب)

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

کتنی گرہیں کھولی ہیں میں نے۔۔۔

کتنی گرہیں کھولی ہیں میں نے
کتنی گرہیں اب باقی ہیں

پاؤں میں پائل
باہوں میں کنگن
گلے میں ہنسلی
کمر بند، چھلّے اور بچھوے
ناک کان چھدوائے گئے
اور زیور زیور کہتے کہتے
ریت رواج کی رسیّوں سے میں جکڑی گئی
اُف!۔۔۔کتنی طرح میں پکڑی گئی
اب چھلنے لگے ہیں ہاتھ پاؤں اور
کتنی خراشیں اُبھری ہیں
کتنی گرہیں کھولی ہیں میں نے
کتنی رسیّاں اُتری ہیں

انگ، انگ، میرا روپ رنگ
میرے نقش نین۔۔۔میرے بول بین
میری آواز میں کوئل کی تعریف ہوئی
میری زُلف سانپ
میری زُلف رات
زُلفوں میں گھٹا

میرے لب گلاب
آنکھیں شراب
غزلیں اور نظمیں کہتے کہتے
میں حُسن اور عشق کے افسانوں میں جکڑی گئی
اُف! کتنی طرح سے پکڑی گئی

میں پوچھوں ذرا۔۔۔
آنکھوں میں شراب دِکھی سب کو
آکاش نہیں دیکھا کوئی۔۔۔؟
ساون بھادوں تو دیکھے مگر
کیا درد نہیں دیکھا کوئی۔۔۔؟
فن کی جھینی سی چادر میں
بُت چھیلے گئے، عُریانی کے۔۔۔
تاگا تاگا کر کے پوشاک اُتاری گئی
میرے جسم پہ فن کی مشق ہوئی
فن، آرٹ، کلا کہتے کہتے
سنگ مرمر میں جکڑی گئی
اُف!۔۔۔کتنی طرح میں پکڑی گئی
بتلائے کوئی۔۔۔
کتنی گرہیں کھولی ہیں میں نے
کتنی گرہیں اب باقی ہیں!!؟

○

پوٹریٹ!

(گوپی چند نارنگ)

دو پہیوں پہ چلتا دریا
اک پاؤں پہ ٹھہری جھیل
جھیل کی نابھی پر رکھی ہے
اُردو کی روشن قندیل
روشنی جب بھنوراتی ہے تو
جھیل بھنور بن جاتی ہے

بھنور بھنور، محور محور،
علم کا ساغر چھلک رہا ہے
تشنہ لب سب اوک لگائے، دیکھ رہے ہیں
چھلکے گا تو نُور گرے گا
نُور گرے گا، نُور پئیں گے!!

○

کیوں چڑھے آتے ہو اُوپر لوگو۔۔۔؟

کیوں چڑھے آتے ہو اُوپر لوگو۔۔۔؟
سانس لینے کی جگہ تو دو ناں
ہاتھ سے بُوٹ ہٹاؤ اپنے
اُنگلیاں ٹُوٹ رہی ہیں میری
کیوں مری پیٹھ کے اُوپر سے چلے جاتے ہو،
تم سڑک کُوٹتے رَولر کی طرح
میرے نیچے بھی کوئی تھا جو مرا بوجھ ہٹانے کے لیے
جُوجھ رہا تھا۔۔۔!
اب تو ہلتا بھی نہیں ہے!!

○

اپنے دروازے پہ آتے ہو دستک دینے

اپنے دروازے پہ آتے ہو دستک دینے
اُس پہ آواز لگاتے ہو ''کوئی ہے؟''
کون ہوگا وہاں اب؟ کہ جہاں تم نے کبھی رات نہ چھیلی
نہ کبھی چُوس کے دن پھینکا ہے کوئی!
کوئی ہمزاد نہیں۔۔۔
آئینے میں چھوٹا ہُوا عکس نہیں
الگنی پر کوئی لٹکا ہوا سایہ بھی نہیں جو بُلا لے پھر سے
اور اب لوٹ کے آواز لگاتے ہو ''کوئی ہے؟''

ایک تنہائی جسے باندھ کے رکھ جاتے ہو گھر میں
ساتھ آ جائے تمہیں وہ بھی تو منظور نہیں ہے
کوئی آوارگی بہلا نہیں پاتی تم کو۔۔۔
لوٹ کے پھر سے چلے آتے ہو دستک دینے

کون کھولے گا وہ دروازہ جو تُم نے خود ہی
باہر آئے تھے تو اندر سے قفل ڈال دیا تھا!!

○

کنوئیں کے آس پاس اب کُچھ نہیں ہے

کنوئیں کے آس پاس اب کُچھ نہیں ہے
ذرا سے فاصلے پر اک پُرانا پیڑ جامن کا
اب اُس پر پھل نہیں آتے۔۔۔
مگر کچھ پُھند نے پتّوں کے لگ کر، سُوکھ جاتے ہیں
کنواں بھی اب اُترنے لگ گیا ہے
کنوئیں کی سب منڈیریں ڈھے چکی ہیں
ہری کائی ہے، دیواروں پہ کالی پڑ رہی ہے
کوئی آتا نہیں گاؤں کی پگڈنڈی سے پانی کھینچنے اب
ڈبوئے کلسی پانی میں، اُٹھائے، پھر ڈبوئے
کنوئیں میں جھانک کر کچھ گنگنائے
یا اپنے عکس ہی سے بات کر لے!

وہ کہہ کے تو گئی تھی، پھر سے لوٹے گی
میں چھوڑے کنوئیں کی مانند وہیں ٹھہرا ہُوا ہُوں
اُترنے لگ گیا ہوں
خشک ہوتا جا رہا ہوں!

❍

جب تُم میرا خط پڑھو گی۔۔۔

جب تُم میرا خط پڑھو گی۔۔۔
الفاظ کے وقفوں میں بیٹھا میں دیکھ رہا ہُوں گا تم کو

پڑھتے پڑھتے۔۔۔
بھُویں چڑھیں گی ایک بار تو
پھر ہونٹوں کے کونوں پر اک ہلکی سی مُسکان آ کر رک جائے گی
اور تمہاری عادت کو میں جانتا ہوں
چھوٹی سی زباں ہونٹوں پر آ کر، پھر غائب ہو جائے گی

پھر سانس کی لَے میں فرق آئے گا
دروازے کی جانب مُڑ کر دیکھو گی، پھر پڑھنے لگو گی
اور شکن ماتھے کی گہری ہو جائے گی
آہستہ آہستہ آنکھوں میں بھر آئیں گے جب اُنسو
آنسو پونچھ کے کُچھ جملے دوبار پڑھو گی
اب کے آنسو لفظوں کے وقفوں میں آ کر ٹپکیں گے

اب اس سے زیادہ کیا سمجھاؤں۔۔۔
دونوں ایک فلک پر ہیں ہم
شام کی سُرخ شفق ہُوں میں
تُم صبح صبح کی لالی ہو
تم کو فلک چڑھنا ہے ابھی
میں کچھ دیر ہوں، پھر اوجھل ہو جاؤں گا!

❍

''اوکٹوپس'' تو دیکھا ہوگا

''اوکٹوپس'' تو دیکھا ہوگا
گہرے نیل سمندر میں
ایک ایک کر کے، کیسے اُنگلیاں کھولتا ہے
اور شکار پکڑتا ہے
ایسے ہی کُچھ، نظم کی اُنگلیاں
ایک طلسم کو کھولتی ہیں
اور جکڑ لیتی ہیں مجھ کو

نیم غشی کے عالم میں جب، میرا وجود نگل جاتی ہے
نظم کی ٹھنڈی خُوشبو سی رہ جاتی ہے!!

❍

میں اپنے جسم کے باہر قدم رکھنے گیا تھا

میں اپنے جسم کے باہر قدم رکھنے گیا تھا
خلا میں جا پڑا پاؤں
کُچھ اربوں سُورجوں نے مُڑ کے دیکھا
مِری اندھیا گئیں آنکھیں
کئی بجریلی تاریکی بھرے سیّارے ٹکرائے
میں ٹھوکر کھا کے لوٹ آیا ہوں اپنے جسم کے اندر
مگر اب وہ خلائے بیکراں بھی ساتھ لوٹی ہے

سما پاتی نہیں سب جسم کے اندر
اُدھڑنے لگ گیا ہے جسم میرا !!

❍

آوارہ کُتّوں کو پکڑنا

آوارہ کُتّوں کو پکڑنا
بھاگتی بھونکتی سڑکوں پر
اور پھر اُن کو
جالی والی وین میں بھر کے
ہسپتال کے ''ڈوگ یارڈ'' تک لے کر آنا
اور سُلا دینا اُن کو!

گاڑی سے اُترتے وقت مگر
گردن لمبی کر کے، پُونچھ دبا کے کانپتی ٹانگوں میں
ایک قدم پیچھے ہٹنے کی کوشش وہ سب کرتے ہیں
''نیند کی خُوشبو سُونگھ لیا کرتے ہیں کُتّے!''

صُبح صُبح۔۔۔
ایسی ہی اک میونسپل گاڑی
اور نکلتی ہے سڑکوں پر
فُٹ پاتھ سے جسم اُٹھانے، اُن سب لوگوں کے
جن کو پچھلی رات میں نیند نے سُونگھ لیا ہو!!

❍

مرے تکیئے کے نیچے اِک سمندر ہے

مرے تکیئے کے نیچے اِک سمندر ہے
میں سر رکھتا ہوں جب بھی اِس جزیرے پر، تو فوراً ڈوب جاتا ہے
مرے تکیئے کے نیچے نیند کا گہرا سمندر ہے

عجب دُنیائیں ہیں گہرے سمندر میں......
جہاں بس میں ہی جا سکتا ہوں، کوئی دُوسرا جائے
یہ ممکن ہی نہیں ہے
کبھی وہ اجنبی لگتی ہیں آنکھوں کو
کبھی لگتا ہے میں نے ہی تو سب تخلیق کی ہیں

کوئی لڑکا ہے آموں کے بغیچے میں سے دوڑا جا رہا ہے
بُلاتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ بھی میں ہُوں ۔۔۔ اور میں بھی
وہ مڑ کے دیکھتا بھی ہے
مگر چھوٹا ہے وہ کُل نو برس کا ہے
میں نیلی روشنی کے پیڑ کے نیچے کھڑا تھا
کہ جس کی شاخیں کالے اژدھوں کے پیٹ کی سی پلپلی ہیں
میں چلتا ہوں تو شاخیں چلنے لگتی ہیں
طلسموں سے بھری دُنیا ہے، یہ حیران کرتی ہے
نظر آتا ہے جو ہونا نہیں، ہوتا نہیں، یا ہو چُکا ہے
اکیلا مارز پر چلتا رہا ہُوں
کوئی پہیہ دبا تھا، اُس کی مٹّی میں، جسے میں کھینچتا تھا،
اور گھُماتا تھا۔۔۔
اکیلے مارز پر چلتے ہوئے نیچے خلا میں اِس زمیں کو
آگ میں لپٹے ہوئے دیکھا ہے میں نے
وہ ماضی تھا، یا مستقبل؟
یہاں پر وقت دو جانب ہی بہتا ہے
یہاں سب وقت یکساں ہے

کوئی چہرہ ہے، مائیک پر لگا ہے
وہ بولے جا رہا ہے
میں پاس آتا ہوں تو چنگاریاں اُڑتی ہیں چہرے سے
مرے ہاتھوں میں پتّھر ہے
اُسی پر پھینکنا ہے اور گھُمائے جا رہا ہوں، ہاتھ سے
چھٹتا نہیں پتّھر!
مِرے تکیئے سے زنجیروں کے بجنے کی صدائیں آ رہی ہیں
سبھی انسان اپنی اپنی اِک پوشیدہ دُنیا
اپنے اپنے سر کے نیچے رکھ کے سوتے ہیں
پُرانی دِلّی ہے شاید
مجھے جہلم کا پُل دِکھتا ہے جمنا پر
مجھے پُل پار کرنا ہے
مگر پُل جھولتا ہے
کبھی پُل نیچے جاتا ہے، کبھی اُوپر چلا آتا ہے دریا
میں دریا اور پُل میں جھُولتا ہوں
میں اِک دنیا میں رہتا ہوں، اور اِک تخلیق کرتا ہُوں
مجھے اُوپر کی دُنیا سہنی پڑتی ہے
مگر تکیئے تلے کی کائناتی سے رہائی بھی نہیں ملتی!!

ہم وطن

بہت دنوں میں سہی، رنگ دھوپ کا بدلا
بہت دنوں میں سہی، پھر سے مسکرائے تم

پچاس سال سے میں ہچکیاں دبائے ہوئے
اس انتظار میں تھا، آنکھ اُٹھا کے دیکھو تُم
تو خشک اشکوں کی تحریر پڑھ سکو شاید
کہ میرا درد جدائی کا تم سے کم تو نہ تھا

ہر ایک روز تمہاری زمیں کو سجدہ کیا
ہر ایک رات تمہارے فلک کو چُوما ہے
کہ میرے چاند ستارے تو آج بھی ہیں وہی
جو چھت پہ لیٹے ہوئے روز دیکھتے ہو تم
کہ چاند آج بھی پڑھتا ہوں میں اُسی رُخ سے
وہ جس پہ تم نے کئی بار دستخط کر کے
فلک پہ چھوڑ دیا، رات رات اُڑتا رہے

ہوا گئی جو کبھی جُھول کر تمہاری طرف
ہزار گجرے کلائی پہ باندھ کر بھیجا

گئے جو ابر کبھی اُس طرف، کہا اُن سے
وہ لہجہ نرم رکھیں اور ادب سے برسا کریں

تمہیں عزیز ہے اپنا وطن، میں جانتا ہوں
مجھے بھی اُس سے محبت ہے، تم یقیں کر لو
ذرا سا فرق ہے گر تم سمجھ سکو اس کو
کہ تم وہیں کے ہو اور میں وہیں سے ہوں!!

○

کِسی موسم کا جھونکا تھا

کِسی موسم کا جھونکا تھا
جو اس دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر ترچھی کر گیا

گئے ساون میں یہ دیواریں یُوں سیلی نہیں تھیں
نہ جانے اس دفعہ کیوں
ان میں سیلن آ گئی ہے
دراریں پڑ گئی ہیں
یہ سیلن اس طرح بہتی ہے جیسے خشک رُخساروں پہ
گیلے آنسو چلتے ہیں

ہوا کی سانس کیوں سہمی ہوئی ہے
ہری واقف تھی
جب آتی تھی کمرے میں
مرے سینے میں بھر جاتی تھی جیسے بادباں بھرتے ہیں کشتی کے

گئے ساون۔۔۔
یہ بارش گنگناتی تھی
مری چھت کی مُنڈیروں پر
یہ میری کھڑکیوں کے کانچ پر اُنگلی سے لکھ جاتی تھی سندیسے
بلکتی رہتی ہے اب بند روشندانوں کے پیچھے
دُوپہریں ایسی لگتی ہیں
بنا مُہروں کے خالی خانے رکھے ہیں
نہ کوئی کھیلنے والا ہے بازی، اور نہ کوئی چال چلتا ہے
نہ دن ہوتا ہے اب، نہ رات ہوتی ہے
سبھی کچھ رُک گیا ہے
کِسی موسم کا جھونکا تھا
جو اس دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر ترچھی کر گیا ہے!

○

''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے''

''چہارسُو'' کے کرشن کمار طُور نمبر میں برِصغیر کے نامور اور ہر دل عزیز اداکار یوسف خان المعروف دلیپ کمار کی نوّاسی سالگرہ کی مناسبت سے ''تخلیقی وجدان'' کے عنوان سے خاکسار کی کاوش ''اے محبت زندہ باد'' کو احبابِ ہنر نے بے پناہ سہرانے کے بعد اس سلسلے کو ''چہارسُو'' کی باقاعدہ زینت بنانے کا مشورہ دیا۔ہم مگر یکسانیت کے خوف سے اس مشورے پرعمل کرنے سے باز رہے۔لیکن یہ علم قطعی نہ تھا کہ اس تخیلی سلسلے کو اس قدر جلد دہرانے پر مجبور ہوں گے۔سبب اس کا یہ ہے کہ ''چہارسُو'' کی ہر اشاعت اور اُس میں شامل صاحبِ ''قرطاسِ اعزاز'' سے مکالمہ،احباب کی توجہ کا خصوصی مرکز ہوا کرتا ہے۔

زیرِنظر اشاعت کی اطلاع کے بعد قارئینِ چہارسو کے خطوط،ای میلز اور ٹیلی فون کالز نے گلزؔار صاحب سے مکالمہ کی نسبت بے پناہ اشتیاق ظاہر کر کے ایک طرح سے ہمیں دوہرے عذاب میں مبتلا کر دیا۔اوّل گلزؔار صاحب کے سوالنامے کی بابت تحفظات،دوئم قارئینِ ''چہارسُو'' کی توقعات۔اس مشکل صورتحال میں دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہم نے وہی کیا جو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔مقصود کسی بھی شخص کی دل آزاری یا گلزؔار صاحب کے امیج کو نقصان پہنچانا ہرگز نہیں،خواہش فقط گلزؔار صاحب کے مداح اور قارئینِ ''چہارسُو'' کی تسلی وتشفی ہے جس کی کامیابی وناکامی کا تمام تر انحصار آپ کے اختیار میں ہے!!!

گلزار جاوید

☆ گفتگو کی ابتداء خدائے بزرگ و برتر کے پاک نام سے کرتے ہوئے آپ کی یادوں میں بسے آبائی قصبے ''دینہ'' کے شب وروز سے ہونی چاہیے؟

☆☆ بھائی صاحب!میں بصارت سے زیادہ بصیرت کا قائل ہوں۔یعنی چیزوں کو دیکھنے اور برتنے سے زیادہ محسوس کر کے تعلق و تاثر قائم کرتا ہوں۔میرے بچپن کا ''دینہ'' اور دینہ کے لوگ میرے حافظے میں آج بھی روزِ اوّل کی طرح محفوظ ہیں بقول شاعر:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

جہاں تک سوال میرے حقیقی جذبات واحساسات کا ہے تو وہ مرسلہ نظم کے مطالعے کے بعد زیادہ بہتر طریق پر آپ کو باخبر کرسکتی ہے۔

☆ تقسیم سے قبل اور بعد آپ نے کن تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی اور کہاں تک حاصل کی نیز آپ کے اساتذہ اور ہم جماعتوں میں کتنے لوگ حافظے میں محفوظ ہیں؟

☆☆

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب! دشمن آسماں اپنا

☆ کچھ تفصیل تقسیمِ ہند کی بابت اپنے اور خاندان پر گذرنے والے حالات کی بتلائیے؟

☆☆ اگر کوئی شخص ناخن سے گوشت اور جسم سے جاں نکلنے کی روداد بیان کرنا چاہے بھی تو کر نہیں پائے گا۔میرے لیے بھی اور میرے خاندان بلکہ ہزاروں لاکھوں خاندان پر گزرنے والے سانحات کا ذکر چند الفاظ میں قطعی ناممکن ہے۔یہ انسانیت کے چہرے کا ایسا بدنما داغ ہے جسے جلد سے جلد بھُلا کر آگے اور آگے کی جانب دیکھا جائے جہاں ہمارا اور ہماری نسلوں کا مستقبل ہمیں آواز دے رہا ہے۔سوال جہاں تک میری ذات کا ہے بطور تخلیق کار میں نے بھی اس حساس موضوع کو نظم،غزل،افسانہ،فلم اور ڈرامے کے ذریعے بساط بھر برتنے کی کوشش ضرور کی ہے۔مجھے یاد پڑتا ہے اس حوالے سے بھی میں ایک نظم آپ کو ارسال کر چکا ہوں۔

☆ کچھ احوال دہلی میں گزرے نوعمری کے ایام کی بابت بیان کیجیے؟

☆☆ اگر آپ کی منشا میری آوارہ گردی کو ہائی لائٹ کرنے کی ہے تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض کردوں کہ یہ کام میں بہت پہلے کمپیوٹر کے ذریعے عام کر چکا ہوں جس میں کئی طرح کے تجربات کے ساتھ موٹر گیراج میں گزرے وقت کی نشاندہی بھی موجود ہے۔

☆ اُنہی دنوں کے حوالے سے کینیڈا میں مقیم ایک صاحب کئی طرح کے دعوے اور ثبوت مہیا کرتے رہے ہیں؟

☆☆ استغفراللہ! ادب میں زرد صحافت سے پہلی بار سابقہ پڑا ہے۔ایک بات بتلایئے! عہدِ شباب میں جب آپ بمبئی تشریف لائے تھے تو میرا قیام بھی اُن دنوں بمبئی میں تھا۔اگر میں آپ کی بابت یکطرفہ طور پر کوئی دعویٰ کر بیٹھوں تو آپ اُسے من وعن تسلیم کرلیں گے!

☆ کیش، کنگھی، کچھا، کڑا، کرپان تو سردار کی آن، بان، شان ہوا کرتے ہیں پھر آپ نے ان سب چیزوں بلخصوص بالوں کو خیرباد کیوں کہا؟

☆☆ نامور مورخ ٹائن بی نے کہا تھا ''برصغیر کی روح میں قدامت پسندی اس قدر رچ بس گئی ہے کہ گزرے ہوئے دس ہزار سال ہر لمحہ ان کے ہمرکاب رہتے ہیں'' حیرانی مجھے اس بات پر ہے کہ آپ جیسا روشن دماغ بھی اس طرح سوچ سکتا ہے؟ میرے بھائی! میں تو روزِ اوّل سے انسانیت کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔جب بھی اپنی کوشش میں کامیاب ہوا، آپ کو ضرور اطلاع دوں گا۔شاید آپ کے سوال کا جواب دینا میرے لیے اُس وقت زیادہ آسان ہو۔فل حال تو میں میرانیس کا شعر آپ کی نذر کرسکتا ہوں:

خیالِ خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

☆ سردار سمپورن سنگھ کالرا عرف پنّی سے گلزآر تک کا سفر کن مراحل سے گذر کر طے ہوا؟

☆☆ اس سوال کے جواب میں اگر میں دریافت کروں کہ حضرت! کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ اردو ادب میں گلزآر تخلص کرنے والے کتنے ادیب، شاعر گزرے ہیں۔اور یہ کہ آپ نے اُن سب کی بابت یہ تکلف کیوں نہیں فرمایا کہ انہوں نے اپنے اصلی نام سے گلزآر تک کا سفر کب اور کیسے طے کیا۔آپ نہیں بتلا سکتے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ادب میں اُن کی شناخت اوّل و آخر اپنے تخلص کے حوالے سے تھی۔خیر سے ہمارے اور آپ کے ممدوح گلزآر دہلوی صاحب آج بھی اردو ادب و شاعری کا اہم حوالہ اور شناخت ہیں۔کیا آپ اُن کا اصلی نام، مطلب یہ کہ ڈومیسائل، شناختی کارڈ یا راشن کارڈ پر درج نام بتلا سکتے ہیں؟ آپ نے جس شخص کو کٹہرے میں لاکھڑا کیا ہے اُس کی بھی اوّل و آخر شناخت گلزار فقط گلزآر ہے۔

☆ آپ کے اندر کا تخلیق کار کب اور کیونکر دریافت ہوا اور پہلی باقاعدہ تخلیق کیسے ظہور میں آئی اور کس میڈیم پر اُس کا پرچار ہوا؟

☆☆ میرے خیال میں یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے۔ماں کے پیٹ سے لے کر دھرتی کے سینے تک تخلیق کار کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک عمل اُس کے تخلیق کار ہونے کی گواہی دے رہا ہوتا ہے۔یہ الگ بات ہے کس کو کس وقت کتنی پہچان ملتی ہے، کس ذریعے سے ملتی ہے، ملتی بھی ہے کہ نہیں!

☆ موپساں کی کتاب پر اپنے نام کی جعلی مہر لگانا کس احساس کا غماز تھا اور آج تک اُس کتاب کو سنبھالے رکھنا کس بات کی دلیل ہے؟

☆☆ جس جذبے اور شوق کے تحت نصف صدی قبل ساتویں جماعت کے طالب علم کے طور پر آپ نے اپنے ہم نام کا ''شمع'' دہلی میں چھپا ہوا نام دیکھ کر عزیز و دوستوں کو اپنا نام کہہ کر دکھلایا تھا۔

☆ ٹینس، ستار، مصوری کے اشغال سے کب اور کیسے تعلق ہوا نیز ان اشغال میں سنجیدگی کو کس حد تک دخل رہا اور آج کل صورت حال کیا ہے؟

☆☆ یہی سوال میں آپ سے بھی کرسکتا ہوں۔آپ کے ہاں بھی ان گنت اشغال کا ذکر ملتا ہے۔کیا آپ اس امر کے پابند ہیں کہ زندگی کے ہر تجربے اور احساس کی تاویل پیش کرتے پھریں۔میں تو سمجھتا ہوں تخلیق کار کی مثال کسی ایک چیز سے دی ہی نہیں جاسکتی۔یہ کبھی پھول، کبھی بھنورا، کبھی خوشبو اور کبھی احساس کی شکل میں ظاہر ہوکر اپنا آپ منواتا اور وقت کے دھارے میں جذب ہوجاتا ہے۔کیا خبر مرزا صاحب نے اسی صورت حال کے پیش نظر کہا ہو:

بخشے ہے جلوۂ گُل جوشِ تماشا غالبؔ!
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

☆ لباس کی بابت اس قدر سادگی اور قناعت یعنی سفید کرتا، پاجامہ تک محدود رہنے کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں سوال کی بنیاد اختلاف پر ہونا چاہیے! جہاں تک میری سمجھ کا تعلق ہے اپنی تہذیب، تمدن اور روایات کی پاسداری کرکے میں کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہورہا۔سفید رنگ امن، آشتی، بھائی چارہ اور دوستی کا پیغامبر ہے۔اور یہ تمام چیزیں میرے لیے روحانی غذا کا درجہ رکھتی ہیں۔تاجدارِ ہند بہادر شاہ ظفر بادشاہ ہوتے ہوئے کیا پتے کی بات کہہ گئے ہیں:

جو کہ ہیں باتیں فقیروں کی ظفؔر وہ چاہئیں
اس سے کیا حاصل اگر پہنا فقیرانہ لباس

☆ کچھ معلومات ہمارے قارئین کو کھانے پینے کے حوالے سے اپنی پسند ناپسند کی بابت بتلایئے مگر اس کے ساتھ ''بیگن'' سے اپنی ناراضگی کا سبب بھی بیان کیجیے؟

☆☆ یہ بھی سراسر انسان کا ذاتی معاملہ ہے کہ وہ کیا کھاتا ہے، کب کھاتا ہے، کتنا کھاتا ہے اور شاید یہ بھی کہ کیوں کھاتا ہے! ''بیگن'' سے میرے پرہیز کو انسانی فطرت کے دوغلے پن سے نفرت کا اظہار گردانا جائے تو مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

☆ تخلیق کار کے حوالے سے ایک تاثر یہ ہے کہ اُس کی زندگی میں جس قدر محرومیاں اور مجبوریاں ہوں گی اُسی قدر تخلیقی جوہر پروان چڑھے گا۔آپ ہمیں دیگر محرومیوں کے علاوہ والدہ صاحبہ کی بے وقت وفات اور اپنی زندگی وفن پر اُس کے اثرات سے آگاہ کیجیے؟

☆☆ آپ کے استدلال سے اتفاق کرلیا جائے تو ترقی یافتہ دنیا کے تمام بڑے تخلیق کار اپنے حق سے محروم کردیئے جائیں۔ ہر تخلیق کار کی زندگی جدوجہد اور آزمائش کی الگ داستان ہوتی ہے جس میں خوشی،غم، محرومی کا موجود ہونا فطری بات ہے۔یہی زندگی کا حُسن ہے۔میں نے بھی والدہ صاحبہ کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ہے مگر اُس طرح نہیں جس طرح آپ کا خیال ہے۔میری والدہ، والد بلکہ تمام عزیز واقارب میری یادوں میں ہمیشہ زندہ وتابندہ تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔آزمائش کی ہر گھڑی میں وہ میرا سہارا بنتے ہیں، میرے پکارے اور آواز دیئے بنا کبھی میری چھڑی، کبھی میرا عصا اور کبھی سایہ بن کر میرے ہم رکاب رہتے ہیں۔

☆ روحانی تسکین کا آپ کے ہاں Source کیا ہے اور دین، دھرم کا آپ کی زندگی میں کس قدر عمل دخل ہے؟

☆☆ جال پھینکنا جس طرح شکاری کا حق ہے اسی طرح جُل دینا شکار کا فرض۔میں ہرگز ہرگز اُس خارزار سے گزرنے کے لیے تیار نہیں جس میں آپ مجھے گھسیٹنا چاہتے ہیں۔میرے خیال میں انسان کی روحانی تسکین کا بہترین ذریعہ اُس کے اعمال ہیں یعنی:

ستیم،شیوم،سندرم

☆ ترقی پسندی آپ کے اندر کب اور کیونکر دخیل ہوئی اور اس دخل در معقولات کے نتائج کس شکل میں ظاہر ہوئے؟

☆☆ ہر باشعور انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے! اگر آپ گردو پیش کی بہتری کے لیے عملی طور پر کچھ نہیں کرسکتے، خواب تو سجا سکتے ہیں۔ میں پہلے بھی مساوات پر مبنی معاشرے کا قائل تھا، آج بھی ہوں اور آئندہ بھی رہوں گا۔البتہ !کسی نظریے یا نظام کی چاکری میرے خمیر کا پہلے حصہ تھی، آج ہے نہ آئندہ ہوگی۔

☆ راجندر سنگھ بیدی سے ملاقات کس وسیلے سے ہوئی اور اُن سے آپ نے کیا کچھ حاصل کیا؟

☆☆ بات طلب اور تڑپ کی ہے۔دونوں چیزیں حق سچ پر مبنی ہوں تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ بیدی صاحب بڑے ادیب اور بڑے انسان تھے۔ میں نے کوشش بہت کی کہ اُن سے کچھ نہ کچھ سیکھوں، کامیابی کی بابت آپ جیسے ماہرین ہی کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

☆ ''بمل دا'' سے تعارف تعلق اور عقیدت کے علاوہ اپنی شخصیت وفن پر اُن کے اثرات سے آگاہ کیجیے؟

☆☆ ''بمل دا'' میرے لیے ایک ادارے، انجمن اور انسٹی ٹیوٹ کا درجہ رکھتے ہیں۔وہ ایسا سایہ دار شجر تھے کہ اُن کی گھنی چھاؤں میں ہم جیسے کومل پودے بھی اپنے حصے سے زیادہ روشنی اور حرارت پاتے رہے۔ میں چاہوں بھی تو ''بمل دا'' کے وہ تمام اوصاف نہیں گنوا سکتا جو قدرت نے ایک بڑے انسان کو ودیعت کیے تھے۔میں نے ایک کہانی ''بمل دا'' تحریر کرکے خود پر واجب حق ادا کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے مگر:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

☆ احمد ندیم قاسمی سے کب اور کس طرح تعارف ہوا اور یہ تعارف تعلق کی انتہا تک کیسے پہنچا؟

☆☆ بابا سے میرے رشتے کو تعلق نہیں نیازمندی بلکہ عقیدت کا نام دیجیے جس کا تمام تر کریڈیٹ بابا کو جاتا ہے۔ساٹھ کی دہائی کے وسط میں میری تخلیقات کے تراجم پڑھ کر بابا نے نہ صرف مجھے ''اردو'' کی جانب راغب کیا بلکہ میری تخلیقات کی نوک پلک سنوار کر اپنے باوقار جریدے ''فنون'' میں اہتمام سے شائع بھی کرتے رہے۔

☆ قاسمی صاحب تمام عمر خود کو ترقی پسند کہلوانے پر بضد رہے جبکہ آپ کے ہاں اس حوالے سے تشکک پایا جاتا ہے؟

☆☆ اول ایک انسان کی غیر موجودگی میں اُس کی ذات کے متنازعہ پہلو زیر بحث لانا ہی نامناسب ہے۔میرے خیال میں کچھ لوگ تسلسل سے بابا کو سقہ اور سکہ بند ترقی پسند گردان کر، اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے اُن کی عقیدت کو متنازعہ بنانا چاہتے تھے جو سراسر غلط عمل تھا۔میں نے اسی پس منظر میں کچھ عرض کیا تھا۔

☆ قاسمی صاحب کو انسان کے بجائے فرشتہ گردانے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ کمال ہے صاحب، آپ کو اس امر پر بھی اعتراض ہے! جس طرح بابا میری زندگی میں تشریف لائے اور جس طور انہوں نے میری بے لوث رہنمائی فرمائی اس کے بعد کہنے کو اور کیا رہ جاتا ہے۔

☆ خواب دیکھنے کا سلسلہ آپ کے ہاں کب سنجیدہ مرحلے میں داخل ہوا، مثلاً آپ کے خواب کس نوعیت کے ہوا کرتے ہیں اور اُن کی تعبیر کے لئے آپ کیا جتن کیا کرتے ہیں؟

☆☆ ہر شخص کی زندگی میں خواب کی اپنی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ ہاں مگر! خواب انسان کی سوچ اور عمل کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ جہاں تک میرے خواب دیکھنے کا سوال ہے تو میری تخلیقات میں جابجا میری خواہشیں اور میرے خواب بکھرے ہوئے ہیں جنھیں میں چاہوں بھی تو کوئی ایک سمت یا رُخ نہیں دے سکتا۔ بقول حضرت بیدم وارثی:

ایک ارمان نکلتا ہے تو سو آتے ہیں
دل عجب گھر ہے کہ بیدم کبھی ویراں نہ ہوا

☆ آپ کی بیشتر نظموں میں تنہائی اور اُداسی اس قدر نمایاں کیوں ہے؟

☆☆ پچھلے کسی سوال میں فنکار کے لیے آپ نے محرومی وغیرہ کو لازم گردانا ہے۔اب اگر آپ کو میری نظموں میں تنہائی اور اُداسی کے عنصر پر اعتراض ہے تو مجھے تخلیق کار کے حق سے محروم کردیجیے یا اپنے سوال سے رجوع کرلیجیے۔

☆ آپ کے ہاں لفظیات کی جدت طرازی اور انوکھا پن فطری میلان

ہے یا آپ دانستہ اس عمل کو دہرایا کرتے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں یہ ایک فطری میلان ہے جسے سادہ زبان میں عام انسان ہونے کا اعلان بھی کہا جا سکتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں وقت کے حوالے سے کہی گئی بہت سی نظموں کے موضوع اور مواد سے ناانصافی کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے؟

☆☆ بندہ پرور! کسی کی لئے میں لئے ملا کر آپ بلاوجہ دانشمندی فرمارہے ہیں۔ ہر طرح کے استدلال سے پہلے ٹھوس ثبوت، سند اور جواز کا ہونا لازمی شرط ہے۔

☆ تخلیق کسی بھی نوع کی ہو اوّل تا آخر خیال کی اہمیت سے انکار یا فرار کسی طرح بھی ممکن نہیں مگر آپ خیال کی نسبت الفاظ کو اہمیت دینے کے قائل ہیں؟

☆☆ کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ خیال اُس وقت تک خام رہے گا جب تک اُسے الفاظ کا مناسب جامہ نہ پہنایا جائے۔

☆ آپ کی نظموں میں محاکاتی عناصر اور سائنسی امتزاج تلاش کرنے والے اُس کا جواز ڈھونڈنے سے قاصر کیوں ہیں؟

☆☆ تخلیق کے لیے جنون کی، جذبات کی، احساس اور وجدان کی ضرورت ہوا کرتی ہے جواز کی ہرگز نہیں۔

☆ شاعری کے ٹیبل سے عدم واقفیت کا تصور حقیقت ہے یا آزادئ اظہار کا بہانہ؟

☆☆ آپ کو اختیار ہے جو چاہیں رائے قائم کریں۔ میں دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دو جمع چار کے ساتھ دو جمع پانچ کہنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

☆ اردو غزل کی روایتی ندرت اور حسنِ تغزل آپ کے ہاں اُس طور نظر کیوں نہیں آتا جس طرح قدیم اردو شعراء کے ہاں موجود ہے؟

☆☆ یہ اگر آپ کی ذاتی رائے یا الزام ہے تو بسر و چشم قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہر آدمی کی پسند و ناپسند کا پیمانہ جدا ہوتا ہے۔ جہاں تک احباب کو گھسیٹنے کا سوال ہے تو میری نظر سے اس طرح کی اختلافی رائے کبھی نہیں گزری۔

☆ کچھ لوگ آپ کی غزلوں میں اسقام کی جانب اشارہ بھی کیا کرتے ہیں؟

☆☆ جاوید صاحب! اس سوال کو اگر ہم یہیں خدا حافظ کہہ دیں تو بہتر ہے وگرنہ:

ذکر چھڑ گیا جب قیامت کا
بات پہنچی تیری جوانی تک

☆ اور جناب! کچھ کے خیال میں آپ کی غزلیں نظموں کے بہت قریب ہیں؟

☆☆ تو اس میں برائی کیا ہے! شکر ہے خدا کا کہ آپ میری غزلیں میری ہی نظموں کے نزدیک گردان رہے ہیں وگرنہ آپ کے حسنِ سلوک سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

☆ آپ کے ہاں فارسی کے اثرات سے دانستہ پرہیز کے ساتھ غالب سے عقیدت عجب طرح کا تضاد پیدا کر رہے ہیں؟

☆☆ میں نے ہمیشہ عام آدمی کی زندگی بسر کی ہے۔ میرا اتخاطب عام آدمی اور اُس کے مسائل رہے ہیں۔ میرے دور سے فارسی کیا اردوئے معلّٰی کی جگہ اردوئے محلّہ کا چلن عام ہو چکا ہے تو مجھے پاگل کتّے نے کاٹا ہے کہ خواہ مخواہ بھاری بھرکم تراکیب واصطلاحات استعمال کر کے خود بھی پشیمان ہوں اور قاری کو بھی مشکل سے دوچار کروں۔ میرزا صاحب سے عقیدت کی جہاں تک بات ہے تو میں خود کو اس حوالے سے خوش نصیب گردانتا ہوں کہ میں میرزا صاحب کی زبان اور شاعری سے آشنا ایک ادنیٰ عقیدت مند ہوں وگرنہ میں نے ایسے بھی عاشقانِ غالب دیکھے ہیں جو اردو زبان اور شاعری سے قطعی واقفیت نہیں رکھتے۔ میرزا صاحب سے اُن کی تمام تر عقیدت تراجم کی مرہونِ منت ہے۔

☆ اشوک ترپاٹھی اور اجیت پشکل نے دو دہائیاں قبل آپ کے افسانوں کی بابت جو رائے قائم کی تھی ''آپ شاعر ہونے کے ناطے افسانوں میں حقیقت سے دور شاعرانہ زبان میں مختصر یا نامکمل کہانیاں لکھتے ہیں'' کی بابت آج صورت حال کیا ہے؟

☆☆ یہاں بھی مجھے آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ نے فقط تین دہائی قبل دی گئی رائے کوٹ کی ہے وگرنہ آپ قبل از مسیح کا اختلافی نوٹ لے آتے تو میں کیا کر لیتا!

☆ اردو شاعری کا دامن اس قدر تنگ تو نہیں کہ اپنے احساسات و خیالات پیش کرنے کے لئے نئی صنف ''تروینی'' ایجاد کی جائے؟

☆☆ تو کیا آپ کے خیال میں نئے تصورات کو ڈبّے میں رکھ کر ڈھکن سختی سے بند کر دینا چاہیے۔

☆ انسانی نفسیات کا برتاؤ جس قدر آپ کے ہاں نمایاں ہے اُسی قدر قاری اُس کے ماخذ سے بے خبر ہے؟

☆☆ صاحب! میں نے کبھی نفسیات داں ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا۔ عمرانیات کے ادنیٰ طالبعلم کے طور پہ جو تھوڑا بہت جان سکا وہ سپردِ قلم کر دیا۔ بقول ساحر لدھیانوی:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

☆ حیات و کائنات کی ساری غارت گری کا محرک وقت کو کیوں گردانتے ہیں، انقلاباتِ زمانہ اور انسانی عمل کو فراموش تو نہیں کیا جا سکتا؟

☆☆ اگر ہم سائنس کا بغور مطالعہ کریں تو حیات و کائنات کی تمام تر کارہ

گری نظامِ وقت کے تابع نظر آتی ہے۔آپ کے خیال میں قاری کی توجہ اس جانب دلانا جُرم ہے تو میں اس جرم کا اقبال کرتا ہوں۔

☆ بظاہر آپ بہت پرسکون اور Composed انسانی دکھائی دیتے ہیں مگر وصل کا اظہار، بیان بلکہ تکرار اس کی نفی کرتے نظر آتے ہیں؟

☆☆ بندۂ خدا! ایک عامی اور خاکی انسان سے آپ کیا کچھ اور کتنا کچھ چاہتے ہیں، ایک ہی بار بتلا دیجیے تو بہتر ہے وگرنہ ہمیں پھر سے مدد کے لیے میرزا صاحب کو پکارنا ہوگا:

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

☆ آپ کے حوالے سے ساحر کی ادبی روایات کو برقرار رکھنے کا کیا مطلب لیا جائے؟

☆☆ میں نے اس طرح کا دعویٰ بلکہ کسی بھی طرح کا کوئی دعویٰ کبھی نہیں کیا۔

☆ کچھ لوگ آپ کے ہاں Vangough کے اثرات کا تذکرہ بھی کیا کرتے ہیں؟

☆☆ یہ دنیا کارخانۂ قدرت ہے۔کوئی شخص ماں کے پیٹ سے سیکھ کر نہیں آتا۔ جہاں تک سوال وین گوف کے اثرات کا ہے تو جب کبھی آپ کو فرصت میسر ہو، ناچیز کو غور سے پڑھیے گا تب شاید اس سوال کی شکل کچھ اور ہو!

☆ اس تاثر میں کہاں تک حقیقت ہے کہ آپ کی فلم ''کتاب'' آپ کے نجی حالات کی عکاس ہے؟

☆☆ آپ کو اختیار ہے جو چاہیں فیصلہ کریں میں تردید یا تصدیق کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

☆ آپ نے جس قدر بھی فلمیں بنائیں اکثر باکس آفس پر اُس طرح کامیاب نہ ہوسکیں جس طرح ایک کامیاب فلم کو ہونا چاہیے۔اس قدر خسارے کا سودا آپ کس طرح مسلسل کئے جاتے ہیں؟

☆☆ ہر کسی کے، کامیابی اور ناکامی کے الگ پیمانے ہیں۔میں نہیں جانتا کہ آپ کے ہاں کامیابی اور ناکامی ماپنے کا پیمانہ کیا ہے۔میرے نزدیک کامیابی قلبی تسکین کا نام ہے۔ بفضلِ تعالیٰ مجھے اپنے تخلیقی اور تکنیکی کام کے ذریعے میری ضرورت کے مطابق یہ شے وافر مقدار میں دستیاب ہے۔

☆ آپ کے خیال میں ایک تخلیق کار کی زندگی میں محبت اور عشق کا تناسب کس قدر رہنا چاہیے نیز یہ کہ اُن لوگوں کی بابت آپ کی کیا رائے ہے جو آپ کی رومان پسندی کو آپ کی بہت سی فلموں کی مس کاسٹ کا ذمہ دار گردانتے ہیں؟

☆☆ سب سے پہلے آپ کی توجہ قابل اجمیری مرحوم کی جانب دلانا چاہتا ہوں جو اس حوالے سے بہت واضح، دوٹوک اور سائنس پر مبنی رائے دے گئے ہیں:

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

آپ بھی ایک تخلیق کار ہیں۔ یقیناً دل کے معاملات سے بھی گزرے ہوں گے۔ پہلے آپ بتلائیے! آپ نے کس پیمانے کے تحت اس تناسب کو برتا اور کامیابی وناکامی کا تناسب کیا رہا؟ آپ کے جواب کی روشنی میں سوال کے دوسرے حصے کا جواب خود بخود برآمد ہو جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ سوال کی مناسبت سے خواجہ میر درد یاد آ گئے ہیں:

رسوائیاں اُٹھائیں ، جور و عتاب دیکھا
عاشق تو ہم ہوئے، پر کیا کیا عذاب دیکھا

☆ مینا کماری مرحومہ سے اپنے تعلق کو کیا نام دینا پسند کریں گے؟

☆☆ قرآن مجید میں پیٹھ پیچھے غیبت کرنے کے عمل کو بھائی کا گوشت کھانے کے مماثل گردانا گیا ہے۔اسی خوف کے باعث میں کسی زندہ شخص کی غیر موجودگی میں بھی اُس کی بابت بات کرنا پسند نہیں کرتا کُجا آپ ایک مرحوم ہستی کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں۔

☆ مینا کماری کے ''قضا روزے'' آپ نے کب اور کیوں رکھنا شروع کئے، یہ سلسلہ کب تک جاری رہا اور اسے منقطع کرنے کا سبب کیا ہے؟

☆☆ آپ کا کوئی قریبی عزیز یا دوست شدید بیماری کی حالت میں روزہ چھوٹ جانے کے خوف سے دوائی نہ کھائے تو آپ کا عمل کیا ہوگا؟ میں نے وہی کیا جو میرے فرض کا تقاضا تھا اور اُس وقت تک کیا جب تک میری صحت نے ساتھ دیا۔

☆ اس تاثر میں کہاں تک حقیقت ہے کہ آپ مینا کماری سے وعدے کے باوجود اُن کی بیاض کو کتابی شکل دینے میں ناکام رہے ہیں؟

☆☆ آپ کے ہر تصور اور استدلال سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔

☆ آپ کے خیال میں مینا کماری کس معیار اور مقام کی شاعرہ تھیں؟

☆☆ اس سوال کا رُخ ناقدینِ ادب کی جانب ہونا چاہیے۔

☆ اداکارہ راکھی سے آپ کی محبت، شادی اور علیحدگی تین حوالے ہیں اور تینوں کی بابت آپ سوالیہ نشان کی زد میں ہیں؟

☆☆ جاوید صاحب! یہ بہت ذاتی نوعیت کا سوال ہے اور یکطرفہ طور پر اس کا جواب دینا ایک طرح سے اخلاقی بددیانتی ہے۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ جس قدر محنت، محبت اور توجہ سے آپ نے اپنی اکلوتی بیٹی میگھنا کو پالا، پوسا اور تعلیم تربیت کی ذمہ داری نبھائی اگر اُس سے نصف قربانی آپ راکھی سے تعلق نبھانے پر دیتے تو تین زندگیاں سنور سکتی تھیں؟

☆☆ اوپر دیئے گئے جواب کے بعد یہ سوال تکرارِ محض کے زمرے میں شمار ہوگا۔

☆ شہرت و ناموری بلکہ قومی ہیرو کے درجہ پر پہنچ کر آپ خود کو کامیاب

انسان تصور کرتے ہیں۔ جواب اگر اثبات میں ہے تو اس کامیابی کا راز کیا ہے؟
☆☆ اس فیصلے کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کو میرے قاری یا ناقد سے رجوع کرنا چاہیے۔
☆ کچھ لوگ اسے فلمی شہرت وحیثیت کا کرشمہ بھی گردانتے ہیں؟
☆☆ اور لوگوں کی طرف سے میں قطعی فکر مند نہیں کم از کم آپ اپنی پوزیشن واضح کردیجیے!
☆ قلم، کتاب، برش والوں کی اکثریت چھوٹی یا بڑی سکرین کے خواب دیکھتے گزرتی ہے آپ کے ہاں صورت حال بالکل اُلٹ ہے۔ آپ مصنف، فلم ساز، ہدایتکار اور ادیب کے بجائے صرف شاعری کو اپنی شناخت بنانے پر بضد ہیں؟
☆☆ آپ کا مسئلہ انٹرویو تیکھا یعنی چٹ پٹا بنانا تھا سو اس مہم میں آپ کامیاب ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجھے ذاتی طور پر جاننے والا کوئی شخص مجھ سے اس طرح کا سوال دریافت کرے گا۔ میں وہی کچھ کرتا ہوں جس سے میرے دل کو اطمینان ہوتا ہے۔ شاعری سے مجھے وہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے جو چھوٹی بڑی سکرین تو کیا دنیا کی تمام تر دولت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔
☆ رنگ و آہنگ کی دنیا کُھل کر ہنسنے اور نت نئے قہقہے لگانے کی عادی ہوا کرتی ہے، آپ فقط ایک تبسم پر قناعت کیوں کر بیٹھے؟
☆☆ اگر میں آپ کے اس سوال کی داد نہ دوں تو آپ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ یقیناً آپ صاحبِ ذوق آدمی ہیں آپ کے سوال میں جو لطیف اشارہ ہے اُس کی بابت بابا کیا خوب کہہ گئے ہیں:

گو مجھ سے منسوب تھی انجمن آرائی
اب میں ہوں اور حدِّ نظر تنہائی

اور دیکھئے اطہر نفیس مرحوم بھی بروقت یاد آئے ہیں:

میرے ہونٹوں کا تبسم دے گیا دھوکا تجھے
تُو نے مجھ کو باغ جانا، دیکھ لے صحرا ہوں میں

☆ ایک مدت سے آپ فلم سازی اور ہدایتکاری سے کنارہ کش ہیں۔ کچھ لوگ اسے جدید تکنیک سے عدم آگہی، کچھ فلم کے بدلتے مزاج، کچھ سرمائے کی عدم دستیابی اور کچھ تخلیقی سوتے کی خشکی سے نتھی کیا کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اس کا درست جواب کیا ہے؟
☆☆ لگ بھگ چار صدی قبل مسیح کا یونان قریبی ریاست سے جنگ میں الجھ گیا۔ جوں جوں جنگ طوالت اختیار کرتی گئی ووں ووں یونان کے فوجیوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔ شکستگی کے اس ماحول میں ایک بیس سالہ نوجوان قانون دان ڈیماسمتھ جو ایک پُر جوش مقرر بھی تھا نے اپنی قوم کو جگانے کے لیے ملک کے کونے کونے کے ساتھ محاذِ جنگ پر جا کر جوشیلی تقریروں سے یونان کے مرد وزن اور فوجی جوانوں کے جذبات میں آگ بھر دی۔ یہی ڈیماسمتھ جب تلوار سونت کر میدانِ جنگ پہنچا تو تاریخ نے اُس وقت نیا موڑ لیا جب یہ نابغۂ روزگار روشن ستارہ دوسرے دن ہی جنگ کی سختیوں سے گھبرا کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔
مجھے اپنی بابت کسی قسم کا کوئی دعویٰ ہرگز نہیں ہاں! میں آج کل فلم نہیں بناتا جس کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس کے باوجود آپ کو اختیار ہے جو چاہیں رائے قائم کریں مگر اُس سے پہلے یہ دیکھنا لازم ہے کہ میرزا صاحب اس حوالے سے کیا فرما گئے ہیں:

یار نے تشنگیٔ شوق کے مضموں چاہے
ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

☆ ہماری نظر سے پچھلے دنوں ایک خبر گذری تھی کہ آپ کو کسی فلم کے گانوں پر آسکر ایوارڈ دیا جانا تھا، مغربی لباس زیبِ تن کرنے کی شرط کے باعث آپ اتنا بڑا ایوارڈ لینے نہیں گئے؟
☆☆ ارے بھائی چھوڑیئے! سب دل بہلاوے کی باتیں ہیں، مسئلہ فقط طمانیت حاصل کرنا ہے۔ کوئی لقمۂ تر سے سیر نہیں ہوتا اور کسی کو روکھی سوکھی کھا کر چین کی نیند آتی ہے۔
☆ ایک سوال لوگوں کے ذہنوں میں اکثر یہ آتا ہے کہ آپ کا ادبی محاکمہ اُس طور نہیں ہوا جس طور خالص ادیب اور شاعر کا ہونا چاہیے۔ آپ کے خیال میں بعد از حیات آپ کے تخلیقی اور تکنیکی کام کی اہمیت اور عمر کتنی ہونی چاہیے؟
☆☆ خالص ادیب اور شاعر کی اصطلاح بھی خوب ہے! آپ لوگوں کے کاندھوں پر بندوق رکھنے کے بجائے یہ سوال اپنے حوالے سے کرتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ جواب میں دونوں صورتوں میں نہ دیتا۔ میں تو بابا فرید کا ادنیٰ عقیدت مند ہوں اور اُنہی کا ہم خیال بھی:

مالی دا کم پانی دینا ، بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھُل لانا تے لاوے یا نا لاوے

☆ بھائی صاحب! آپ نے ہمارے تلخ و شیریں سوالات کے جوابات جس خندہ پیشانی سے دیئے اُس کے لیے ہم اور ہمارے قارئین آپ کے ہمیشہ ہمیشہ ممنونِ احساں رہیں گے۔ اس موقع پر آپ قارئینِ چہارسو سے از خود کچھ کہنا پسند فرمائیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔
☆☆ بابا فرید جیسے بلند پایا دین دار بزرگ اور شاعر کے بعد میری لب کشائی سراسر گستاخی کے زمرے میں آئے گی۔ البتہ آپ کے حسنِ سلوک کی روشنی میں شیخ سعدیؒ کے کلام کی جانب آپ کی توجہ دلانا بری بات نہیں!

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

''یعنی ایک برس قبل دمشق میں اتنا قحط پڑا کہ یار لوگ عشق کرنا بھول گئے'' آپ کے سوالات کی پے در پے گولہ باری سے فلحال میرا ذہن کافی حد تک ماؤف ہو چکا ہے۔ زندگی رہی اور خدا نے ملایا تو باقی گفتگو پھر کبھی سہی۔۔۔۔

''کرشمہ دامنِ دل''

صاعقہ مقبول

(اسلام آباد)

پنی (میں گلزار کو اس نام سے بلاتی ہوں کیونکہ وہ مجھے بیٹے کی طرح عزیز ہے) میرے شوہر نے اپنی سی کوشش کی کہ پنی کاروبار میں شامل ہو اور اپنی مالی حالت بہتر بنائے۔ اس غرض سے وہ روزانہ اسے دفتر بھی بھجواتے۔ جہاں پنی عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتا۔ لیکن آگے سے زبان نہ چلاتا۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ محض چند مہینوں کے بعد اس نے گھر چھوڑ دیا اور وہ سوامیں راجندر سنگھ بیدی کی نگرانی میں چلا گیا۔ وہاں اسے گھر ایسا آرام تو نہیں تھا مگر تکالیف اٹھا کر بالآخر اس نے مطلوبہ خوشیوں کو تلاش کر لیا۔ اس کا اگلا پڑاؤ بمل رائے کا قرب تھا۔ اور اس کے بعد کی کامیابیاں تو ہر ایک کے سامنے ہیں۔

پنی نے تصنیف کے بعد ہدایات کا شعبہ اپنایا۔ اور اس میں بھی اپنی ذہانت اور مہارت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یوں تو میں اس کی تمام فلموں کو عزیز رکھتی ہوں مگر ''آندھی'' میری پسندیدہ ترین فلم ہے۔ پنی کی ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ وہ لیبارٹری سے آنے والا پرنٹ ہمیں دکھاتا اور دعائیں لیتا ہے۔

راجندر کور

آپ گلزار کی کوئی بھی کہانی لے لیجئے، اسے پڑھتے ہوئے کہیں بھی شور اور سرعت کا احساس نہیں ہوتا یا پھر اگر شور سا بپا ہوتا بھی ہے تو کہانی کے خاموش آس پاس کے باعث۔ گلزار چپ چاپ اپنی بات نبھائے چلے جاتے ہیں اور قاری ان کی خاموش لکھت میں گویا اپنے آپ کو ہی پڑھتا چلا جاتا ہے اور یوں اپنے ہی دریافت کردہ مفاہیم کو پا کر اس کا جی چاہتا ہے کہ اونچے اونچے کہانی کی باتیں کر کر کے اوروں کو اپنی سوچ کا ساجھے دار بنالے۔

حال ہی میں میں نے گلزار کی ایک بڑی عمدہ کہانی ''دی اسٹون ایج'' پڑھی ہے۔ کہانی میں جابجا شور مچانے کی ترغیب موجود ہے اور شاید وہ شور کھلے بھی نہیں، مگر گلزار نے اول تا آخر اپنا منہ نہیں کھولا اور ساری کہانی آپ ہی آپ اپنے سَرِل سے وقوعی معمول میں انجام پا گئی ہے اور کہانی کار نے بڑی سادگی سے یہ معجزہ کر دکھایا ہے کہ اکیسویں صدی کے تمام تر نئے مدارج پر غاروں کے ادوار کا گمان ہونے لگتا ہے۔

گلزار نے کہیں لکھا ہے کہ شاعری اس کی پہلی محبت ہے۔ میرے پیارے بھائی، محبت پہلی یا دوسری نہیں ہوتی: محبت کلیتاً ایک وہی اور صرف اپنا آپ ہوتی ہے، خواہ کسی ایک سے ہو خواہ کئی ایک سے۔ شارٹ فکشن کو بے تحفظ اپنا پورا آپ سونپے بغیر آپ کیونکر ''دی سٹون ایج''، ''مائیکل اینجلو'' اور راوی پار'' جیسے ہنستے کھیلتے ہاتھ پیر مارتے ہوئے اتنے سارے بچے پیدا کر سکتے ہیں؟۔۔۔

جوگندر پال

گلزار صاحب کے جاں نثاروں کی فوج ظفر موج کو یہ بات شاید ناگوار گذرے کہ ہمارا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو خود کو گلزار صاحب کا ناقد کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ مشکل ہماری یہ ہے کہ جب بھی ہم نے یہ خوشی حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہمیں اُس قدر کامیابی نہ مل سکی جس قدر ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری کیفیت گلزار صاحب کا نام سُنتے ہی اس شعر کی مانند ہو جاتی ہے۔

جب بھی آتا ہے میرا نام تیرے نام کے ساتھ\
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

''دینہ'' کی میونسپل کمیٹی نے ہماری شہرت کو چار چاند لگانے کے لیے ایک سڑک کا نام ہمارے نام پر رکھ کر گلزار صاحب کو پس منظر میں دھکیلنے اور ہمیں پیش منظر میں ابھارنے کی بڑی کوشش کی مگر صاحب جس شخص کا نام ''دینہ'' کے چپہ چپہ، گلی اور محلّہ محلّہ پر چسپاں ہو اُسے کون مٹا سکتا ہے۔ سو جناب اسے گلزار صاحب کی شاعری کا کمال کہیے، اُن کے افسانوں کا کرشمہ گردانیئے اُن کی فلموں کی کشش کہیے یا اُن کی شخصیت کا سحر کہ ''دینہ'' کے ہر گھر اور گھر کے مکیں میں گلزار صاحب اس طرح رہتے ہیں جس طرح عاشق کے دل میں معشوق یا مجذوب کے دل میں یادِ خدا!

سید ضمیر جعفری

گلزار کی شاعری موزارٹ کی موسیقی کی طرح محسوسات (Perception) کی شاعری ہے۔ محسوسات کا آہنگ ہی متاثر کرتا ہے۔ محسوسات اور اس کے آہنگ کے پیچھے وہ سبلائم تجربے ہیں جو اس سچائی سے آشنا کرتے ہیں کہ ''وجود'' حقیقت کے اندر سمایا ہوا ہے۔ گلزار کی نظموں میں موضوع اور فارم کے درمیان جو مطابقت یا ہارمونی (Harmony) ہے وہ روح/وجود اور حقیقت کی ہارمونی کی دین ہے۔ چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری نظموں میں ایک سنگ تراش اور ایک مصور کا ذہن کام کرتا محسوس ہوتا ہے۔ وہی ہارمونی ہے کہ جو مجسمہ سازی اور مصور کے اچھے اور دلکش نمونوں میں نظر آتی ہے۔ نظمیں اسی طرح سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں کہ جس طرح اچھی تخلیقی مصوری اور اچھے تخلیقی مجسمے کرنے لگتے ہیں۔ المیہ جذبے بھی گہرے غم کو محسوس بناتے ہوئے جمالیاتی آسودگی عطا کرنے لگتے ہیں۔ یہ گلزار کی شاعری کا سب بڑا جمالیاتی وصف ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ گلزار کے افسانوں میں شاعری لشکارے مارتی ہے اور شاعری میں افسانے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ دس بارہ سال قبل جب میں نے ان کے شعری مجموعے ''چاند پکھراج کا'' کی انوکھی سخن

سازیوں پر ایک مضمون لکھا تھا تو اس میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''رات پشمینے کی'' اس لحاظ سے کچھ مختلف ہے کہ اس میں ان کے فکر و تخیل کی زمیں زادیاں آسمان ہی نہیں خلا اور بیرونِ خلا کی حد اور حصار سے بھی آگے کا سفر کرتی نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے احمد ندیم قاسمی نے بجا طور پر انہیں اکیسویں صدی کا شاعر قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ان کے حساس مشاہدے نے ان کے اشعار کی شریانوں میں زندگی دوڑا دی ہے۔ بلاشبہ گلزار کی نظموں میں زمین کی سج، دھج اور سمندر کی روپہلی چادر کے ایسے منظر دکھائی دیتے ہیں جو ان کے معاصرین کے یہاں کہیں نظر نہیں آتے۔

ڈاکٹر قمر رئیس

گلزار نے اپنے گرد و پیش کی فضا کو کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنے ماحول کی ناہمواریوں کو درد مند دل کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ وہ جس دنیا میں جی رہے ہیں، اس سے پوری طرح باخبر ہیں اور یہی باخبری اس دنیا سے ان کی بے اطمینانی کا سبب ہے۔ میرے نزدیک اُن کے شاعرانہ جذبات و احساسات کو تحریک اسی بے اطمینانی سے ملتی ہے جس سے وہ اکثر دوچار رہتے ہیں۔ اپنے جذبات واحساسات کا اظہار وہ بول چال کی عام زبان میں کر دینے پر قادر ہیں۔ اپنے موضوعات بھی انہوں نے روزمرہ زندگی کے عام واقعات سے اٹھائے ہیں مگر ان میں وہ کچھ ایسے پہلو تلاش کر لیتے ہیں جن تک رسائی کے لیے ایک درّاک ذہن اور جزرس نظر کی ضرورت ہے۔ اپنی شاعری میں وہ اپنے انفرادی تجربات ہی پیش کرتے ہیں مگر ان کا اندازِ پیشکش انفرادی تجربے کو اجتماعی تجربے میں بدل دیتا ہے۔ وہ شاعری کی سماجی معنویت کے قائل نظر آتے ہیں مگر برہنہ گفتاری کے نہیں جو شاعری کی سماجی معنویت پر زور دینے والے بعض شعراء کا خاصہ رہا ہے۔

محمود سعیدی

گلزار کی شاعری میں نہ لفظی پیچیدگی پائی جاتی ہے نہ معنوی الجھن۔ الفاظ کا دروبست بھی ان کے یہاں پیچیدہ نہیں ہوتا۔ گلزار کا شعری رویہ نشاط آفریں رومانیت لئے ہوئے ہے۔ یہ رومانیت سراسر جمالیاتی تصورات سے نمو پائی ہوئی ہے۔ اس میں لمسیاتی لذت کوشی کا شائبہ تک نہیں۔ ایک صاف ستھرا اندازِ بیان ہے جس میں کیف پرور لمحات کی رومانی کیفیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

سید یحییٰ نشیط

گلزار کی شاعری کو کیسے اپروچ کیا جائے؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ گلزار خالصتاً فکر و دانش کے شاعر نہیں ہیں مگر دانش ان کے پردۂ فن سے جھانکتی رہتی ہے۔ وہ موضوعات و مسائل کے شاعر بھی نہیں ہیں مگر ان کی نظموں میں موضوع پنپتا اور مسئلہ ابھرتا ضرور ہے۔ روایت کا وہ احترام کرتے ہیں مگر اجتہاد و اختلاف کے ساتھ۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تقاضوں کو خاصی حد تک پورا کرنے کے باوجود ان کی شاعری ان سانچوں میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ اسی طرح کے کئی اور پہلو ان کی شاعری کے رد و قبول کے ضمن میں ابھرتے ہیں۔ شاید اسی لئے ناقدین نے ان پر کم ہی لکھا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ معروضیت پسند ناقدوں کے نہیں بلکہ منہمک ہو کر اور لطف لے کر پڑھنے والے قارئین کے شاعر ہیں۔

عبدالاحد ساز

گلزار کی ہر فلم عقل اور نظر کے ذریعے سے آدمی صرف سچائی کے باہری دائرے تک پہنچ پاتا ہے۔ سچائی کو مسلسل پانے کا راستہ صرف دل و جذبات کا راستہ ہے، بہت نرم، بیحد نازک، گلزار نے اپنے لئے یہی راستہ چنا ہے۔ معاشرتی حقیقت پسندی۔ کتابیں رٹنے اور قاعدے قانون کے خلاف نعرے لگانے کے راستے کافی آسان تھے۔ فلموں میں اس ڈھپلی بازی کی بھی کافی قیمت مل جاتی ہے لیکن گلزار نے زیادہ کٹھن راستہ چنا۔ وہ کٹھن راستہ جو دل سے ہو کر جاتا ہے، اس راستے کا کوئی نام ہے کیا؟ شاید نہیں۔۔۔ پیار ہی کی طرح۔۔۔ 'پیار کو پیار ہی رہنے دو کوئی نام نہ دو'۔

ڈاکٹر دھرم ویر

گلزار ان شاعروں اور ادیبوں سے مختلف ہیں جو کسی جبر کے تحت فلمی حلقہ میں قدم تو رکھ لیتے ہیں لیکن عمر بھر اس کی صفائی دیتے رہتے ہیں۔ گلزار کو اس کی ضرورت شاید اس لیے پیش نہیں آئی کیونکہ وہ گلیمر کی اس دنیا میں اپنی شرطوں پر جیتے آئے ہیں۔ خواہ وہ فلمی گیت ہو یا اسکرپٹ یا پھر ہدایت کاری۔ ہر جگہ انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ ان کی اس انفرادیت نے ہندوستانی سینما کو ایک نیا وژن دیا اور ناظرین کو جہانِ طلسم کے نئے ابعاد و جہات سے روشناس کرایا ہے۔

گلزار کی دلچسپیوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ادب و شعر کے ماسوا بھی ان کے شوق کی کتنی ہی جولاں گاہیں ہیں تاہم ان کی بنیادی وابستگی شعر وادب ہی سے ہے۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے تو ان کی بیشتر شاعری خصوصاً ان کی نظمیں ایک ایسی جمالیاتی وحدت کا ذریعہ رکھتی ہیں جہاں تمام بکھرے ہوئے پارہ پارہ حقائق ایک بساط پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے فکر و فن دونوں میں ایک توازن ہے اور ایک نکھرا ہوا دانشورانہ شعور ہے جو انہیں کسی بے ربطی کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا۔

اشعر نجمی

گلزار کی غزل کا جو رخ سب سے پہلے متاثر کرتا ہے وہ الفاظ کی سادگی اور سادہ کاری اور اندازِ بیان، لہجہ اور اسلوب کی معصومیت ہے۔ آپ غور کریں اور آگے چل کر معنویت کی سطح کو پالیں لیکن پہلی نظر میں آپ اس سادگی کے قتیل ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں یہ سادگی روایتی سادگی اور سہل الممتنع والی کیفیت نہیں بلکہ اس سادگی میں ایک تیکھا پن اور بانک پن ہے۔ اس طرح گلزار کی شخصیت اور اُن کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس شخصیت اور انفرادیت کی تشکیل و تزئین میں وہ اعلیٰ، شستہ شعری اور ادبی اقدار شامل ہیں جو

کبھی میر، کبھی غالب اور کبھی فیض کی یاد دلاتی ہیں لیکن جو نہ میر کی نہ غالب کی اور نہ فیض کی۔ یہ روایات گلزار کی اپنی ہیں۔ شاعر نے کلاسیکل شعرا سے اخذ و استفادہ کرتے ہوئے اپنی شاعری کی دنیا آپ آباد کی ہے۔ اور ایسے کمالِ فن کے ساتھ کہ فضا سحر آگیں ہو جاتی ہے اور پھر جیسے جیسے غور کرتے جائیں گے معنوی طور پر ایک وسیع منظر نامہ آپ کے سامنے آتا جائے گا۔

سلیمان اطہر جاوید

گلزار کی پہچان ایک شاعر کی حیثیت سے ہے۔ اسے شاعر کہلوانا اور شاعر کہنا ہی زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بمبئی کے جنت بدوش نظاروں نے اسے ہوا میں گرہ لگانے کا ایک ایسا گُر سکھایا ہے کہ وہ بمبئی پر چھا گیا ہے یا یوں کہیے کہ ''آمچی ممبئی'' اس پر چھا گئی ہے اور اب وہ ایک عجیب روح ہے، شاعر ہے، افسانہ نگار ہے، پروڈیوسر ہے، مکالمہ نگار ہے، ہدایت کار ہے، دانشور ہے، محبوب ہے اور ایک فنکار ہے۔ نہیں ہے تو بس سیاست داں نہیں ہے، نہ فل ٹائم نہ پارٹ ٹائم۔

اسد مفتی

''دورِ حاضر میں، اردو زبان کی حد تک، گلزار سے زیادہ اوریجنل شاعر میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی شعری لفظیات، اسکی تشبیہات، اس کے استعارے، اسکے موضوعات سب اردو کے ماضی اور حال کی شاعری سے اسقدر مختلف ہیں کہ روایت کے تسلسل کی حقیقت اٹل ہے کہ شاعر روایت سے بغاوت کا ہزار دعویٰ کرے وہ اپنے وجود کو منوا کر چھوڑتی ہے۔ مگر ادھر گلزار ہے کہ اسکی غزل تک میں روایت کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا۔ چہ جائیکہ اسکی نظم، جس کے انداز و اسلوب کی کوئی مثال، میرے مکالمے اور یادداشت کی حد تک، اس صدی کی اردو شاعری میں دستیاب نہیں ہے''۔

ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر

گلزار ایک ایسا ہمہ صفت، ہمہ جہت اور متنوع پرتوں والا فنکار ہے جس کی پیشوائی اور پذیرائی کے لیے ساتوں فنون لطیفہ کے بیشتر دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ شعری اصناف میں نظم ہو یا غزل، گیت ہو یا تروینی۔ فکشن میں افسانہ ہو یا ڈرامہ۔ فلم میں کہانی ہو یا مکالمہ نویسی، منظر نگاری ہو یا ہدایت کاری، محولا بالا تمام شعبوں میں اس کی ندرت فکر، منفرد اسلوب اور جداگانہ انداز سے معاصرین سے ممتاز اور منفرد کرتے ہیں۔ گلزار کے زرخیز ذہن سے پھوٹنے اور عملی شکل اختیار کرنے والا فن پارہ اس درجہ دلکش ہوتا ہے کہ سامع، قاری یا ناظر اس کو رک کر، سن کر اور بغور مطالعہ اور ملاحظہ کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ بقول حافظ:

زِ فرق تابہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

حسن عباس رضا

گلزار کی باتیں صرف شاعری ہی نہیں، کہانیاں بھی ہیں۔ کہانیاں اس نے لکھی بھی ہیں، فلمائی بھی ہیں۔ اس کی کہانیوں میں وہ سب باتیں ہیں جو انسان کی زندگی میں ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں میں زندگی کا ہر رنگ نمایاں ہے، سنگیت کے سُر ہیں، درد کی کسک ہے، رشتوں، نفرتوں اور محبتوں کا حساس جذبہ ہے یعنی وہ ساری ہی باتیں ہیں جو زندگی میں ہوتی ہیں یا زندگی کے الگ الگ کرداروں، روپ اور رنگ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ چھوٹے بڑے ہر طرح کے لوگوں کی باتیں کرتا رہے گا۔ بچوں کی باتیں، عورتوں، مردوں، جوانوں اور بوڑھوں کی باتیں۔ زندگی کے نشیب و فراز اور واقعات کی باتیں۔ خوبصورت اور بدصورت کرداروں کی، محبتوں اور نفرتوں کی باتیں۔ گلزار کی باتوں میں عورت اور مرد کے باہمی رشتوں کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اس نے مذہبی جنون، فسادات، دہشت گردی اور ان کے ردِعمل کو نہایت ہنرمندی اور حساسیت سے بیان کیا ہے۔ یعنی گلزار کا قلم صحیح معنوں میں زندگی کا سرگم ہے۔ زندگی کی مکمل کتاب ہے جس کے ہر سُر میں، ہر ورق میں دھڑکتا ہوا دل اور جاگتا ہوا درد ہے۔ درد زندگی کا، بندگی کا، خوشی کا۔

ڈاکٹر کیول دھیر

''دھواں'' گلزار کے ستائیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ چند افسانوں کو چھوڑ کر ان میں کوئی بھی افسانہ چار چھ صفحات سے زائد کا نہیں ہے جس سے ایک تاثر تعجیل کا بھی ہو سکتا ہے جسے لکھنے والے نے ایک ہی نشست میں کسی خاص کیفیت میں قلم برداشتہ لکھ ڈالا ہو۔ ہر کہانی کسی اخباری روداد کی طرح کفایت لفظی کے علاوہ وحدت تاثر کی حامل بھی ہے۔ کہیں کہیں ہم کو چونکا دینے والا انداز بھی ملتا ہے اور کہیں ہم کہانی پڑھ کر ''اچھا'' اور ''بہت خوب'' کہہ کر بات ختم کر سکتے ہیں لیکن بیان واقعہ یا یہی اختصار ان کے فن کا ایک مضبوط پہلو بھی ہے جس کی وجہ سے ہم گلزار کو ایسا کہانی کار تسلیم کرنے پر مجبور ہیں جو مختصر افسانے کی بنیادی تعریف سے نہ صرف یہ کہ واقف ہے بلکہ اس کو برتنے کا بھی سلیقہ رکھتا ہے۔

قیصر تمکین

جب ہم گلزار کو ان کی فلموں کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کے چند عظیم فلم کاروں کی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وی۔ شانتارام، بمل رائے، محبوب خان اور ستیہ جیت رائے وغیرہ ہندوستانی فلم سازی اور ہدایت کاری سے جڑے یہ چند ایسے نام ہیں جنہیں فلموگرافی یا فلم کی تاریخ میں بامقصد، معیاری اور اصلاحی فلموں کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ فلم انڈسٹری اس بات سے اتفاق کرے یا نہیں کرے، مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی قباحت نہیں کہ گلزار کا قد بھی ان شہرۂ آفاق فنکاروں سے کسی بھی درجہ کم نہیں ہے۔ اس کا ایک واضح سبب جو فی الفور میری سمجھ میں آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ گلزار صرف فلم ساز، ہدایت کار یا نغمہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک کہانی کار بھی ہیں، ایک سلجھے ہوئے بلند پایہ کہانی کار۔

گلزار کا شمار دور جدید کے چند اہم بین الاقوامی سطح کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے اندر کے ادیب نے ہی انہیں

ایک ذمہ دار فلم ساز اور ہدایت کار کے روپ میں جنم دیا ہے۔ادب سے گہری وابستگی کے باعث ہی ان کا رجحان اپنے فلمی کیریئر کے ابتدائی دور سے ہی بامعنی فلموں کی طرف رہا ہے اور انہوں نے ہمیشہ اپنی فلموں کے ذریعے کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔

مراق مرزا

گلزار کا فلمی سفر سبق آموز بھی ہے اور تابناک بھی۔گلزار کا شمار اب فلمی دنیا کے مفکر ہدایت کاروں میں ہوتا ہے۔جیسے مرنال سین، شیام بینگل، اور اب گوتم گھوش، بدھادیب داس گپتا، اپرنا سین۔یہ سارے فلم ساز اور ڈائریکٹر سماجی حقیقت پسند اور انسان نواز ہیں۔گلزار بھی یہی ہیں جیسا کہ میں نے کہا اور ان سب کی موجودگی آج کی تیز طرار کمرشیل فلمی دنیا میں غنیمت ہے۔

انیس رفیع

گلزار کا فن اور شخصیت ایک دوسرے سے الگ نہیں اور جب ہم اس امتزاجی روپ کے تعلق سے اپنی عقل و دانست سے شکست کھا جاتے ہیں تو اس کو پوری طرح سمجھنے کا خیال بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔شاید میں نے کسی طویل ترین کتاب کی ایک سطر سے بھی کم اسے سمجھا ہو۔اس کئی سمتوں والے انسان کی اگر ایک سمت بھی پکڑیں تو راستے میں دس موڑ آ جاتے ہیں، پراسرار سے موڑ۔خاموشیوں کی آواز نئی بات نہیں، کئی لوگ سنتے ہیں۔لیکن میں نے ایک دوبار گلزار کی آواز والفاظ کی روانی کے اردگرد گہری خاموشیوں کو محسوس کیا۔یہ کون سی سمت تھی جہاں اس تجربے سے سامنا ہوا؟ محسوسات کے لیے کچھ ہونا ضروری ہے، وہ کیا تھا؟ نہ تو میں سمجھ سکی نہ دیکھ سکی۔گلزار کی شاعری پر کچھ لکھنا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔جو شاعر اپنی شاعری کو اس طور پر مجسم کرتا ہو جسے میں ہنستے بولتے چلتے پھرتے دیکھتی ہوں، اس کی سانسوں کو، دھڑکنوں کو اپنے الفاظ سے چھونا آسان نہیں۔

فرزانہ رضوی

گلزار سے کلائمیکس کی کہانیوں کے ٹیلی اسکرپٹس کی تعریف سنتے ہوئے میں نے ایک اور گلزار کو دیکھا۔اسے پایا۔وہ گلزار جو محفل میں نظر آتا ہے، وہ نہیں، وہ جو ٹی وی کیمروں کے سامنے آتا ہے، وہ نہیں۔ہاں۔۔۔وہ جو اپنے قریبی لوگوں کے بیچ ہنستا کھیلتا ہے۔وہ گلزار......میں نے ان کے بیڈروم میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر وہ کاغذ بھی دیکھے جن پر کچی پنسل سے کچھ اَدھ لکھے گیت بھی تھے جو میں نے پڑھے، اپنی بھیجی ہوئی کتابیں اور ڈراموں کے کیسٹ بھی الماریوں میں سجے دیکھے۔وہ مجھے اپنی کتابوں کے شیلفس میں سے چیدہ چیدہ کتابیں نکال کر دے رہے تھے اور میں اُن سے کہہ رہا تھا:

''سر! میری ملاقات تو اب ہوئی ہے آپ سے!''

ایوب خاور

مجھے تسلیم کہ گلزار جی نے شاعری اور ادب میں جو اپنا مقام بنایا وہ انہی کی پہچان ہے کہ گلزار ایک ہی ہیں۔انہوں نے ہر حیثیت میں خود کو تسلیم کروایا۔وہ سوچ کو آسمان میں کسی گیند کی مانند اچھالتے ہیں۔گیند زمین تک آتے آتے محض سوچ نہیں رہتی بلکہ لفظوں کا روپ دھار لیتی ہے اور پھر یہ الفاظ کے کوٹ کے اندر والی جیب میں مہارت سے معانی چھپا دیتی ہے۔کبھی کبھی مجھے وہ جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں نئے الفاظ، تراکیب ضرور آئیں مگر انہوں نے ان کی شناخت کو پختگی بخشی۔بدلتے حالات کے ساتھ گلزار جی نے خود کو اس حد تک نہیں بدلا کہ کوئی انہیں پہچاننے میں الجھ جائے......فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ یہ گیت انہوں نے لکھا ہے۔کبھی کبھی یکسانیت کا احساس بھی ہونے لگتا ہے مگر کسی نئی فلم میں وہ پھر ایک نئے انداز کے ساتھ سامنے آ جاتے ہیں۔

عکس انور

گلزار آئے تو درد کا احساس لئے، اور جب گئے تو اُس نمازی کی طرح جس کو نماز پڑھ کر ایک ابدی سکون مل گیا ہو۔۔۔سارے ماحول پر عقیدت کا رنگ نمایاں تھا، کہ یہ قدرت کا ایک خاص کرشمہ ہے۔گلزار صاحب کا اپنے وطن آنا، بابا سے ملنا، اور بابا کا صحت مند ہونا، یہ تمام قدرت کے مظاہر تھے جن کا بھید صرف اُسی کے پاس ہے۔وہ ایک لمحہ جو وقت کی قید سے آزاد ہو گیا تھا، وقت شائد کبھی بھی اُسے قید نہ کر پائے کیونکہ محبت اور عقیدت کو کبھی قید نہیں کیا جا سکتا۔قدرت اپنی اکثر تخلیقات میں خود توحید کی قائل دکھائی دیتی ہے، جیسے سورج، چاند، نصرت فتح علی خاں، نور جہاں اور۔۔۔گلزار صاحب۔

شہزاد رفیق

ایک بات تو صاف ہے کہ گلزار زندگی کا مشاہدہ بلوریں ایوانوں سے نہیں کرتے بلکہ ایک ہمدرد انسان کی مانند ریل گاڑیوں اور جھونپڑیوں میں اس کا سامنا کرتے ہیں۔انہیں اپنے کرداروں سے جذباتی لگاؤ ہے۔وہ انہیں نکیل لگا کر اپنے پیچھے نہیں چلاتے بلکہ ان کے ہمراہ چلتے ہیں۔ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔گلزار نے دوسری زبانوں خاص کر پنجابی کے الفاظ کا بھی برمحل استعمال کیا ہے اور یہ اردو کی ترقی کے لیے خوش آئند بات ہے۔ان کے افسانے مختصر ہوتے ہیں اور وہ کسی بھی صورت میں اپنے قلم کو بھٹکنے نہیں دیتے۔

دیپک بُدکی

مجموعی طور پر گلزار کی کہانیاں سکّہ بند نظریات سے دامن کشاں ہیں۔ان میں کہیں کہیں ترقی پسندی یا پھر جدیدیت کے کچھ اثرات تو ضرور ملتے ہیں لیکن دونوں میں سے کسی سے کوئی باضابطہ انسلاک نہیں پایا جاتا۔وہ نہ صرف بیانیہ کے تقاضے پورا کرتی ہیں بلکہ کسی حد تک علامتی اور استعاراتی صَرف کا بھی ثبوت فراہم کرتی ہیں۔انہیں محسوس ہوا کہ عصری انسانوں میں کردار سازی، تجسس اور فضا آفرینی جیسی فنی خصوصیات پر توجہ کم دی جا رہی ہے۔لہٰذا انہوں نے اپنی برسوں کی ریاضت کو انہی تین حوالوں سے ہم رشتہ کیا اور تخلیق کے

بہترین نمونے پیش کیے۔

مقصود دانش

گلزار کے گیتوں میں پکار سے زیادہ اکیلی آواز کی گونجیں ہیں۔ شاید کسی آواز پرست نے کبھی غور کیا ہو کہ دوسرے گیت کاروں کی بہ نسبت ان کے گیتوں میں آلۂ بازگشت (echo mike) زیادہ استعمال ہوا ہے۔ اُن کے گیتوں سے اُن کی ساز آشنائی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اگر ساحر کے گیت موسیقی کو شعریت میں شرابور کرتے ہیں تو گلزار کی گیتا سنگیت کا رس پی کر فضا میں اپنا جوبن ابھارتی ہے۔ ان کے پرانے گیتوں کو یاد کیجیے جن کا ''لفظی آلاپ'' ہی سماعت کے موسم بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ مثلاً برہا کا گیت ''بیتی نہ بتائی رینا.....'' کے بول ستار کی ذراسی کنمناہٹ کے ساتھ من کے اندر کے پٹ کھول دیتے ہیں۔ یا ''اس موڑ سے جاتے ہیں.....'' اور ''تم آ گئے ہو نور آ گیا ہے.....'' کے اوس میں بھیگے ابتدائی سُروں کو محسوس کریں۔ یقیناً یہ سنگیت کار کی جادوگری ہے لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سنگیت کار موسیقی کے موڈ میں کتنا محو ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہی موسیقار دوسرے گیت کاروں کی سنگت میں ایسے گُل نہیں کھلا سکا۔ گلزار کے سبک اور نازک گیتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ سنگیت کی جھیل میں تیرتے نظر آتے ہیں۔ یوں تو سنگیت کے سات سُر ہوتے ہیں لیکن میں کہوں گا کہ بول خود بھی ایک سُر ہیں.....!

ف۔س۔اعجاز

گلزار کے افسانوں میں ایک اہم خوبی پائی جاتی ہے جو اکثر ان کے پیش رووں میں پائی جاتی تھی وہ یہ کہ افسانے کی عمدہ شروعات اور اس کا غیر معمولی خاتمہ۔ منٹو نے اپنے افسانوں کے بارے میں کہا تھا کہ ''افسانہ شروع آپ کیجیے ختم تو میں کرواؤں گا''۔ گلزار کے افسانوں کی ابتداء آپ کو مسرت سے دو چار کر دیتی ہے اور انتہا حیرت و بصیرت پر لے جاتی ہے اور یہی ان کے افسانے کا عطر ہوا کرتا ہے۔ گلزار کے افسانوں کی چوتھی خوبی جو ذاتی طور پر مجھے متاثر کرتی ہے وہ یہ کہ آج جبکہ اردو کا نیا افسانہ بڑے بڑے شہروں کی مشینی زندگی میں گھر کر رہ گیا ہے وہیں گلزار کے افسانے دیہات، قصبات کی کھلی آب و ہوا میں رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ گلزار کے ادھا، عمدو، خیرو گھسیٹا، چکو، ڈلیا، جھبا، مہکو، جیسے کردار نئے افسانوں میں نظر نہیں آئیں گے یا خال خال نظر آئیں گے۔ گلزار نے انہی کرداروں اور ان کے مسائل و ماحول سے ایک جہاں آباد کیا ہے۔ تخلیق کا حق اور اپنے قلم و ذہن کا فریضہ ادا کیا ہے۔ وہ افسانے کا فن اور اس کی تاثیر پر دسترس رکھتے ہیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

''چہارسُو'' کے گل و گلزار یعنی گلزار جاوید نے ''محفلِ گلزار'' سجا کر ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ سو جان سے اُس پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ پھول جس رنگ اور موسم کا ہو انسانی احساسات پر ہمیشہ خوشگوار اثرات مرتب کیا کرتا ہے۔ گلزار صاحب کی شخصیت پھولوں کے اُس گلدستے کے مماثل ہے جس میں ہر رنگ، ہر موسم، ہر مزاج اور مزاق کے پھول وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ اُن کی شخصیت اس قدر ہمہ رنگ اور ہمہ جہت ہے کہ کوئی تن تنہا شخص اس کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ میں بھی اس بھاری پتھر کو چومنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہیں کروں گا بلکہ گلزار صاحب کی صحت و سلامتی اور شادکامی کے لیے وہ تمام دعائیں نذرانہ کے طور پر پیش کروں گا جو کسی بھی خاکی انسان کی دسترس میں ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

اگر میں خالص طب کا آدمی ہوتا تو خود کو صرف اس لئے بدقسمت تصور کرتا کہ میں گلزار صاحب جیسے صاحبِ صفت و صفا تخلیق کار سے محروم رہا۔ گلزار صاحب نے علوم و فنون کی تمام اصناف میں اس قدر کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ اُنہیں کسی بھی ایک یا ایک سے زائد شعبوں سے منسوب کرنا گلزار صاحب سے نہیں خود اپنے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔ گلزار صاحب نے ''نیچر'' کو جس جس طریقہ، جس جس زاویے اور جس جس طور پر برتا ہے اُس سے کم از کم اردو ادب بہت عزت یاب ہوا ہے۔ چہارسو کی جانب سے گلزار صاحب کی عزت افزائی اردو ادب کی اپنی عزت افزائی ہے جس کے لیے ہر دو گلزار مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم

ایک انوکھی روحانیت اور بیگانے پن کی آمیزش کے باوجود گلزار کی کویتائیں عام آدمی سے مکالمے میں اپنی پہچان ڈھونڈتی ہیں۔ یہی بات اُن کی شاعری میں ایسا رنگ بھرتی ہے، جو ہندوستانی زبان میں نظم لکھنے والے دیگر معاصرین سے اُنہیں بالکل الگ کرتی ہیں۔ ایک حد تک ہم یہ بات آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ نہایت عام زندگی جینے والے سماج کی چوکھٹ پر جا کر گلزار کی کویتا اپنی بلندی پاتی ہے۔ یہ یگانگت اور ارتقاء گلزار کی پوری زندگی اور اُن کے انیک دوسرے کاموں میں آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔

گلزار کے یہاں ایک تو ایسے گھریلو اور روزمرہ کی زندگی سے نکلنے والے پیکر ملتے ہیں، جو اُن کی کویتا کو ایک طرح کی نوسٹیلجیا پوئٹری (Nostalgia Poetry) میں تبدیل کرتے ہیں، تو کچھ دوسرے خالص مولک قسم کے ایسے انوکھے پیکر بھی ملتے ہیں جو اُن کی شاعری کو کبھی رُومانی، کبھی جادوئی، کبھی صُوفیانہ قسم کا لمس دیتے ہیں۔ وہاں پھر اس بات کی شناخت یا فرق کر پانا مشکل ہو جاتا ہے کہ نہایت معمولی آدمی کی زندگی سے وابستہ نظمیں یکا یک کس طرح صوفیانہ موڈ پکڑ لیتی ہیں۔ اُس لمحے ان کی کویتا کبھی غالب کی گلیوں سے گزرتی ہوئی دِکھائی دیتی پڑتی ہے، تو کبھی بنارس میں گنگا کے گھاٹ پر کبیری ٹھاٹ اُوڑھے ہوئے نظر آتی ہے۔

یتیندر مشرا

☆

''انتہائے کرم''

نعتِ رسولِ مقبولؐ

جہاں فضا کا مقدّر بنی ہوائے کرم
وہیں سے اوڑھ کے آئی ہوں میں ردائے کرم

وہ جانتے ہیں ہمارا مرض بغیر کہے
وہ سُن رہے ہیں ہر اک درد کو برائے کرم

بھری ہوئی ہیں مرادوں سے جھولیاں اُن کی
مسافرانِ مدینہ ہیں آشنائے کرم!

مرے نصیب کا حصّہ ہے یہ مسرّت بھی
کہ رحمتیں مجھے ڈھونڈیں، مجھے بُلائے کرم

کرم کی آس لئے، دیر سے دعا میں مگن
ہے انتظار میں گُم، دیکھئے گدائے کرم

مدینہ آ کے کھلا ہے کہ رحمتیں کیا ہیں
یہیں پہ آ کے نظر آئی انتہائے کرم

پُکارتی ہے مدینے میں شوق کی شِدّت
ہمارے پیار کا مرکز، ہماری جائے کرم

نورین طلعت عروبہ
(راولپنڈی)

نعت

رہے مَوجزن دِل میں اُنؐ کی محبت
زباں پر رہے بس اُنہیؐ کی حکایت
خیالوں میں بَس جائے یُوں اُنؐ کی صورت
مُیسّر ہو خوابوں میں اُنؐ کی زیارت
رہے خلوتوں میں اُنہیؐ کا تصوّر
رہے خلوتوں پر اُنہیؐ کی حکومت
شبستانِ جاں میں دَر آئے وہ جلوہ
کھُلے جس سے سالک پہ رازِ حقیقت
ہو تابندہ تَر اِس قدَر زِندگانی
کہ چھٹ جائیں سارے حجاباتِ ظلمت
چلا پائے یوں زندگی کا تصوّر
مِلے اُس سے سالک کو سِرِّ معیَّت
حجابات کی ضدہے کیفِ تقرّب
تقرّب ہے معراجِ عشق ومحبت
مَعیَّت عبارت ہے قربت سے اُنؐ کی
تقرّب کی معراج ہے یہ مَعیَّت
مَعیَّت محبت کی معراج بھی ہے
مَعیَّت ہے کیا صرف احساسِ قُربت
مَعیَّت عطا میرے آقاؐ کی ہے بَس
یہ منزل بھی سالک کی ہے ایک حالت
رہے ذکر اُن کی عطاؤں کا جاری
کہ سالک پہ لازم ہے تحدیثِ نعمت
مدار اس کرم پر ہی ہے زندگی کا
شفیقؔ اس سے وابستہ ہے رازِ اُلفت

شفیق احمد فاروقی (مدینہ منوّرہ)

دلدل

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

''**ہیلو۔۔ہیلو۔۔۔آپ کون۔۔؟**''ارے!فون رکھ دیا۔۔فر حین نے فون کی طرف دیکھا۔فون بند ہو چکا تھا۔اس نے جلدی سے قلم اور ڈائری اٹھائی اورابھی فون پر جو کچھ بات چیت ہوئی وہ لکھنے لگی۔اے۔۶۱۔۔۔ مگر یہ کالونی۔۔۔اس کا نام تو پہلے کبھی نہیں سنا،کالونی کا نام لکھتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔۔خیر!۔۔۔۔یہ کہہ کر اس شخص کی مزید Informationوہ ڈائری میں درج کرنے لگی۔

''یہ جو کچھ اس شخص نے بتایا کیا یہ سب سچ ہے۔۔۔یا پھر۔۔۔؟

''فرحین اس فون کال پر کافی دیر تک غور کرتی رہی۔کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے احسن کا نمبر ملایا۔

''احسن کیا کررہے ہو۔کیا تم ابھی آسکتے ہو۔کچھ ضروری کام ہے۔؟''

''کیوں کیا پھر کسی مہم پر نکلنا ہے۔۔۔؟''احسن نے ناگواری کے ساتھ پوچھا۔

''پہلے تم آجاؤ پھر بات ہوگی،کیمرہ وغیرہ سب ساتھ لانا۔''کہہ کر فرحین نے فون رکھ دیا اور گہری فکر میں ڈوب گئی۔

''کبھی کبھی تو چھٹی نصیب ہوتی ہے وہ بھی تمہیں پسند نہیں آتی۔'' احسن کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''میرے پاس ابھی ابھی ایک فون کال آئی تھی،فون پر میری اس شخص سے جو بات ہوئی اور جو Informationحاصل ہوئیں میں نے سب ڈائری میں درج کرلی ہیں۔''یہ کہہ کر فرحین نے احسن کی طرف ڈائری بڑھادی۔

''یہ کالونی تو بہت دور ہے تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو۔''احسن نے ایڈریس دیکھ کر کہا۔

''شکر ہے تم سے یہ تو پتہ چل گیا کہ ایسی کوئی کالونی موجود ہے، ورنہ میں نے تو سوچا تھا۔۔۔۔۔''فرحین تھوڑی مطمئن ہوئی۔

''یہ فون کال کسی سازش کا پیش خیمہ بھی ہوسکتی ہے،تم نے اخبار میں جو تازہ آرٹیکل چھپوایا ہے اس میں بڑے بڑے پردہ داروں کی جانب اشارے ملتے ہیں۔''احسن نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اس شخص نے میرے اس آرٹیکل کا حوالہ بھی دیا تھا۔''کہہ رہا تھا میں پڑھ کر بہت متاثر ہوا ہوں اگر آپ جیسے لوگ اس طرح چہروں کو بے نقاب کرتے رہے تو ہمارا معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن جائیگا۔''

فرحین ایک فری لانس صحافی تھی۔اس کا اپنا ایک انداز تھا،ایک سوچ تھی،ایک مشن تھا،وہ ایمانداری اور محنت میں یقین رکھتی تھی احسن اس کا دوست تھا،کیمرہ مین تھا،اورشاید باڈی گارڈ بھی۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ فرحین کسی مصیبت میں پھنس جائے۔چند روز قبل دونوں ایک مشکوک شہرت زمیندار کا انٹرویو لینے گئے ،وقت مقرر کیا جا چکا تھا،جب وہ زمیندار کی حویلی پہنچے،گیٹ پر چار مسلح گارڈز تعینات تھے۔فرحین نے کارڈ دکھایا اور بتایا کہ ہم لوگوں نے وقت لیا ہے زمیندار صاحب سے ملنے کے لئے۔

ایک گارڈ نے فون پر زمیندار صاحب سے پوچھا،پھر گیٹ کھولا گیا اور اوران کی گاڑی کو اندر لے جانے کی اجازت ملی۔گاڑی کو پارکنگ شیڈ میں کھڑی کرنے کے بعد وہ دونوں حویلی کے اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔حویلی چاروں اُور باغات سے گھری ہوئی تھی۔پھولوں کی بھینی بھینی مہک تمام ماحول کو سرشار کئے ہوئے تھی۔احسن حویلی اوراس کے ماحول کو کیمرے میں محفوظ کررہا تھا۔فرحین اس کے ساتھ ساتھ تھی۔چلتے چلتے ان کی نظر پڑی،انہوں نے دیکھا درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔وہ ان سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔وہاں دیکھا ایک بڑا سا ہال تھا،انہیں اس ہال کا دروازہ جیل کے دروازوں کی طرح لگا۔دونوں نے اس ہال کے اندر سے ایسا شور سنا جیسے کچھ لوگ نالہ وفریاد کررہے تھے۔ابھی فرحین اوراحسن ہال کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ دو آدمیوں نے ان پر حملہ کردیا،احسن کو جو اس ہال کے اندر قید خواتین کی تصویریں لے رہا تھا،بری طرح مارا پیٹا،بڑی مشکلوں سے اس نے اپنا کیمرہ بچایا۔پھر وہ فرحین کو اوپر گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے،احسن بھی فرحین کے پیچھے لگا چلا گیا۔وہ لوگ فرحین کو ایک گاڑی میں ڈالنا چاہتے تھے،فرحین اوراحسن چیخ چیخ کر ان لوگوں کو بتارہے تھے کہ خود زمیندار صاحب نے انہیں ملنے کے لئے وقت دیا ہے۔بلایا ہے۔مگر وہ لوگ بے حد مشتعل تھے کچھ کہنے سننے کے روادار نہیں لگتے تھے۔

''ارے بابا۔۔!یہ شور کیسا ہے۔۔یہ سب کیا ہورہا ہے۔۔۔؟''

زمیندار کی آواز آئی۔زمیندار صاحب موقع پر پہنچ گئے تھے۔وہ دونوں آدمی با ادب کھڑے ہوگئے۔فرحین اوراحسن کی اگر چہ بری حالت تھی پھر بھی ہمت کر کے فرحین نے اپنا کارڈ دکھایا اور بولی۔

''سائیں آپ سے وقت لیا تھا۔''

زمیندار صاحب نے کارڈ لے کر ایک نظر کارڈ پر ڈالی پھر ان دونوں کو دیکھا اوراپنے آدمیوں سے بولے:

''بابا یہ ہمارے مہمان ہیں تم لوگوں نے کیا حالت بنائی ہے ان کی۔ان کو مہمان خانے میں لے جاؤ،فوراً ڈاکٹر کو بلا کر ان کی مرہم پٹی کرواؤ اوران کی خاطر تواضع کرو۔''اب جو فرحین نے کسی نئی مہم پر جانے کا سلسلہ کیا تو زمیندار والا واقعہ احسن کی آنکھوں کے سامنے آگیا وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔''فرحین نے کہا۔
''یہی کہ کیا کرنا چاہئے۔''احسن نے جواب دیا۔
''فرحین نے اپنی ڈائری اور دوسری ضروری چیزیں پرس میں رکھیں اور کہنے لگی ''ہمیں چلنا چاہئے۔۔۔دیر ہورہی ہے۔''
''تم نے فیصلہ کرلیا!''احسن حیرانی سے بولا۔
''ہاں بھئی، اب اٹھ جاؤ۔''فرحین یہ کہتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔
''تم اپنی موٹر بائیک یہیں چھوڑ دو۔ہم گاڑی میں چل رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے فرحین گاڑی میں بیٹھ گئی۔احسن دوسری طرف سے آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
''تو! آج گاڑی میں چلا رہا ہوں''احسن ہنستے ہوئے بولا۔کیونکہ وہ جانتا تھا فرحین اپنی گاڑی کسی کو چلانے نہیں دیتی۔
''راستہ جو تمہیں معلوم ہے۔''فرحین نے کہا۔
''ارے واہ! موسم کتنا اچھا ہو گیا ہے۔ہلکی بوندا باندی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔کیوں نہ ہم سمندر کی سیر کو چلیں۔''احسن موسم کی خوبصورتی دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولا۔
''موسم کے مزے لینا چھوڑو گاڑی چلاؤ اگر بارش تیز ہوگئی تو گھر ڈھونڈھنا مشکل ہوجائے گا۔''فرحین بولی۔
تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے۔
''کالونی کا پتہ تو صحیح بتایا اس شخص نے اب گھر بھی مل جائے۔''
احسن نے گاڑی سے اتر کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔آبادی بہت کم تھی، مکانات دور دور تھے۔جگہ کافی سنسان تھی۔جلد ہی یہ لوگ اس مکان تک پہنچ گئے جس کا پتہ فون کال کرنے والے نے بتایا تھا۔ایک خوبصورت تختی گیٹ کے برابر آویزاں تھی۔جس پر'' A-61 ''لکھا تھا۔
فرحین نے گھنٹی بجائی، پچیس چھبیس سال کے ایک شخص نے گیٹ کھولا ،فرحین اور احسن کو کھڑا دیکھ کر فوراً ہی گیٹ بند کرنے لگا۔اسے شاید کسی اور کا انتظار تھا ۔لیکن احسن ایک جھٹکے سے گیٹ کے اندر ہوگیا اور فرحین اس کے پیچھے پیچھے۔
''آپ لوگ کون ہیں۔اور اس زبردستی کا کیا مطلب ہے۔۔۔؟''
اس شخص نے درشت لہجے میں پوچھا۔
''ہم لوگ میڈیا سے ہیں۔''فرحین نے جواب دیا۔
وہ شخص گھبرا سا گیا لیکن اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا''یہ شریف لوگوں کا گھر ہے آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔''
احسن نے پیچھے سے اس کا کالر مضبوطی سے پکڑا، اس کو دھکا دیتے ہوئے آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا،فرحین اس کے قدم بہ قدم چل رہی تھی۔سب سے پہلے ایک بڑا سا کمرہ پڑا جو شاید ڈرائنگ روم تھا،خوبصورت قیمتی فرنیچر سے آراستہ اسکے بعد لابی سے گزرتے ہوئے کمروں تک پہنچے، تین بیڈ رومس جو بہت نفاست سے سجائے گئے تھے۔آخری کمرے میں ایک لڑکی بیڈ پر گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔احسن ابھی تک اس کے کالر کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا ۔لڑکی ان لوگوں کو دیکھ کر گھبرا گئی۔تیزی سے اٹھکر بیٹھ گئی اور جھٹ پٹ اپنے دوپٹے سے اپنے پورے چہرے کو ڈھانپ لیا سوائے آنکھوں کے اور بولی۔
''ارشد یہ کون لوگ ہیں۔''؟
''ہم لوگوں کا تعلق میڈیا سے ہے۔غلط کاموں کی نشاندہی کرنا، انہیں دنیا کے سامنے لانا ہمارا کام ہے، تاکہ ایسے تمام غلط کاموں کے راستے بند ہوجائیں۔''فرحین نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔
یہ سن کر لڑکی نے رونا شروع کردیا۔''رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔فرحین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تمہیں میرے سوالات کے جوابات دینا ہوں گے۔''
''تم کون ہو اور یہاں تک کیسے پہنچی ہو۔؟''
''میرا نام سارہ ہے میری ایک دوست نے یہ کہہ کر کہ تمہیں ایک اسٹیج شو میں ایکٹنگ کرنا ہے۔اور ایکٹنگ بھی وہ لوگ خود ہی سکھاتے ہیں مجھے اس آدمی کے ساتھ جانے کو کہا تھا۔میں پیسوں کی لالچ میں اسٹیج شو میں کام کرنے کے لئے تیار ہوگئی اور ارشد کے ساتھ ہوگئی، وہ مجھے اس جگہ لے آیا جہاں میں آج ہوں۔یہاں پہنچ کر مجھے پتے چلا کہ میں تو گناہوں کے دلدل میں دھکیلی جارہی ہوں۔مگر میں اپنے آپ کو بچا نہ سکی۔ایک سال سے میں یہی کچھ کررہی ہوں ۔۔۔''لڑکی نے پھر رونا شروع کردیا۔
''پولیس!''پولیس موبائل کی آواز سن کر ارشد گھبرا کر بولا۔
''میں نے پولیس بلائی ہے۔''احسن نے درشت آواز میں کہا۔
ارشد نے احسن کے ہاتھ سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ لیکن پولیس کے سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا۔
''آپ لوگ ارشد کو لے کر پولیس اسٹیشن چلیں۔ہم بھی اس لڑکی کو لے کر پہنچتے ہیں۔وہیں اسکا بیان قلمبند ہوجائے گا''احسن نے اے۔ایس۔آئی سے کہا جو پولیس پارٹی کو کنٹرول کررہا تھا۔''
لڑکی فرحین اور ارشد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی، تھوڑی تھوڑی دیر سے رونا شروع کردیتی۔فرحین نے لڑکی سے کہا''سب سے پہلے تم رونا بند کرو۔ اور مجھے یہ بتاؤ کیا تم یہ سب کچھ چھوڑ کر نیک زندگی کی طرف آنا چاہتی ہو۔''
لڑکی نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے سر کے اشارے سے''ہاں''کہا۔
پولیس اسٹیشن پہنچ کر ان لوگوں نے سارہ (لڑکی) کا بیان قلمبند کروا یا۔ارشد کو لاک اپ میں بند کردیا۔
''فی الحال ہم تمہیں گھر چھوڑتے ہیں۔ہوسکتا ہے تمہیں ایک آدھ مرتبہ کیس کے سلسلے میں کورٹ آنا پڑے۔۔۔۔میں کوشش کروں گی کہ تمہیں کوئی کام دلوا

سکوں تا کہ تمہیں کوئی ماہانہ آمدنی ملنے لگے۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گی۔''
فرحین نے سارہ سے اس کا موبائل نمبر بھی لے لیا۔

راستے میں سارہ نے فرحین کو اپنی پوری کہانی سنائی۔ اس نے بتایا:

''کوثر میری بچپن کی سہیلی تھی، ہم ایک ہی اسکول، ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ گھر بھی ہمارے نزدیک تھے، صرف ایک گلی کا فاصلہ تھا۔ یہ دوستی ہم دونوں تک ہی محدود نہیں تھی ہمارے والدین بھی ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے۔ میٹرک کے بعد میری پڑھائی چھڑا دی گئی، کوثر نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں کی دوستی قائم تھی، ہفتے میں ایک مرتبہ ہر اتوار کہ ہم ایک دوسرے سے ملتے کبھی وہ میرے گھر آتی تو کبھی میں اس کے گھر چلی جاتی۔ وہ مجھے اپنے کالج کے مزے مزے کے قصے سناتی۔ کبھی کبھی میں سوچتی کاش! میں بھی کالج جا سکتی۔''

پھر اچانک کوثر سے ملاقاتوں کا سلسلہ بہت کم ہو گیا۔ وہ بہت مصروف رہنے لگی تھی۔ کافی عرصے تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی، ایک دن میں اس کے گھر گئی اتفاق سے وہ گھر پر موجود تھی، میں اس کا گھر دیکھ کر حیران رہ گئی، جس گھر میں جدید الیکٹرانک کی کوئی چیز نہیں تھی۔ آج وہ گھر نہ صرف ضروریاتِ زندگی بلکہ تعیشات سے بھرا ہوا تھا، اس کے والد سب سامان مہیّا کرنے کی استعداد نہیں رکھتے تھے، گھر میں کوئی دوسرا کمانے والا بھی نہیں تھا۔ ''میں کسی اور گھر میں تو نہیں آ گئی، ہنستے ہوئے، تعجب سے میں نے کوثر سے کہا۔''

وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔

''کیا زبردست فرنشڈ کیا ہے تو نے اپنے کمرے کو۔۔۔۔ میں نے حیرت سے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا، تجھے یا کریم چاچا کو علاؤالدین کا چراغ ہاتھ لگ گیا ہے کیا۔؟'' یہ کہتے ہوئے میں اس کے بیڈ پر جو بہت مزید ار لگ رہا تھا پیر اوپر کر کے بیٹھ گئی، وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی میں ایک اسٹیج شو میں کام کرنے لگی ہوں۔ تو کرے گی۔۔۔؟

''امی، بابا نے اجازت دے دی تو ضرور کروں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن کوثر میں تو یہ کام جانتی ہی نہیں ہوں۔ کروں گی کیسے۔۔؟'' میں نے کوثر سے یہ نارمل سوال پوچھا۔

''تم فکر نہ کرو وہ لوگ سکھا دیں گے۔'' کوثر نے مجھے کہا۔

''اور پھر ایک دن کوثر نے مجھے ارشد کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ مجھے اسی گھر میں لایا۔

''یہ تم مجھے کہاں لے کر آئے ہو۔ تم تو مجھے اسٹیج شو میں لے جانے والے تھے۔'' میں نے ارشد سے سوال کیا۔

ارشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور مجھے بٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص آیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کو دیکھ کر میں خوف سے کانپنے لگی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بھاگ جاؤں مگر کیسے۔۔۔۔

''ارشد کہاں ہے۔؟ میں نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ اسنے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا اور دروازے کی کنڈی بند کر دی۔ ۔۔۔ میں بہت روئی، دھوئی، منتیں کیں۔۔۔۔۔ سب بے کار۔۔۔ بس اس دن سے میری زندگی بدل گئی۔ مجھے بھی اچھے خاصے پیسے ملنے لگے۔ دھیرے دھیرے میرے گھر میں اور مجھ میں تبدیلی آتی گئی۔ ہمارا Standered of living بلند ہوتا چلا گیا۔ والدین یہی سمجھتے ہیں کہ میں کسی اسٹیج شو میں کام کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر سارہ خاموش ہو گئی۔

''میں جلد ہی تمہیں کوئی جاب دلوانے کی کوشش کروں گی۔ اور تم ارشد یا کسی سے بھی فون پر بات مت کرنا۔ فون ہی نہیں اٹھانا۔ اور کچھ دن گھر سے باہر بالکل نہیں جانا۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گی۔ جہاں بھی جانا ہو گا ہم خود لے کر چلیں گے اور خود تم کو گھر چھوڑیں گے۔ پولیس اسٹیشن میں تمہارا ایڈریس بھی نہیں لکھوایا ہے۔ فرحین نے سارہ سے اس کے گھر کا ایڈریس بھی لے لیا۔''

سارہ، فرحین کی ہر بات بہت غور سے سن رہی تھی، اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ پولیس میں پکڑی نہ جانے سے ایک دم خوش ہو گئی تھی اور فرحین کی ہر بات پر عمل کرنے کو تیار تھی۔

''بس آپ مجھے یہیں اتار دیجئے۔ کوئی مجھے گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ لے گا تو بہت برا ہو گا۔'' سارہ نے گلی کے نکڑ پر گاڑی رکوالی۔ ایک گھر پر پہنچ کر اس نے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ اس کا گھر ہے۔

دوسرے دن جب احسن اور فرحین پولیس اسٹیشن پہنچے اور ایس۔ ایچ۔ او سے کیس کے متعلق بات کی تو اسنے کہا۔

''اس آدمی پر کوئی کیس نہیں بنتا تھا اس لئے اسے چھوڑنا پڑا۔''

''اور وہ بیان جو لڑکی نے قلمبند کروایا تھا۔'' احسن بولا۔

'' آپ کہاں اتنے طاقتور لوگوں سے پنگا لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لڑکی نے اپنا نام اپنے باپ کا نام سب جھوٹا بتایا ہے۔''

ایس۔ ایچ۔ او نے کہا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' فرحین اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''میڈم! آپ ایسے لوگوں کو جانتی نہیں ہیں۔ ہمارا تو آئے دن سا بقہ پڑتا رہتا ہے۔''

''یہ ناممکن ہے۔ چلو احسن۔'' یہ کہہ کر فرحین پولیس اسٹیشن سے نکلی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں۔؟'' احسن نے پوچھا۔

''سارہ کے گھر۔۔ ان جیسے لوگوں کی موجودگی میں معاشرے کی گندگی کیسے صاف کی جا سکتی ہے۔'' فرحین، بہت غصے میں تھی۔

گلی کے نکڑ پر پہنچ کر فرحین گاڑی سے اتری اور اس گھر پر پہنچ کر گھنٹی

باقی صفحہ ۸۵ پر ملاحظہ فرمایئے

لوسٹوری

شمشاد احمد
(کراچی)

لاکھوں کمپیوٹر، اپنی سبز سرخ آنکھیں جھپکتے، ہرلحہ مستعد رہتے ہیں۔ کوئی بٹن دبا، کیمیکلز (Chemical) سنپولیوں کی صورت اپنی نوکیلی زبانیں لہراتے، اپنے سفر پر چل پڑے ہیں۔ بلڈ پریشر کا رولر کوسٹر اوپر اُٹھنا شروع ہوگیا ہے۔ کن پٹیوں میں غبارے پھولنے لگے ہیں۔ آس پاس۔ اردگرد کا ماحول آنکھیں چرا کر چھپ رہا ہے۔ جانے پہچانے چہروں کو جاننے کے لیے ذہن پر دباؤ پڑ رہا ہے۔ جسم کا ہر حصہ نیم گرم پانی میں ڈوبا، خوابوں کی نئی بستیاں آباد کرنے پر چل پڑا ہے۔ کبھی وقت کا یہ بدکا گھوڑا اندھا دُھند، سرپٹ دوڑنے لگتا ہے اور کبھی تھکا تھکا، ہاتھ پاؤں لپیٹ کر، نڈھال ایک جگہ پڑ کر سو جاتا ہے۔ کھلی کھڑکی سے تاروں کا آبشار اُتر رہا ہے۔ دل میں چاندوں کا میلہ لگ گیا ہے۔

صبح ہوئی ہے۔ جسم ہے کہ گیلی لکڑی سلگ رہی ہے اور ساتھ میں سپارکنگ کر رہی ہے۔ یہ کیمیکل بڑا تھکا دینے والا ہے۔ ذہن اور جسم کا ازلی دشمن ہے۔ دفتر جانا ہے، اتنی اہم میٹنگ ہے۔ باس مجھے بغیر ذبح کیے کھال سمیت کھا جائے گا۔ کافی عرصے سے ریکارڈ خراب جا رہا ہے۔ آجکل ڈھنگ کی نوکری ویسے بھی نہیں ملتی۔

آنکھیں دنیا میں سب سے خطرناک شئے ہیں۔ خوبصورت ہوں تو دل میں آتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی ہیں اور اندر سے باریک، نوکیلے تنکے سے گدگدی کرتی ہیں۔ ویسے شاہدہ سے زیادہ چبھنے والی لڑکیاں زندگی میں آتی جاتی رہی ہیں۔ لیکن یہ سسٹم میں اُتر کر اندر ہر طرف پھیل گئی ہے۔ لاکھ جھاڑا پٹخا ہے، نکل کر ہی نہیں دیتی۔ پھر آئی بھی ہے تو پوری نہیں، آدھی اندر' آدھی باہر۔۔۔ اسکی مسکراہٹ میں بھی کچھ۔۔ لگتا ہے مجھے پورے کا پورا ہڑپ کر گئی ہے۔

عمران میاں۔۔ اب تسلیم کر ہی لو کہ تمہیں اس لڑکی سے محبت ہوگئی ہے۔۔ کہیں تو لٹنا تھا، ہارنا تھا۔ مشیت کے ہاتھوں ذبح ہونا، چلا یہیں سہی۔

یا پھر عمر بڑھ رہی ہے۔ شیر بڑھاپے کی طرف مائل ہے۔ اب جنگل کے طویل سفر اور شکار کے پیچھے ہر وقت کی دوڑ بھاگ کی مشقت بھاری لگنے لگی ہے۔ اب سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے شکار ملنا چاہیے۔

عمران ایک سوال کا جواب دیتے جاؤ۔

''تمہارے دل میں اس لڑکی کے علاوہ کسی اور کے خیال کا پرندہ بھولے چوکے سے چونچ مارتا ہے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔ میں شور (Sure) ہوں۔ دل اور ذہن کے سارے خانے سیل بند ہیں۔ بس ایک کھلا ہے اور وہ اُسے بھری بیٹھی ہے۔''

اُسے کئی بار اشاروں کنایوں میں ٹٹول بیٹھا ہوں۔ پیار کی جادوئی چھڑی پھیرتا رہتا ہوں۔ وہ آنکھوں سے پھلجڑی کے ستارے لٹاتی ہے۔ لیکن پھر وہی آدھی دھوپ میں آدھی سایے میں۔

اب اُس سے صاف صاف بات کرنا ہوگی۔ میں اب زیادہ دیر تک سسپنس (Suspence) کی ہزار بازوں والی صلیب پر مزید ٹنگا نہیں رہ سکتا۔

زیادہ سے زیادہ انکار کر دے گی! نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے! وہ ضرور ہاں کرے گی میرے سامنے ہوتی ہے تو اس کے ہونٹوں کے گوشے اُڑتی تتلی کی طرح تھرتھراتے ہیں۔ چہرے پر سرخیاں جلتی بجھتی ہیں۔ اور اس کا جسم۔۔ اُف۔۔ نازک سی ڈنڈی پر جھولتا ہوا پھول۔۔ ہلکارے کھاتا ہوا۔

وہ انکار کیسے کرے گی۔ میرا خاندان، میری اتنی اچھی ملازمت۔۔ شکل وصورت بھی بری نہیں۔ جوانی کے رتھ پر سوار کون سی لڑکی ہے جس نے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے پلٹ کر نہ دیکھا ہو۔۔۔ میں تو چلتا پھرتا گرین کارڈ ہوں۔ ہر محفل میں ضرورت مند نگاہیں مجھے ٹٹولتی ہیں۔ بڑی بوڑھیوں کی تو رال ٹپکتی ہے۔ اکثر لمبی سفید مونچھوں والے بزرگ، اپنی چھڑیوں کو لہرا کر، اپنی فرم (Firm) کی کامیابی اور اپنی چھلکتی دولت کا ذکر کر جاتے ہیں۔

وہ بھلا کیوں انکار کرے گی! دراصل محبت انسان کو کہیں دیوانہ، بہادر اور کہیں بالکل بزدل بنا دیتی ہے۔ رِسک ہے رِسک (Risk) تو لینا ہی ہوگا۔

شاہدہ۔۔۔ بھئی اب وہ زمانہ تو نہیں رہا کہ شادی جیسے اہم معاملات کلی طور پر والدین پر چھوڑ دیئے جائیں۔ ایک حل نکل آیا ہے۔۔۔ طے خود کر لو اور اُن کو اطلاع دے دو۔۔۔ وہ بھی اپنے شوق پورے کر لیں۔ آخر اخراجات اور انتظامات تو اُنھوں نے کرنے ہوتے ہیں۔

''کیا مطلب؟ کس کی شادی کر رہے ہو؟ بھئی ہمیں بلانا نہیں بھولنا۔۔ خدا کی قسم ہمیں تو شادی میں بڑا لطف آتا ہے''

''تمہارے بغیر شادی کیسے ہوسکتی ہے۔ تم دراصل سمجھی نہیں۔۔۔ میں بقلم خود پرپوز کر رہا ہوں۔ کہو تو جھک کر مغربی انداز میں پرپوز کروں؟ یا پھر رات کو بینڈ باجا لے کر تمہاری کھڑکی کے نیچے پہنچ جاؤں؟''

''ہا۔۔ ہا۔۔ ہا۔۔۔ عمران میاں تم واقعی بہت سویٹ ہو۔۔ مجھے کچھ عرصے سے شک ہو رہا تھا کہ تم پھسلن پر چل رہے ہو۔۔ لیکن سوچا کہ آدمی تجربہ کار لگتا ہے اور کچھا اتنا بیوقوف بھی نہیں۔۔۔ پھسلے گا نہیں۔۔۔ میں تمہارے کنفوژن (Confusion) کا جی بھر بھر کے مزہ لے رہی تھی۔۔۔ تم بڑے ظالم نکلے۔۔۔ پرپوز کر کے سب کچھ ملیا میٹ کر دیا۔ اب کیا رہ گیا ہے۔۔۔ تم میں

اورتم سے ملنے میں۔۔۔''

''شاہدہ! میں بے حد سنجیدہ ہوں۔خدارا میرے سوال کا۔۔۔''

''میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس خوبصورت الجھن میں لپٹی عمر بھر مزہ لیتی رہتی۔تم میں صبر جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ہر چیز کا ریپر (Wrapper) کھول کر اسے ننگا کر دیا ہے اور ریپر ہی تو اصل چیز ہوتی ہے۔اندر سے کچھ بھی نکل آئے،کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''نہیں شاہدہ۔۔۔پلیز آج سنجیدہ ہو جاؤ۔''

''کیسے کیسے سجیلے جوان۔۔کیسے کیسے منہ زور گھوڑے جھکتے ہی۔۔۔ لیٹ جاتے ہیں۔اُلٹے ہو کر آسمان کی طرف دولتیاں چلاتے ہیں۔فتح کا احساس۔۔۔چنگیز خان اسی لئے اور ایک نئے ملک پر چڑھ دوڑتا تھا۔۔اُنا کی تسکین آبِ حیات سے بھی زیادہ دلکش ہے۔

یہ مریل چوہا! اپنے وزن سے دس گنا بڑا جذبات کا پہاڑ اٹھا لایا ہے۔میں اس کے نیچے دب کر مرنا نہیں چاہتی۔لگتا ہے شام سے پہلے مجھے جنت سے نکال کر،گھر میں پڑی ہر وقت نا قابل مرمت بچے پیدا کرنے والی مشین بنا کر رکھ دے گا۔

نہیں سر میرا ابھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں۔ابھی میں خود سے جی رہی ہوں اور جب تک ممکن ہوا،خود سے جیوں گی۔شادی اس وقت کرونگی جب شادی کے بغیر گزارا نہ ہوگا۔کم از کم بیس سال تک ابھی میرا کوئی ارادہ نہیں۔''

''میں بیس ہزار سال تک تمہارا انتظار کر سکتا ہوں''

''نہ بھئی۔خوامخواہ انتظار وغیرہ کے چکر میں پڑ کے مجھے پریشان مت کرنا۔ہو سکتا ہے اس دوران مجھ سے بھی تم جیسی حماقت ہو جائے۔۔۔یعنی میں بھی محبت کے کنوئیں میں گر جاؤں۔۔۔تم ساری عمر انتظار کا چابک لہراتے میرے پیچھے پیچھے پھرتے رہو گے۔''

''اُف لیز بیمز (Beams) نے دماغ کے کروڑوں ٹکڑے کر ڈالے ہیں۔رگوں میں پگھلتا،کھولتا سیسہ چل رہا ہے۔کانوں سے مائع بھاپ نکل رہی ہے۔مجھے یہ زندگی نہیں چاہیے۔۔نہیں چاہیے۔

ساون کی پہلی بارش پورے جنگل کو جل تھل کر کے چلتی نہیں۔پھسلتی بوندوں والے تنے کے پیچھے سے دو بھوری آنکھوں نے جھانکا اور تازہ،خوشبودار فضا کے بڑے بڑے گھونٹ پیئے۔

اسے ایک جھٹکا لگا۔وہ رک رک کر اپنی تھوتھنی انٹینا کی طرح آگے پیچھے،دائیں بائیں گھماتا پھراتا آگے بڑھنے لگا۔

پھر وہ اسے نظر آ گئی۔اس نے درخت سے چھلانگ لگائی۔تار مل گئے۔۔۔تھوڑی دیر تک سپارکنگ ہوتی رہی۔پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا جس سے کائنات میں روشنی پھیل گئی۔وہ بھوک محسوس کرنے لگا تھا۔خوراک کی تلاش میں چل پڑا۔اُس نے بھی رخ پلٹا اور آگے بڑھ گئی۔

''عمران میاں۔یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ موسم واقعی بہت خوشگوار ہے۔بارش تھم گئی ہے۔اندر چلو،نئے پرندے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔''

محبت۔پردہ۔اطلس وکمخواب کا پردہ۔خوشبوؤں میں بسایا ہوا۔۔خود فریبی کا خود ساختہ جال۔۔۔محض دو جسموں کی ضرورت۔۔۔فطرت کا جبر۔۔ ایک دلکش عذاب اور اس کا انجام؟ گلے سڑے تنوں سے نئی کونپلیں پھوٹنے کا پراسس (Process)۔۔۔پرانا مال کنڈم۔۔۔نیا مال۔۔۔نیا مال پرانا۔۔۔ زندگی اور موت کی بے رحم،بدصورت آنکھ مچولی۔۔۔ان دیدہ لاٹھی کی زد میں احکام کی پیروی۔۔۔غلامی کے صحراؤں میں بھٹکتے ہوئے،جمہوریت کے نخلستانوں کی تلاش۔۔۔اپنی اُنا کے محل۔۔۔خود۔۔۔کون سا خود؟

''عمران میاں اپنے اندر جھانکو۔۔۔تمہارے اندر لاکھوں کمپیوٹر ہیں اور ان کے احکامات سے لاکھوں کیمیکلز ہر لحہ ریلیز (Release) ہوتے رہتے ہیں۔تم ان سب کا ٹوٹل ہو۔خود کچھ نہیں ہو۔ایک چلتا پھرتا،روتا ہنستا،چیختا دھاڑتا کھلونا۔۔۔جو چابی سے چل رہا ہے۔''

بھاڑ میں گیا سب کچھ۔۔شاہدہ بھی۔۔ذرا سی انا روندی گئی ہے اور اتنا طوفان! یہ بھی تو کسی کمپیوٹر کا ریلیز شدہ کیمیکل ہوگا۔۔۔کوئی بات نہیں،ان سب کیمیکلز کا اثر دیر پا تو ہوتا نہیں۔

اثر زائل ہو رہا ہے۔سکون لوٹ رہا ہے۔رگوں میں اودھم مچانے والی بھاپ ٹھنڈی پڑنے لگی ہے۔آہستہ آہستہ پانی میں تبدیل ہو جائیگی۔جسم پسینے کے ذریعے اس خطرناک کیمیکل کو خارج کر دے گا۔ابھی تھوڑی سے خلش باقی ہے۔کچھ بچارہ گیا ہوگا۔۔۔تھوڑا وقت اور لگے گا۔ایک دن،دو دن،ہفتہ،مہینہ۔۔۔آخر سب کچھ اُڑ جائے گا۔۔۔دوسرے کمپیوٹر نے بٹن دبا دیا ہے۔

''عمران میاں۔۔۔چلو،اندر چلو۔۔۔یہ ہنگامہ خیز موسیقی تمہیں سنائی دینے لگی ہے۔اندر نئی نگاہیں تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔''

''وہ کالے بالوں والی۔۔۔تیکھی آنکھوں والی۔۔۔''

''اُف پھر وہی۔۔۔پھر بٹن آن ہوا۔۔۔بلڈ پریشر کا رولر کوسٹر پھر سے اوپر اُٹھنا شروع ہو گیا''

''تفننِ طبع''

1965 میں قیوم نظر ایک چکّر میں پھنس گئے۔قیوم نظر مرحوم نے اپنے تیز طرار شاگردوں کو،تفننِ طبع کے لیے ہزلیات لکھنے پر اُکسایا بلکہ کچھ اشعار خود بھی لکھ کر اُنہیں دیئے۔ڈرامے کے حوالے سے ایک شعر عبدالقیوم جوجو مرحوم پر خوب مشہور ہوا:

جوجو کے کان میں یہ کہا اُس ''نگار'' نے
اب کے برس تو آگ لگا دی بہار نے

''نا آسودگی''

ڈاکٹر عمران مشتاق
(یو۔کے)

سینے پر پڑنے والے دباؤ نے اُسے میٹھی مدھ بھری نیند سے جگا دیا۔وہ اِک حسین سپنا دیکھ رہی تھی۔اُس کے سپنوں کا راجکمار اُس کے ساتھ تھا۔ مسرت سے اُس کے پاؤں زمین پہ نہ ٹِک رہے تھے۔اُس کی آغوش میں زندگی اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ سمٹ آئی تھی۔اُس کے ادھورے و پیاسے جذبے شاداب ہونے کو تھے کہ چھاتی کے بوجھ سے سینے میں آتے جاتے سانسوں میں رکاوٹ پڑی تو،اُس نے زندگی کی طلب میں ہاتھ پاؤں چلانے شروع کیے۔آنکھیں کُھلیں تو دہشت سے کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔زیرو کے بلب کی ملگجی روشنی میں بھی وہ اُس دہشت ناک منظر کو پوری طرح دیکھ اور محسوس کر سکتی تھی۔حسین سپنا جیتی جاگتی خوفناک حقیقت میں ڈھل چکا تھا۔منہ پر ڈھاٹا باندھے،وہ لمبا چوڑا آدمی اُس پہ جھکا ہوا تھا۔اُس کے دونوں ہاتھ بوجھ کی صورت اس کے سینے پہ دھرتے تھے۔اُس نے چیخنے کے لیے منہ کھولنا ہی چاہا تھا کہ سینے کے بوجھ کو کم کرتا ہوا ایک ہاتھ اُس کے منہ پہ آ ٹھہرا۔

''اگر آواز نکلی تو پل بھر میں ٹینٹوا دبا دوں گا۔'' اک سرسراتی ہوئی آواز نے چیخ کا گلا کہیں اندر ہی گھونٹ دیا۔لہو برف ہونے لگا۔حواس ساتھ چھوڑنے لگے اور جسم جاڑے ایسے بخار کی صورت سردی کھانے لگا۔آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔سینے میں کہیں سانس اٹک سا گیا۔''میں تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دوں گا لیکن تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔'' اُسے یقین تھا کہ ڈھاٹے میں چھپے چہرے پہ یہ کہتے ہوئے یقیناً ایک شیطانی مسکراہٹ ضرور جاگی ہوگی۔

''بات سمجھ میں آ گئی ہے یا نہیں؟'' خوفناک لہجے کا اثر تھا یا بات واقعی میں سمجھ میں آ گئی تھی کہ سر کی غیر اختیاری جنبش نے ''حملہ آور'' کو اُس کے تعاون کا یقین دِلا دیا۔

''میں اب تمہارے منہ پر سے ہاتھ ہٹانے لگا ہوں۔اپنی زبان کو لگام دینا۔اگر چیخنے کی کوشش کرو گی تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم جان ہارنے کی خواہش کرنے لگو گی اور جان اتنی آسانی سے نکلے گی بھی نہیں۔'' اس نے ہاتھ ہٹایا تو سینے میں سانس سمانے لگی۔اُس کا بوجھ اب بھی جسم پہ کسی چٹان کی صورت دھرا تھا،گو کہ سینے کو تنفس بحال کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔وہ چند لمحے اُسے غنیمت لگے،جب وہ اُسے سانس بحال کرتے ہوئے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔وہ جانتی تھی کہ اس خاموشی میں کیسے طوفان مچل رہے ہوں گے۔

اب تو علاج کروا کروا کے تنگ آ چکا تھا۔اخبارات،ٹی وی،اشتہار بازی،دوستوں کی صلاح سے جہاں کسی طبیب،حکیم،سیانے سنیاسی یا ڈاکٹر کا پتہ چلا،وہ اپنے قدموں کو اُسی اُور لے چلا۔پیسہ بے دردی سے لٹانے کا اُسے کوئی افسوس نہ تھا کہ اب پیسہ تو اُس جیسے شخص کے لیے ہاتھ کی میل تھا۔البتہ اس تمام کوشش کے باوجود ''مسئلہ'' اپنی جگہ قائم تھا اور وہ یاسیت اور نا امیدی کا شکار ہونے لگا تھا۔علاج کے مکمل ہوتے ہی اُسے یقین دلایا جاتا کہ وہ اب ٹھیک ہے اور اب کوئی ''خرابی'' باقی نہیں رہی۔خرابی نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔شادی کے شروع کے دو تین مہینوں کے سوا،اُسے یاد نہیں تھا کہ اُسے کبھی اپنی بیوی کے ساتھ تسکین میسر آئی ہو۔برف کا تودہ،غیر معمولی حرارت کے باوجود بھی پگھلنے کا نام نہ لیتا۔وہ انکار تو نہ کرتی اور تعاون سے بھی پرہیز ہی کرتی۔وقت کے ساتھ ساتھ سارا کھیل ایک معمول بن کر رہ گیا۔محبت کہیں کروٹ لے کر سو گئی اور اُس کی جگہ تلخی، غم و غصہ اور سرد مہری نے جگہ بنالی۔بیوی کی بے توجہی نے اُسے بھی سرد کر دیا اور معاملہ اس حد پہ جا پہنچا کہ اُسے اپنے مرد ہونے پہ بھی شبہ ہونے لگا۔شبہ جب یقین کی حدود کو چھونے لگا تو علاج معالجہ کا سلسلہ شیطان کی آنت ثابت ہوا۔اس سے پہلے کہ بالکل ہی مایوس ہو کر بیٹھ رہتا کہ پرانے دھندے سے اب بھی جڑے ہوئے ایک دوست نے اُمید کی کرن دکھائی۔خود تو وہ دھندہ اب چھوڑ چکا تھا البتہ پرانے دوستوں سے کبھی کبھار ٹاکرہ ہو ہی جاتا تھا۔یہ نیا ''معالج'' اُسے پسند تو نہ آیا لیکن اُس کا طریقہ علاج منفرد ضرور تھا اور اُس کے خیال میں خاصہ عجیب و غریب بھی۔

زندگی اُس کے لیے نرم و نازک،رنگ برنگے پھولوں کا بستر تھی۔ راحتوں کا گھر،مسرتوں کا ہنڈولہ اور خوشیوں کا ساگر تھی،جو اُس کے مہکتے بدن کے پور پور کو زندگی کے رس میں بھگوئے رکھتی۔جوانی ٹوٹ کے برسی تھی۔ معاشرے کے جس طبقے سے اُس کا تعلق تھا وہاں اخلاق و اقدار کے پیمانے مختلف تھے۔ایک ہی وقت میں کئی مردوں سے دوستی میں بھی کوئی قباحت نہ تھی۔شرم و حیا اور عفت و ناموس جیسے شبدوں کو برسوں پہلے ڈِکشنری کے حوالے کر کے،وہ اس کے نئے معانی رقم کر رہے تھے۔اُن کی اپنی ہی ڈکشنری تھی،جس کے معانی و مفہوم ضرورت کے مطابق تشکیل پاتے تھے۔ایسے ماحول میں بھی اُس نے جوانی کے بھرپور تقاضوں کے باوجود خود کو محفوظ رکھا۔اس لیے نہیں کہ اُسے اپنی عزت پیاری تھی بلکہ وہ اپنا آپ اُسے سونپنا چاہتی تھی جو زندگی کی رنگینیوں کے ساتھ بھرپور انصاف کر سکتا ہو۔تھرل اور سسپنس کا جُویا ہو اور اُس کے ساتھ ساتھ شیر جیسا جگر رکھتا ہو۔اُس کے ماحول میں تو بقول اُس کی ایک سہیلی کے بنا سپتی شیر بھی ڈھونڈنے سے شاید نہ ملے۔ایسے میں اُس نے یونیورسٹی کا رُخ کیا کہ اُسے واقعی ہی ایک شیر درکار تھا۔اِک نچلے متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والا،جس کا حال غیر یقینی حالات کا شکار تھا تو مستقبل گھور اندھیرے میں چھپا،مگر ہمت و حوصلہ ایسا کہ آسمان کی خبروں کے حصول پہ آمادہ۔شیر غربت کا پالا ہوا تھا مگر جوانی و مردانہ وجاہت کی سدا کی بیری غربت،بھی اُسے قبل از وقت حالات کے شکنجے میں جکڑ کر اُس کے کسرتی بدن کی سختی ختم کرنے میں ناکام رہی تھی۔حسین و جمیل امیر

زادی کوشیر کو پالتو بنانے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔حسن و جمال کا کمال تھا، دولت کی دمک تھی، مستقبل کی خوش آئند اُمیدوں نے غربت کے ہاتھوں پامالی کے اندیشے کو بڑھا چڑھا کے دکھایا ہوگا اور ہاتھ آئی مایا کو گنوانے کی صورت میں خوب خوب ڈرایا ہوگا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، شیر دام میں آ گیا تھا۔ کم سے کم اُس کا یہ ہی خیال تھا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ شیر جب پالتو ہوا تو وہ اپنی مالکن کے گرد چکراتا تو رہتا مگر جب بہادری دکھانے کا وقت ہوتا تو پالتو بلی کی طرح صرف میاؤں کر کے رہ جاتا۔ شروع شروع میں اُس نے کوشش کی مگر جب تالی دونوں ہاتھوں سے نہ بجی تو اُس نے جذبات کو سرد مہری کے حوالے کر دیا۔

اُسے تعاون پہ آمادہ پا کر اُس نے آنکھ سے ایک اشارہ کیا۔ وہ نہ جانے سمجھی کہ نہیں مگر جیسے ہی اُس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اُس نے کوئی تعرض نہ کیا۔ یہ بات اُس کے لیے حیرت کا باعث تو تھی مگر اُس نے اپنے کام پہ توجہ دی۔ اگلا ہی لمحہ چونکا دینے والا تھا۔ اُس کے بھرپور انداز میں خود سپردگی تھی۔ پہلے تو اُس نے منہ کو خوف سے سی لیا تھا کہ کوئی آواز نکلنے کی صورت میں ڈاکو کا بھاری ہاتھ اُس کے نازک گلے پہ آ ٹھہرتا۔ جب بات مستی کی حدود میں داخل ہوئی تو مسرت سے چیخ اٹھی۔ اُس کی وحشتوں نے عروج پایا۔ مستی بھری سسکیاں، آہیں، سرسراہٹیں سبھی کچھ تو تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح سے آنے والا ڈاکو ہی ہو سکتا تھا۔ ڈاکو کے لیے وہ لمحہ حیرت انگیز تھا۔ اس کے سامنے ایک شریف گھرانے کی شریف عورت تھی۔ لیکن نہیں وہ صرف عورت تھی۔ جو وہ کہہ رہی تھی وہ پہلے تو اُس کے دل میں تھا کہ پھر جب زبان پہ آیا تو بھونچال ہی آ گیا۔ ڈاکو کی گرفت اُس کے نازک بدن پہ ڈھیلی پڑنے لگی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''کاش۔۔۔اے کاش۔۔۔تم ڈاکو نہ ہوتے۔۔۔ کوئی اور ہوتے۔۔۔ میرے۔۔۔ میرے شو۔۔۔ ہر۔۔۔ ہو۔۔۔ تے۔۔۔''

آخری چند الفاظ اتنے دھیمے انداز میں کہے گئے تھے کہ وہ بمشکل ہی سُن پایا تھا اور اُس کے بعد سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی سرگوشیاں جاری تھیں۔ ''آج برسوں بعد پیاسی زمین سیراب ہوئی ہے''۔ اُس کی گرفت مزید نرم پڑ گئی۔

''کاش وہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ ایک مکمل شیر نہ کہ ایک ایسی بلی جو ایک ہی بھبک سے ڈر کر بھاگ جائے۔ شیر جنگل کا نہ ہو تو بنا سپتی شیر بن جاتا ہے۔''

اب اُس کے دونوں بازو فضا میں جھول رہے تھے اور ڈھاٹے میں چھپی پیشانی پسینے سے تر ہو چلی تھی۔

''محبت نہ جانے کیا ہے اور کیوں ہے؟'' اُس کے کانوں میں اب سائیں سائیں ہو رہی تھی اور الفاظ اپنا مفہوم کھو رہے تھے۔ ذہن اب ماضی میں کچھ ڈھونڈنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھار شوقیہ اسٹیج کے ڈراموں میں اداکاری کرتا رہا تھا۔ شادی کے بعد روزگار اور زندگی کے مسائل کے ساتھ سارے شوق بھی ختم ہو گئے تھے۔ برسوں بعد جب اسٹیج کے منجھے ہوئے ایک اداکار دوست سے ملاقات ہوئی تو بے تکلف دوستی نے اُسے سچ بولنے پر مجبور کر دیا۔ اُس کا مشورہ تھا کہ ''ڈاکو کا بھیس بھر کر جاؤ۔ یہ ڈرامہ ضرور کامیاب ہوگا۔ جب کام ہو جائے تو بھابھی کو سچ بتا دینا۔ شاید یوں ہی تعلقات نارمل ہو جائیں۔'' مشورہ عجیب و غریب بھی تھا اور کُچھ کُچھ فلمی بھی۔

وہ نہ جانے مزید کیا کہہ رہی تھی۔ جسمانی طور پر وہاں ہوتے ہوئے بھی وہ شعوری طور پہ وہاں نہیں تھا۔ وہ کہیں پہ بھی نہ تھا۔ اس ہونے نہ ہونے نے جب ذہن کو بوجھل کیا تو وہ وحشت سے چیخ اٹھا۔ عورت بیچاری ڈر کر چھپ گئی بلکہ اُس کا بدن خوف سے کانپنے لگا اور آنکھوں میں ڈر، خوف اور سراسیمگی کی کیفیت ہلکورے لے رہی تھی۔ اُس کی نظروں کے آگے تو ایک سیاہ دیوار سی تھی۔ دھند تھی کہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے رنگ سے چھوٹ رہے تھے اور سیاہ دھند بینائی کو کھاتی جا رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر بستر سے اُترا۔ اُسے کوئی ہوش نہ تھا۔ ڈھاٹے میں چھپا چہرہ عیاں ہوا تو عورت کے منہ سے نکلی ایک طویل چیخ نے سیاہ رات کے سینے میں شگاف ڈال دیا۔ وہ کانپتی ٹانگوں اور لڑکھڑاتے وجود کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ پرت پرت اُتری تو وہ پھر کاغذی شیر بن چکا تھا۔

- بقیہ -

دلدل

بجائی جس کی نشاندہی سارہ نے کی تھی۔

دروازہ ایک بڑی عمر کی خاتون نے کھولا۔

''مجھے سارہ سے ملنا ہے۔'' فرحین ان بزرگ خاتون سے مخاطب ہوئی

''بیٹا! میں تو اس گھر میں بہت عرصے سے اکیلی ہی رہتی ہو ں۔ یہاں پر تو سارہ نام کی کوئی خاتون نہیں رہتیں میرے ساتھ۔'' ان خاتون نے جواب دیا۔

فرحین تھوڑی دیر کے لئے سکتے میں آ گئی۔ خاتون نے سارہ کی طرف دیکھا اور بولیں

''اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے تو آپ اندر آ کر بھی دیکھ سکتی ہیں۔''

''نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں شاید مجھے غلط پتا بتایا گیا تھا۔''

وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی

''چلو'' احسن کی خاموش سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ جب گاڑی چلنے لگی تو اس کے منہ سے نکلا

''افسوس! ہم سارہ کو اس دلدل سے نہیں نکال پائے۔''

غیرت

اشتیاق سعید
(ممبئی، بھارت)

میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی شاخ بانس پھاٹک بنارس میں کیشئیر کی حیثیت سے ملازم ہوں۔حالانکہ میں بنارس سے تقریباً چالیس بیالیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع مہناج پور بازار سے متصل موضع نیوادہ کا رہنے والا ہوں ۔یہیں کے گُوبا ڈگری کالج سے B.Com اور بنارس ہندو یونیورسٹی سے M.Com کی ڈگری حاصل کرکے سیاسی اپروچ کی بدولت اسٹیٹ بنک آف انڈیا(SBI) میں ملازم ہوا ہوں ۔پہلے پہل تو ضلع جونپور کی تحصیل مچھلی شہر میں میرا تقرر ہوا، جہاں میں نے دو سال بڑی جفا کشی اور جانفشانی سے گذارے۔۔۔بعدازاں میرا اتبادلہ بنارس کردیا گیا۔یہاں گذشتہ تین سالوں سے متمکن ہوں ۔قریب ہی کے ایک محلّہ میں چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے رکھا ہے، جہاں پیر سے جمعہ تک کُل پانچ روز میرے بسر ہوتے ہیں پھر سنیچر کی سہ پہر یعنی چار بجے والی بس سے گاؤں کے لیے چل پڑتا ہوں۔سنیچر کی رات،اتوار کا دِن اور پوری رات اہلِ خانہ کے ساتھ گذار کر پیر کی صبح ساڑھے سات والی بس سے بنارس لوٹ آتا ہوں اور چھ دنوں کے لیے ملازمت کے چکرویو میں اُلجھ جاتا ہوں۔

اب کی سنیچر جوں ہی میں گھر میں داخل ہوا،امّاں نے بتایا کہ نارائن کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔تین روز سے وہ یوں ہی چار پائی پر بے سُدھ پڑا ہے، کچھ بولتا ہے نہ ہلتا ڈُلتا ہے اور نہ ہی اُس کی پلکیں جھپکتی ہیں،بس ایک ٹک خلاء میں دیکھ رہا ہے۔امّاں مزید کچھ کہتیں اس سے قبل میں ایک جھٹکے سے مُڑا اور نارائن کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

نارائن میرا ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ ہم جماعت بھی رہا ہے۔ہم نے گاؤں ہی کے پرائمری اسکول میں گدھیّا گول سے لے کر درجہ چار تک تعلیم حاصل کی تھی، پھر درجہ پانچ سے گاندھی انٹر کالج،رواں پار جانے لگے تھے۔ہم دونوں ساتھ اسکول جاتے اور ساتھ آتے۔ہم دونوں میں اسقدر میل تھا کہ اگر کسی دن کسی وجہ سے میں اسکول نہ جاتا تو اُس روز نارائن بھی نہ جاتا اور کسی سبب نارائن اسکول جانے سے معذور ہوتا تو یہی رویّہ میرا بھی ہوتا۔ ہمارے بزرگوں نے کبھی ہمارے اس معمول پر اعتراض نہیں کیا، بلکہ وہ خوش ہوتے تھے۔کیونکہ ہم دونوں ہی کے مزاج میں آوارہ پن نہیں تھا نہ ہی ہم گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے کودتے تھے۔غرض کہ ہماری ایک الگ ہی دُنیا آباد تھی اور ہم اپنی اس دُنیا میں مست تھے۔

ہائی اسکول کا امتحان ہوا ۔رزلٹ آنے پر معلوم ہوا کہ نارائن انگریزی میں فیل ہوگیا۔یوں تو انگریزی میری بھی اچھی نہیں تھی ،نہ جانے کیسے میں باؤنڈری لائن پر آکر پاس ہوگیا تھا۔یہیں سے ہم دنوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔میں جونیئر کالج میں چلا گیا اور نارائن۔۔۔؟ پھر تو نارائن کا جی پڑھائی سے ایسا اُچاٹ ہوا کہ تین دفعہ امتحان دینے کے باوجود پاس نہ ہوسکا۔اس دوران میں بی۔کام کے پہلے سال میں داخل ہوچُکا تھا۔وہ تعلیم میں مجھ سے پچھڑ ضرور گیا تھا البتہ دوستی میں پیش پیش تھا۔

میں جب نارائن کے گھر کے قریب پہنچا۔دیکھا دروازے پر چھ سات چار پائیاں پڑی ہیں جن پر کچھ جانے کچھ انجانے چہرے متفکر بیٹھے ہیں۔ چار پائیوں کے درمیان اسٹول پر ایک ٹمٹماتی ہوئی لالٹین دھری ہے جس کی روشنی کا ہالہ صرف اسٹول کے اطراف پھیلا ہوا ہے۔میں چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے سلام کلام کیے بغیر سیدھے کھمیا میں داخل ہوا۔کھمیا کے بائیں جانب کچھ لوگ ایک چار پائی کو گھیرے دکھائی دیے۔میں بجائے وہاں جانے کے آہستہ سے پُکارا۔’’کگّا۔۔اے کگّا‘‘۔

چار پائی کے پاس سے ایک چہرہ میری جانب گھوما۔’’کے ہے؟‘‘۔

’’ہم۔۔۔نصرو‘‘۔

’’آجا بیٹا۔۔اُوہاں کا ہیں کھڑا ہے؟‘‘۔

وہاں سے آگے بڑھنا چاہا تو مجھے لگا جیسے میرے قدم من من بھر کے ہوگئے ہوں اور میرے لیے ایک قدم بھی آگے بڑھنا دُشوار معلوم ہونے لگا۔اس دوران نارائن کے والد آگے بڑھکر میری کلائی پکڑتے ہوئے پوچھے۔’’نصرو بیٹا، کب آئے بنارس سے؟‘‘۔

’’بس چلے ہی آرہے ہیں ، جیسے گھر پہنچے امّاں نے بتایا اور ہم دوڑے چلے آئے ،لیکن کگّا۔۔نارائن کو ہوا کا ہے؟‘‘۔

’’ایشور جانیں بیٹا۔۔جانے ہمری کون بھول کی سزا نارائن کو دے رہے ہیں‘‘۔

واقعی نارائن کی حالت انتہائی تشویشناک ہے۔وہ بے حِس وحرکت چار پائی پر پڑا ہے اور وہاں موجود لوگوں میں ایک صاحب ہنومان چالیسہ کا جاپ کررہے ہیں اور ایک بزرگ خاتون گیتا کے اشلوک پڑھنے میں مگن ہیں۔میں اُسے دیکھتے دیکھتے اچانک اُس پر جُھک گیا اور بے تحاشہ اُسے پُکارنے لگا۔’’ نارائن۔۔۔اے نارائن۔۔۔دیکھ۔۔۔۔دیکھ ہم ہیں۔۔۔۔نصرو‘‘۔

نارائن کی آنکھیں اب بھی اُسی طرح خلاء میں ٹِکی ہوئی تھیں۔۔میں چند لمحے ٹھہر کر دوبارہ اُسے پُکارا۔’’نارائن۔۔۔اے نارائن۔۔۔کیا ہوگیا ہے رے تجھے؟ بول نا۔۔۔آخر تُو۔۔تُو کچھ بولتا کیوں نہیں؟۔۔۔۔اے۔۔۔اے ساتھی۔۔۔ بول نا!‘‘۔

میرے اتنا پکارنے پر بھی اُس کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی نہ

لب ہلے۔ ہاں! ایک عجوبہ یہ ضرور ہوا کہ اُس کی پتھرائی ہوئی بے جان آنکھوں سے دوموٹے موٹے قطرے آنسوؤں کے ڈھلک کر رُخسار پر آ گئے تھے۔ یہ دیکھ وہاں موجود تمام لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ گذشتہ تین دنوں میں آج اُس کی آنکھوں میں زندگی کے آثار دکھائی دیے تھے۔ زندگی! جو شئے کے وجود کی ضمانت ہے جس میں مجھے نارائن کی بے بسی، لاچاری، ارمانوں کی تشنگی اور حالات سے شکوہ کا شور صاف سُنائی دے رہا تھا۔ تاہم میں نے اپنی اُنگلی کی پور سے اُس کے رُخسار پر ڈھلک آئے زندگی کے اِن قطروں کو خشک کرتے ہوئے قدرے گلو گیر آواز میں کہا۔ ''نارائن کچھ تو کہہ۔۔۔ کیا تُو اپنے ہجولی سے بھی نہ بولے گا؟''۔ اور اُس کے گال کو تھپتھپایا۔ جواب میں اُس کی آنکھوں نے پھر دو بوند ڈھلکا دیئے۔ یہ دیکھ کر میری بھی آنکھیں نم ہو گئیں اور میں اُس کے چہرے پر اپنا چہرہ جھکائے حیرت ویاس کی تصویر بنا اُس کی بے جان آنکھوں میں جھانک رہا تھا کہ اندھے کنویں سے سُوتا کیونکر اُبل رہا ہے؟ اس دوران مجھے اندازہ ہوا کہ اُس کے ہاتھوں میں بھی زندگی سرایت کر رہی ہے۔ کیونکہ اُس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ سے مس ہو رہا تھا۔ میں اُس جانب دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اچانک اُس کے لبوں میں بھی ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور میں نے اپنی تمام تر توجہ اُس کے لبوں پر مرکوز کر دی۔ پھر کچھ ساعت بعد آہستہ آہستہ اُس کے لب تھرتھرانے لگے۔ اس دوران اُس کا پنجہ میری کلائی کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر وہاں موجود سبھی لوگوں کی آنکھوں میں خوشی اور تجسس کی آمیزش رقص کرنے لگی تھی اور ہونٹوں سے دعائیہ کلمات پھوٹ رہے تھے۔ عقب سے کسی کی آواز گونجی ''نصرو۔۔۔ دیکھو شاید نارائن کچھ کہنا چاہتا ہے''۔

میں نے پھر نارائن کا گال تھپتھپایا۔ ''نارائن۔۔۔ بول، بول نا جلدی ''۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ اُس کے لب تیزی سے پھڑ پھڑانے لگے۔۔۔ زبان میں حرکت ہوئی پھر لبوں کی پھڑپھڑاہٹ آواز میں تبدیل ہو گئی۔ اُس نے کیا کہا یہ تو سمجھ سے پرے تھا لیکن اُس کے چہرے کے کرب سے اتنا ضرور اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اُس نے جو کچھ بھی کہا ہوگا وہ الفاظ انتہائی عبرت ناک رہے ہوں گے۔ حالانکہ وہاں موجود افراد کو اس سے کوئی غرض نہ تھی، وہ اس میں ہی خوش تھے کہ چلو کسی طرح چپّی تو ٹوٹی۔ کہاں تین روز سے بالکل بے جان پڑا تھا اور گاؤں جوار کے تمام ڈاکٹر، وید، اوجھا ہر جتن کر کے تھک چکے تھے۔

ہر چند میری نگاہیں اب بھی اُس کی آنکھوں پہ مرکوز تھیں۔ لیکن یہ کیا ! رفتہ رفتہ اُس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُسے نیند کی دیوی نے اپنی بانہوں میں لپک لیا۔ قدرے توقف کے بعد اُس کے والد میری جانب پُر ممنون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نہایت ہی لجاجت سے بولے ۔ ''بیٹا۔۔۔ اب ایکے تنی سو لیوے دو۔۔۔ تین دن سے پل بھر کے بھی پلک نہیں جھپکی''۔ اور یکبارگی میرے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

''بیٹا۔۔۔ ہم تمھارا ای اُپکار جیون بھر نہ بُھلا پائنگے''۔

''اُپکار!۔۔۔ کیسا اُپکار کگّا؟۔۔۔ ارے، اس میں کیہو کا کوئی اُپکار نہیں۔۔۔ ای تو ایشور کا چمتکار ہے''۔

کہتے ہوئے میں نے اُن کے جُڑے ہاتھوں کو جُدا کر دیا اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بے ساختہ مجھے اپنے سینے سے بھینچ لیے۔

''بیٹا تم خوب نبھانا جانتے ہو دوستی کا دھرم!''۔ وہ زیر لب بُدبُداتے ہوئے میرے سہارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھمیا سے باہر آئے۔

باہر لوگوں کا جمگھٹا نسبتاً کچھ بڑھ گیا تھا۔ اس سے پہلے کے لوگ ہم سے کچھ سوال کریں میں نے نارائن کے والد سے التجا کی۔ ''کگّا، اب ہمیں اجازت دیں۔۔۔ بنارس سے بے کھائے پیے چلے تھے، پھر بس میں بھیڑ ایسی رہی کہ اوڑھیار تک کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑا''۔

''ہاں بیٹا! جا، کھا پی کے آرام کر۔۔۔ کچھ ایسن ویسن بات ہوئی تو تم کو بلوائے لینگے''۔ وہ شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے کگّا'۔۔۔ سلام''۔ میں کگّا کو سلام کر کے جوں چلا وہاں بیٹھا ایک اور شخص میرے ساتھ ہو لیا جسے میں اندھیرے کے سبب پہچان نہ سکا تھا، چنانچہ چند قدم چلنے کے بعد پوچھا۔ ''ارے بھائی کے ہو؟''۔

''ہم ہیں بھیّا سُدرشن''۔

سُدرشن گاؤں کا ہی گُرمی تھا، بمبئی سے موٹر وائینڈنگ اور الیکٹریکل ورکس میں مہارت حاصل کر کے گاؤں لوٹ آیا تھا۔ اب گاؤں میں بجلی مستری کے طور پر اُس کی شناخت بن گئی تھی۔۔۔ بہر کیف! ہم دونوں چلتے ہوئے جب نارائن کے گھر سے قدرے فاصلے پر پہنچ گئے تو میں نے ازراہِ گفتگو سُدرشن سے دریافت کیا۔ ''سُدرشن، ای بتاؤ آخر نارائن کی ای دشا بھئی کیسے؟ کہیں اس کو کوئی صدمہ ودمہ تو نہیں پہنچا ہے؟''۔

اتنا سُنتے ہی سُدرشن میرا گٹا پکڑ کر مجھے روک لیا۔ ''بھیّا تمھار ترک ایکدم سٹیک ہے''۔

''کیا!''۔ میں چونک کر اُس کا چہرہ تکنے لگا۔

''ہاں بھیّا! جے دن نارائن بھیّا کی حالت بگڑی ہے، وہ دن گھنٹہ بھر پہلے ہی ہم کے اپنے ٹیوب ویل کا انجن دیکھانے روری والے چک پر لیوا جا رہے تھے۔ ابھی ہم نمبردار کے باغ ہی میں تھے کہ دیکھا کوئی لڑکا مُنہ پہ ڈھاٹا باندھے انجن والی کوٹھری کا تالا کھول رہا ہے۔ نارائن بھیّا ای دیکھتے چلاّئے، لیکن تب لے اُو کیواڑ کھول چُکا تھا، کیواڑ کھلتے کوٹھری میں سے ایک لڑکا نکلا اور دونوں جنے دوڑ کے گنّے کے کھیت میں گھس گئے۔ ادھر ہم دونوں جنے بھی چور چور کی گہار لگاتے سرپٹ دوڑ پڑے۔۔۔ پھر جیسے ٹیوب ویل پر پہنچ کے کوٹھری میں گھسے تو ہم دونوں جنے سنّ رہ گئے''۔

''کیوں؟ انجن چوری ہو گوا رہا کا؟''

''نہیں بھیّا۔۔۔ انجن تو جوں کا توں رہا''۔

''پھر!''۔میرا تجسس بڑھنے لگا تھا۔

''بھیّا بھیتر، نارائن بھیّا کی بڑی بٹیا۔۔۔۔۔''۔

''اوہ! تو ای بات ہے''۔بے ساختہ میرے لبوں سے یہ جملہ پھسلا اور یکلخت میرے ذہن میں مُرلی سنگھ کا نقش اُبھر آیا۔دو سال قبل ہی مُرلی سنگھ کی بیٹی رادھیا رمپت تیلی کے لڑکے کے ساتھ ارہر کے کھیت میں پکڑلی گئی تھی۔لونڈا تو خیر ہاتھ نہیں آیا لیکن اگلی صبح لڑکی کی لاش کمرے میں پنکھے سے جھولتی پائی گئی تھی۔۔۔پولیس آئی۔۔۔پنچنامہ ہوا اور لین دین کی بدولت معاملہ رفع دفع ہوگیا۔رادھیا کی ارتھی میں نارائن کے ساتھ میں بھی شمسان تک گیا تھا۔واپسی میں نارائن نے مجھ سے کہا۔''یار نصرو، کچھ بھی کہومُرلی سنگھ ہے بڑا غیرت دار''۔

''وہ کیسے؟''میں سراپا سوال بن گیا تھا۔

''ارے، دیکھے نہیں۔۔۔غیرت کے آگے۔۔۔اپنی اکلوتی بٹیا کو بھی۔۔۔!''

''اتنی بڑی بے غیرتی تو ہمرے خیال سے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی''۔میں جھنجھلا کر بولا تھا۔

''اُو کیسے بھیّا؟ تنی ہم کو بھی تو سمجھائے دو''۔وہ کمر پہ دونوں ہاتھوں کو رکھے میرے مقابل آن کھڑا ہوا۔

''بٹیا باپ کی ناک ہوتی ہے، یہ تو مانتے ہو نا؟''

''ہاں!''۔اُس نے زور سے سر جھٹکا۔

''ناک کٹ جائے اور باپ زندہ رہے کیا یہی غیرت کا تقاضہ ہے؟''۔

یہ سُنتے ہی نارائن کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''بھیّا۔۔آگے اور کہاں جارہے ہیں۔۔آپ کا گھر تو آگیا''۔۔سُدرشن کی آواز پر میرا تخیّل ٹوٹا۔۔۔وہ میرے آگے ہاتھوں کو جوڑے کھڑا تھا۔''بھیّا۔۔ہم جو بھی آپ سے کہے ہیں، بھگوان کے لیے اس کی چرچا کسی سے نہ کرنا''۔

''ارے ای بھی کوئی کہنے والی بات ہے''۔کہتے ہوئے اُسے سینے سے لگا لیا۔''اطمینان رکھو۔۔۔جاؤ کھا پی کے سوؤ۔۔۔سویرے نارائن کے یہاں ساتھ چلیں گے''۔

ابھی صبح پوری طرح بیدار ہوئی بھی نہ تھی کہ خبر آئی نارائن کے زندگی کی شام ہوگئی۔میں دوڑا دوڑا اُس کے گھر پہنچا۔اُس کے گھر کے اطراف سارا گاؤں اُمڈ آیا تھا اور سبھی نارائن کے اس ناگہانی موت پر افسردہ تھے۔میں کسی طرح بھیڑ کو کاٹتے چھانٹتے کھمبا تک پہنچا۔ایک کونے میں اُس کے والد غم سے نڈھال بیٹھے تھے، مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر سینے سے لگا لیا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔نارائن کی بیوی الگ پچھاڑیں کھا کھا کر بے ہوش ہورہی تھی اور بڑی بیٹی نارائن کے سینے پہ چہرہ رگڑتے ہوئے بین کررہی تھی۔عورتیں اُسے پکڑ کے کھینچ رہی تھیں لیکن وہ تھی کہ باپ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔یہ دلدوز منظر دیکھ کر میرے ذہن کے مانیٹر پر وہ منظر بار بار ریورس ہو کر چلنے لگا تھا جسے رات سُدرشن نے میرے شعور کے کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈ کر دیا تھا۔اور میں سوچنے لگا کہ اُس گھڑی نارائن پر کیا گزری ہوگی جب اُس نے اپنی جان سے زیادہ پیاری بیٹی کو اُس بے حیائی کی کوٹھری میں دیکھا ہوگا؟۔جبکہ اُن لمحات کا میں تصوّر کرتا ہوں تو میرا سینہ پھٹنے لگتا ہے، دماغ میں ہزاروں ٹن آر ڈی ایکس کے دھماکے ہونے لگتے ہیں اور آنکھوں میں سونامی، کیٹرینا، آئیلا اور فیان سب ایک ساتھ گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔

وہ منظر اب بھی ذہن کے مانیٹر پر متحرک ہے، جسے delete کرنے کی خاطر میں خیال کے کرسر (curser) کو جُنبش دیتا ہوں۔۔۔ارے! یہ کیا؟ منظر بجائے delete ہونے کے تبدیل ہو گیا ہے۔۔۔اب نارائن اور اُس کی بیٹی کی بجائے، رادھیا کی پنکھے سے جھولتی لاش اور مرلی سنگھ کا مسکراتا ہوا چہرہ مانیٹر پر ہائی لائٹ ہورہا ہے۔اسی کے ساتھ میری سوچیں بھی متحرک ہو جاتی ہیں کہ کوئی بیٹی آبرو گنوا بیٹھتی ہے تو باپ اُسے خودکشی پر مجبور کر کے اُس کی موت پر بے غیرتی سے مسکراتا ہے۔۔۔کوئی بیٹی آبرو باختہ ہو جاتی ہے تو باپ بجائے اُس سے کچھ باز پُرس کرنے کے خود غیرت سے مر جاتا ہے۔۔۔اور بیٹی باپ کے مُردہ سینے پہ چہرہ رگڑ رگڑ کر بے غیرتی سے بین کرتی ہے، کیوں؟۔۔۔کیا اس لیے کہ مُردہ باپ کا غیرت مند سینہ اُس کے چہرے کی کالک کو اپنے اندر جذب کرلے گا؟؟

۔ نذرانے ۔

آج کے دور میں جب عالمی معاشی ادارے غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی تعداد، دو ارب سے متجاوز بتلاتے نہیں تھکتے وہیں ''رام نومی'' کے موقع پر بھارت کی ریاست آندھرا پردیش کے شہر ترو ملا میں واقع ترو پتی بالا جی مندر میں ایک روز کے اندر چڑھاوے کی صورت میں پانچ کروڑ پچھتر لاکھ جمع ہوتے ہیں جبکہ اُس کے چند یوم بعد صدر پاکستان آصف علی زرداری خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی درگاہ پر حاضری کے دوران دس لاکھ ڈالر نذرانے کے طور پر دیتے ہیں جو بھارتی کرنسی میں پانچ کروڑ سے زائد اور پاکستانی کرنسی میں نو کروڑ سے اوپر رقم بنتی ہے۔

''کمالِ بندگی''

محمودالحسن
(راولپنڈی)

مقامِ عشق و مستی کا خرّد سے واسطہ کیا ہے　　خُدا کے سامنے بندہ کی میں کیا ہے اَنا کیا ہے

کمالِ بندگی اِک جاں سپاری کے سوا کیا ہے　　خدا بندہ سے کیوں پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تجھے معلوم ہو گا جب جبیں خاک آشنا ہو گی　　عُروجِ بندگی کیا ہے، بشر کی انتہا کیا ہے

نہ جب تک کربلا پر خاک وخُوں کا رنگ اُبھرا تھا　　کسی کو کیا خبر تھی شیوۂ اہلِ وفا کیا ہے

مرا مقصود ہے بس اِک وصال یار کا لمحہ　　نہیں مجھ کو غرض اس سے فنا کیا ہے بقا کیا ہے

اِدھر اہلِ جنوں کے ہاتھ میں ہے، دامنِ نیرواں　　کوئی پوچھے کہ اب اہلِ خرد کا فیصلہ کیا ہے

بہت بیباک ہے قلب ونظر کے دور میں انساں　　رہے ملحوظِ خاطر یہ کہ آئینِ حیا کیا ہے

مریضِ جاں بلب کے سامنے ہے غزلِ جاناں　　تو پھر چارہ گرواب یہ دُعا کیا ہے دَوا کیا ہے

بہت نازاں تھے اپنے آپ پر مہر و مہہ و انجم　　نہ تھی اُن کو خبر جب تک کہ تنویرِ حرا کیا ہے

ہنسی آتی ہے اُن کی سادگی پر بارہا مجھ کو　　وہ مجھ سے پوچھتے ہیں جب کہ میرا مُدعّا کیا ہے

بہت ہے فاصلہ بے شک درِ محبوب تک لیکن　　اگر ہمّت کرے انساں تو پھر یہ فاصلہ کیا ہے

بھروسہ ناؤ پر اور ناخدا پر تھا ہمیں لیکن　　بھنور میں آ گئی کشتی تو پھر سمجھے خُدا کیا ہے

وَفا کے بعد اُمیّدِ کرم وہ بھی محبت میں　　اگر یہ بھی نہیں تو اور توہینِ وفا کیا ہے

وہ دل ہی کیا نہیں جو داغ داغ اُن کی محبت میں　　نہیں جو تار تار اے دل وُہ دامانِ وفا کیا ہے

اگر محمودؔ میں اُن کی کبھی تعریف کرتا ہوں
زبان وحرف ہیں اُن کی عطا تیری ثنا کیا ہے

○

سید مشکور حسین یاد

(لاہور)

اُس شوخ نے بہار کا عنواں ہمیں کہا
اب کیا بتائیں کیسے گلستاں ہمیں کہا

ہم اپنی بے خودی کے حوالوں میں کھو گئے
دانا ہمیں کہا کبھی ناداں ہمیں کہا

تحریکِ بے پناہ کے مانند ہم اُٹھے
ہمّت فزائے عالمِ اِمکاں ہمیں کہا

پر کیسے بیٹھ سکتے تھے ہم اپنے آپ میں
مُشکل کے ساتھ ساتھ جو آساں ہمیں کہا

ہم اُس حسیں چہرے کے جلوؤں کا تھے جمال
حالانکہ زلف زلف پریشاں ہمیں کہا

پہلے تو ڈھونڈتے رہے وہ دربدر ہمیں
دریافت کر کے داورِ دوراں ہمیں کہا

تھے یاؔد ہم بہار و خزاں کی عجب مثال
یوں باغ باغ بینِ بیاباں ہمیں کہا

○

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

معلوم نہیں بیتے ہوئے کل میں کہاں ہوں
دیکھو تو مجھے وقت کے جنگل میں کہاں ہوں

قطرے کی طرح جذب ہوا جاؤں زمیں میں
اس شہر پہ چھائے ہوئے بادل میں کہاں ہوں

موتی ہی سہی خوار ہوں پلکوں سے ٹپک کر
میں خاک نشیں آپ کے آنچل میں کہاں ہوں

میں پیاس ہوں اس دشت میں احساس ہے میرا
پانی کی طرح درد کی چھاگل میں کہاں ہوں

ساکن ہوں کسی شام کے تیور کی طرح میں
میں صبح کی مچتی ہوئی چھل بل میں کہاں ہوں

رہتا ہوں سیہ رات کے ٹھہراؤ میں ثاقبؔ
لہروں کی طرح آنکھ کے کاجل میں کہاں ہوں

○

سرورانبالوی
(راولپنڈی)

کِسی صُورت عیاں سوزِ دلی ہونے نہیں دیتے
کبھی ہم سرنگوں اپنی خودی ہونے نہیں دیتے

ہمارے ضبط کے معیار کی رخصت کے کیا کہنے
کہ ظاہر خود پہ بھی دل کی لگی ہونے نہیں دیتے

فصیلِ شہر پر خُوں سے چراغاں کر دیا ہم نے
تمہارے راستے میں تیرگی ہونے نہیں دیتے

ہزاروں تتلیاں رقصاں ہیں دامانِ تخیّل میں
کبھی نظروں کو رنگوں سے تہی ہونے نہیں دیتے

غمِ دوراں ہُوا رخصت غمِ جاناں کو لے بیٹھے
ہم اپنے دردِ دل میں تو کمی ہونے نہیں دیتے

یہ جو ہمدرد ہیں میرے یہ جو ہمدرد ہیں اُن کے
یہی تو اُن سے ربطِ باہمی ہونے نہیں دیتے

کوئی پودا اُگا ہمسائے فوراً کاٹ دیتے ہیں
یہ میرے صحن میں سایہ کبھی ہونے نہیں دیتے

سُرور انبالوی اُونچے مکاں روشن تو ہیں لیکن
غریبوں کے گھروں میں روشنی ہونے نہیں دیتے

○

غالب عرفان
(کراچی)

پوچھئے مت کہ ملا کیا ہے شناسائی میں
پایا ہے کربِ مسلسل شبِ تنہائی میں

جو بھی تہذیب کے دامن میں ہے اپنایا اُسے
میں نے دیکھا نہیں تاریخ کی گہرائی میں

ایک تہذیب کا شہکار موہنجوداڑو
مجھ پہ کھُلتا گیا مہران کی گیرائی میں

مسکراہٹ بھرے لب ہوں کہ نشیلی آنکھیں
سب دکھاوا تھا مگر اُس کی پذیرائی میں

شہر یا دشت میں وہ تازہ ہوا مل نہ سکی
جو ملی ہے مجھے سیاحتِ دریائی میں

ڈال دیتا ہے نئی روح وہ مورت میں بھی
بولتا حسن ہے فن کار کی صنّاعی میں

جس کے ساحل پہ پھسلتا ہوں میں چلتے چلتے
خشک دریا کی کہانی ہے اُس کائی میں

ساز خوشیوں کا ہے اور خوشیوں میں بجتی ہے مگر
غم کا اک سُر بھی چھپا ہوتا ہے شہنائی میں

راگ میں کوئی کشش تھی نہ ہی موسیقی میں
رس بھرا گیت سمٹ آیا تھا استھائی میں

مدتوں بعد ملا تو نہ میں پہچان سکا!
اُس کی سانس اکھڑی تھی پھر ذات کی رُسوائی میں

اُس کی یادوں کے تسلسل کے نئے دیپ جلے
لمسِ عرفاںؔ کی مہک آئی جو پُروائی میں

○

مہندر پرتاپ چاندؔ
(انبالہ شہر، بھارت)

کوئی جتن ، کوئی تدبیر کارگر ہی نہیں
میرے خلوص میں شاید وہ اب اثر ہی نہیں!

حواس گُم ہیں، زباں بند، منتشر اُفکار
کوئی بھی چیز اب اپنے مقام پر ہی نہیں

کرے بھی کوئی تو اَب کِس کا اعتبار کرے؟
کِسی زباں پہ کوئی حرف معتبر ہی نہیں!

مبالغے ، یہ ستائش ، یہ کھوکھلی تنقید
پَرکھنے والی وہ بے لاگ اب نظر ہی نہیں!

کھلے ہیں پھول تو آنگن میں ہر برس کی طرح
بَھرا پُرا سا جو لگتا تھا اب وہ گھر ہی نہیں

یہ دل گرفتگی ! یہ ہولناک تنہائی!
اُداسیوں سے کسی طور اب مفر ہی نہیں

وہ ساحلوں سے ابھی تک پکارتا ہے مجھے
میں کب کا ڈُوب چکا ہوں اُسے خبر ہی نہیں

نہ جانے زد میں کس آسیب کی ہے، دل کی مُراد
ہو باروَر کِسی رُت میں، یہ وہ شجر ہی نہیں

حیات و موت کا یہ سلسلہ عجب ہے چاندؔ
کبھی جو ختم بھی ہوگا، یہ وُہ سفر ہی نہیں

○

پروفیسر انتظار باقیؔ
(جھنگ)

در پر کبھی گرے تو کبھی گھر میں گر گئے
ہم تو گلوں سے پہلے ہی پت جھڑ میں گر گئے

چشمِ چمن میں کھوجتے ہو خواہشِ نُمو؟
زرخیزیوں کے خواب تو بنجر میں گر گئے

پھر یوں ہوا کہ جلنے لگا دامنِ شراب
لہرا کے چند اشک جو ساغر میں گر گئے

سائے لحاف اوڑھ کے نکلیں گے آج رات
شہتیر جسم ٹوٹ کے بستر میں گر گئے

بعد از طویل راہِ سفر ، ہانپ ہانپ کر
دریا سبھی ، عریضِ سمندر میں گر گئے

کیا پُوچھتے ہو؟ عزمِ سفر کی شکستگی
گرنا لکھا تھا اپنے مقدّر میں ، گر گئے

نقطے فقط بچے میری تحریر کے لیے
سب لفظ تیری دید کے منظر میں گر گئے

ابھریں گے سطحِ وقت پہ جانے یہ کس طرح!
دن، رات کے وسیع سمندر میں گر گئے

باقیؔ کچھ اُس طرح سے ہُوا ہے سفر تمام
چوکھٹ تلک تو پہنچے مگر در میں گر گئے

○

تشنہ بریلوی
(کراچی)

یک جان ہوئے آہن و ریشم مرے اندر
ہیں شیر و شکر شعلہ و شبنم مرے اندر

ہر لحظہ ہے برسات کا موسم مرے اندر
دیکھے کوئی اشکوں کی چھما چھم مرے اندر

دو ایک ہی غم ہوں تو چلو صبر بھی کرلوں
کیوں بس گئے دنیا کے سبھی غم مرے اندر؟

کیوں روک رہا ہے مجھے اے واعظِ ناداں!
یہ چیز تو بن جائے گی زم زم مرے اندر!

یہ کیسی ہوا آج چلی ہے کہ خوشی بھی
کرتی ہے بپا شورشِ ماتم مرے اندر

کچھ اپنی خبر ہے نہ کوئی فکر جہاں کی
آباد ہے اک اور ہی عالم مرے اندر

اب بھی بغاوت کا علَم ہاتھ میں میرے
ہے اب بھی نہاں لغزشِ آدم مرے اندر

خوددار بنایا ہے مجھے شعر و ادب نے
تشنؔہ طلب رُتبہ ہے کم کم مرے اندر

○

نذیر فتح پوری
(فتح پور، بھارت)

گھر کی دولت جانے کتنے بے گھروں میں بٹ گئی
روشنی آنکھوں سے پھوٹی، منظروں میں بٹ گئی

اب کہاں سیرِ فلک کا حوصلہ باقی رہا
طاقتِ پرواز ساری مشوروں میں بٹ گئی

نور کی تہذیب میں ہے کس بلا کی برکتیں
اک دیئے کی روشنی کتنے گھروں میں بٹ گئی

دیکھئے دن کی شرافت کا امیں ہوتا ہے کون
رات کی آوارگی تو سر پھروں میں بٹ گئی

آج مرے دور میں ہے یہ شرافت کا نصیب
ایک شہزادی کئی جادوگروں میں بٹ گئی

دھیرے دھیرے حوصلوں نے موت کو اپنا لیا
دھیرے دھیرے زندگانی مقبروں میں بٹ گئی

پاسکا نہ کوئی بھی رتبہ شہادت کا نذیؔر
تنہا اک تلوار تھی، کتنے سروں میں بٹ گئی

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا،امریکہ)

قسط......۱۲

ایک اور تھپڑ (مگر پیار کا)

ہمارا نیا اسکول جسکا میں تفصیل سے گزشتہ ابواب میں تذکرہ کر چکا ہوں بہت حد تک شہر کے آخری سرے پر جنگل کے نزدیک تھا۔ پھر ہماری کلاسیں بھی سیکنڈ شفٹ میں ہوتی تھیں۔ خاص طور سے سردیوں میں چھٹی ہوتے ہوتے سورج غروب ہو جاتا تھا اور گھر آتے آتے اندھیرا ہو جاتا تھا اماں میرا بیقراری سے انتظار کرتی تھیں۔ ہمارے اسکول کے بالکل سامنے کھیلوں کا ایک بڑا میدان ''کیمپنگ گراؤنڈ'' تھا جس پر بعد میں گاما اسٹیڈیم تعمیر ہوا۔ اس میں مختلف کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں میرپور خاص میں کھیلوں کا بڑا رواج تھا۔ اس کے علاوہ کھیلوں کا معیار بھی بہت بلند تھا اور انکا بڑے اعلیٰ پیمانے پر اہتمام ہوتا تھا۔ اس میں بھی چوہدری رفیق، فروٹ فارم کے سربراہ رضوی صاحب، ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر آرائیں صاحب اور ہاکی کے حوالے سے خاص طور سے پولس انسپکٹر منصور بیگ قابل ذکر ہیں۔ اسکے علاوہ شہر میں فٹ بال کی کئی ٹیمیں موجود تھیں جنکی کفالت زمیندار ہوٹل کے مالک اور دوسرے تجارتی طور پر مخیّر حضرات کرتے تھے۔

منصور بیگ کی کوششوں سے ہاکی اور فٹ بال کے کل پاکستان ٹورنامنٹ ہوتے تھے۔ فٹبال میں ایک مکرانی شیرو بہت مشہور اور مقبول تھا (اسکے علاوہ گوا کا ایک کرسچین روڈریگز بھی فٹبال میں ممتاز تھا) شیرو اپنی ٹیم کا کپتان اور گولی تھا۔ کم از کم ہم میرپور خاص والے یہ سمجھتے تھے کہ اس سے اچھا گولی پورے پاکستان میں نہیں۔ جب اسکی ٹیم کسی دوسری ٹیم سے کھیلتی تھی تو لوگ صرف اسی کا کھیل دیکھنے جاتے تھے۔

ایک دن صبح ہی سے اسکول میں یہ تذکرہ ہوا کہ آج شام اسکی ٹیم کا مقابلہ کراچی کی سب سے اچھی ٹیم سے ہے۔ شہر میں اسکی وجہ سے بڑا جوش وخروش تھا۔ کوئی تین بجے میچ شروع ہونا تھا۔ اسکی وجہ سے ہماری چھٹی بھی جلدی ہو گئی۔ زیادہ تر بچے تو گھر چلے گئے مگر مجھے کھیل دیکھنے کا بڑا شوق تھا میں اسکول سے نکل کر کھیل دیکھنے گراؤنڈ میں بیٹھ گیا۔

کھیل بہت دلچسپ تھا اور مقابلہ کانٹے کا تھا۔ شیرو اچھل اچھل کر اور کبھی مجھے لگتا کہ ہوا میں اڑ اڑ کر حملے روک رہا ہے۔ کھیل ختم ہوتے ہوتے پانچ بج گئے اور اس کے بعد انعامات کی تقسیم میں کچھ اور دیر لگی۔۔۔ میں اس سب تماشے میں محو تھا کہ اچانک ایک زناٹے دار تھپڑ میرے بائیں گال پر پڑا اور گرجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی ''کم بخت تُو یہاں بیٹھا ہے اور ہماری فکر اور پریشانی سے جان آدھی ہوگئی'' اُف میرے خدا یہ آواز تو میری ماں کی تھی!!! انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتی ہوئی مجھے گھر کی طرف لیکر چلیں۔

دراصل میں اپنے معمول میں بہت ہی باقائدہ تھا اور کبھی اماں کو بتائے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا اور ہمیشہ وقت پر گھر آتا تھا۔ میرا گھر آنے کا وقت ساڑھے چار اور پانچ کے درمیان تھا آج ایک تو یہ کہ نہ صرف چھ سے بھی زیادہ بج گئے تھے دوسرے ہماری کلاس میں پڑھنے والے دوسرے بچے جلدی چھٹی ہونے کی وجہ سے ساڑھے تین بجے گھر پہنچ گئے تھے جسکی اماں کو خبر نہیں تھی مگر جب میں چھ بجے تک گھر نہیں پہنچا اور اماں نے پڑوس میں بچوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا چھٹی تو تین بجے ہوگئی تھی ہمیں نہیں معلوم فیروز کہاں ہے۔ اس پر میری اماں پریشان ہو کر مجھے ڈھونڈنے نکلیں اور مجھے گراؤنڈ میں پایا۔ یہ تھپڑ انکے پیار کی نشانی تھا۔

اسی واقعہ کے تناظر میں اِس کے سالوں بعد کا ایک واقعہ بھی شائد قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو۔ میں ۱۹۷۶ء میں چار سال بعد امریکا سے اپنی تعلیم مکمل کر کے کچھ مہینوں کے لئے پاکستان گیا تھا۔ ہم ناظم آباد میں رہتے تھے اور ابھی تک میرے پاس کار نہیں تھی۔ میں ساڑھے تین بجے اپنے بہت ہی شفیق سینئر ڈاکٹر سید محسن احمد (جو آج بھی کراچی میں بچوں کے سب سے بڑے اور کامیاب ڈاکٹر ہیں) سے ملنے کلفٹن گیا۔ اماں کے پوچھنے پر میں نے ان سے کہا تھا کہ میں سات بجے تک گھر آجاؤنگا۔ پانچ بجے کلنک ختم کر کے ڈاکٹر احمد مجھے ضد کر کے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں پہنچ کر انکی بیگم ڈاکٹر رشیدہ میرے سر ہوگئیں کہ میں انہیں کے ساتھ کھانا کھاؤں اور اسکے بعد ہم سب ریکس میں ایک اچھی انگریزی فلم دیکھیں۔

میں نے ان سے بہت معذرت کی کہ میں آج یہ سب نہیں کرسکوں گا۔ بہت اصرار پر میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنی اماں سے سات بجے گھر پہنچنے کا کہہ کر آیا ہوں میں کسی صورت میں ڈیڑھ بجے رات تک، انہیں بتائے بغیر گھر سے غائب نہیں رہ سکتا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ نہ صرف ہمارے یہاں بلکہ ہمارے کسی آس پڑوس میں بھی ٹیلیفون نہیں تھا۔ ڈاکٹر احمد کا ڈرائیور بھی جا چکا تھا اگر ہوتا بھی تو اسے میرا گھر نہیں معلوم تھا اور ناظم آباد کی تنگ گلیوں میں گھر تلاش کرنا ناممکن تھا۔ مگر میں بضد تھا کہ میں ان حالات میں انکی یہ فرمائش پوری نہیں کرسکتا ادھر وہ محبت کے مارے مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ آخر ڈاکٹر احمد خود اپنی کار میں مجھے کلفٹن سے کراچی کے پر ہجوم ٹریفک میں ناظم آباد لیکر آئے جہاں

ہمارے دروازے پر گاڑی روک کر میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اپنی امّاں سے کہا کہ صرف آپ کو بتانے آیا ہوں کہ میں رات دیر گئے واپس آؤنگا میری امّاں نے صرف ایک جملہ کہا ''بہت اچھا کیا کہ تم مجھے بتانے آگئے ورنہ مجھے فکر ہوجاتی ''ہم الٹے پاؤں واپس گئے اور شام کا لطف لیا۔ڈاکٹر احمد اب بھی اسے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں ''بھئی تم بھی خوب ہو''

خیر میری امّاں تو ڈسی پلن کے معاملے میں بڑی ہی سخت تھیں اور جبکہ میں میڈیکل کالج میں تھا اس وقت بھی میری کج بحثی پر ایک آدھ تھپٹر جڑ دیا کرتی تھیں۔اسکے علاوہ جب سلطان بھائی جان گارڈ ہو چکے تھے تو انکی بھی کسی بات پر ناراض ہوکر ان کی پیٹھ پر دو ہتھڑ مار دیتی تھیں یہ لکھتے ہوئے مجھے وہ بہت یاد آرہی ہیں کہ اب مجھے تھپٹر جڑنے والی وہ شفیق ہستی نہیں رہی اگر چہ اب میرے اپنے بال سفید ہو چکے ہیں لیکن اگر وہ حیات ہوتیں اور میرے ایک تھپٹر مارتیں تو میں ادب اور محبت سے اپنا سر جھکا دیتا۔

جن بھوت یا نمونیا

میر پورخاص میں میوات قبیلے کے کئی کنبے رہتے تھے۔میوات کا علاقہ دراصل دہلی کے اطراف میں واقع ہے۔اس میں گڑگاؤں، ریواڑی اور دوسرے علاقے شامل ہیں اور یہاں کے رہنے والے ''میو'' کہلاتے ہیں ۔پاکستان بننے کے بعد یہ لوگ پاکستان آگئے اور پنجاب میں وہاڑی اور سندھ میں میر پوخاص میں بس گئے۔کم از کم اُس دور میں یہ لوگ اپنی پسماندگی، غربت، کم علمی (اگر اجازت دیں تو صحیح لفظ جہالت ہے) اور توہم پرستی کے لئے مشہور تھے۔نام کو مسلمان ہیں مگر کسی کو نماز روزہ قرآن سے کوئی واسطہ نہیں اور اپنی کم علمی کی وجہ سے بچوں کے صحیح نام بھی نہیں رکھ سکتے اور ہم لوگ کبھی کبھی انکے نام سن کر ہنسا کرتے تھے کہ یہ کیا نام ہے (ایک آدمی کا نام چکا چک تھا اور ایک دوسرے کا کھمبا) روائت تھی کہ جب بچہ پیدا ہوتا تھا تو جو چیز بھی سامنے نظر آتی تھی بس اسی پر اسکا نام رکھ دیا جاتا تھا۔اسکے علاوہ یہ خانہ بدوش تھے اور شہر میں کسی درخت کے تلے کچی زمین پر اپنا بسیرا کر لیتے تھے۔مرد زیادہ تر لکڑیاں چیرنے اور تیل مالش کر کے اپنا گزارا کرتے تھے۔سردیوں کا زمانہ تھا۔ایک دن میری امّاں تانگے میں ہیرآباد جارہی تھیں۔انہوں نے دیکھا کے سڑک کے کنارے کچھ میو جمع ہیں انکے درمیان ایک آدمی لیٹا ہے اور ایک دوسرا ذرا پختہ عمر آدمی اسکی ناک میں ایک لمبی سی بتی گھسیڑ رہا ہے۔مریض مستقل کھانس رہا ہے اور اس بتی کی وجہ سے اسکی حالت اور خراب ہو رہی ہے مگر تین چار مسٹنڈوں نے اسے جکڑا ہوا ہے۔میری امّاں تو سماجی خدمت میں پورے شہر میں مشہور تھیں اور کچھ لوگوں کے بقول ہر ایک کے پھٹے میں پاؤں ڈالنا (اسکی بھلائی کے لئے) تو انکی عادت تھی ان کے ہم عمر کزن انہیں مزاق میں شہر قاضی کہا کرتے تھے۔انہوں نے فوراً تانگہ رکوایا اور لوگوں کو ڈانٹا کہ کیا کر رہے ہو اسکی بیوی نے روتے ہوئے انہیں بتایا کہ کل سے سانس پر تکلیف ہے اور اس پر جن بھوت کا سایہ ہوگیا ہے یہ عامل اسکا جن اتار رہا ہے۔میری امّاں نے انہیں مزید ڈانٹا کہ بے وقوفو یہ جن بھوت نہیں بلکہ اسے نمونیا ہو گیا ہے۔انہوں نے اسے تانگے میں ڈالا اور اپنا راستہ بدل کر اسکو لیکر ڈاکٹر ڈراگو کے ہسپتال پہنچیں۔ڈاکٹر نے فورا اسکو انجکشن لگایا اور کئی دوائیں دیں جو وقفے وقفے کے بعد دینی تھیں۔امّاں اسکو گھر لے آئیں کیونکہ یہ کسی درخت کے نیچے کھلی ہوا میں پڑا ہوا تھا۔اسکا بستر ہماری جافری (ٹیریس) میں لگایا اور وقت وقت پر اسے دوائیں پلائیں اسکی غذا کا انتظام کیا۔وہ دس دن میں ٹھیک ہوگیا۔وہ بچارہ اس قدر شکر گذار ہوا کہ جب تک ہم نے سن ساٹھ کی دہائی میں میر پور خاص نہ چھوڑ دیا اس نے ہماری چوکھٹ نہیں چھوڑی کہتا تھا میں تو اپنی موسی کا غلام ہوں۔

ڈاکٹر ڈراگو اور دیگر ڈاکٹر صاحبان

اس موقعہ پر مناسب ہے کہ میر پور خاص کی ایک بیحد قابل تعظیم، فرشتہ خصلت، مسیح الوقت اور درویش صفت ہستی کا تذکرہ کیا جائے۔یہ ہستی تھی ڈاکٹر ڈراگو کی۔دراصل میں نے کئی دفعہ اپنے میر پور خاص کے پرانے ساتھیوں کے درمیان بیٹھ کر یہ بات کہی ہے کہ اگر ہمارا معاشرہ اس کی اجازت دیتا تو جس ایک ہستی کا مجسمہ میر پور خاس کے وسطی چوک میں نسب کیا جانا چاہئے تھا وہ ڈاکٹر ڈراگو تھا۔

ڈاکٹر ڈراگو کا پورا نام ایچ ایم اے ڈراگو تھا۔یہ گوا کی کرسچین کمیونٹی کا فرد تھا اور اس نے بمبئی کے میڈیکل کالج سے شاید ۱۹۳۵ میں ایم بی بی ایس کیا تھا۔یہ پاکستان بننے سے پہلے ہی میر پور خاص آگیا تھا اور اسنے اپنی پرائیویٹ کلنک کھرے کوارٹر کے علاقے میں کھول لی تھی۔کلنک میں اسکا بھائی جارج ہیڈ کمپاؤنڈر تھا۔اس کے ہاتھ میں اللہ نے خاص شفا دی تھی اور اسکی کلنک کے باہر صبح پانچ بجے سے نمبر لینے والوں کی قطار لگ جاتی تھی۔میری اماں کو مسز ابن عباس کہتا تھا اور ان سے خوب واقف تھا۔یہ غریب لوگوں کا مفت علاج کرتا تھا اگر کسی مریض کو دیکھنے گھر آتا اور دیکھتا کہ یہ اسکی مدد نہیں کر سکتا تو کبھی فیس نہیں لیتا تھا اسکے علاوہ درجنوں طالب علموں کی مالی امداد کرتا تھا۔میر پور خاص میں ٹی بی سنٹر بھی اسی کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔تعلیمی سرگرمیوں اور غیر نصابی سرگرمیوں کی خاص سرپرستی کرتا تھا۔میں نے جب نویں کلاس میں بین المدارس مباحثوں میں پہلا انعام جیتا تو انعامی کپ کے علاوہ سامعین میں موجود شہر کی ممتاز شخصیتوں نے لفافے میں رکھ کر کچھ ذاتی انعام بھی دئے۔ڈاکٹر ڈراگو کا انعام سب سے بڑی رقم کا تھا۔اسکی کلنک کے باہر چبوترے پر گاؤں سے آنے والے غریب اور گنوار لوگ اسطرح پڑے ہوتے تھے جیسے یہ مسافر خانہ ہو۔مجھے اپنا ایک ذاتی واقعہ یاد آتا ہے جو یوں تو کئی سال بعد کا ہے مگر اسکا یہاں تذکرہ نا مناسب نہ ہوگا۔میں نے اپنے میڈیکل کالج کی زیادہ تر پڑھائی مانگے کی کتابوں سے پڑھی، اس میں میر پور خاص کے دولڑکے عبداللطیف چغتائی اور چندر دھانول نوتانی جو میرے دوست تھے انکا بڑا کردار تھا۔وہ مجھ سے ایک سال

آ گئے تھے اور اسلئے جب میں انکے بعد کسی کلاس میں آتا تھا تو وہ مجھے اپنی کتابیں دے دیتے تھے۔ مگر ہمارے یہاں چوتھے سال میں امتحان نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے جب وہ پانچویں سال میں اور میں چوتھے سال میں پہنچا تو وہ مجھے کتابیں نہیں دے سکے۔ مجھے پیتھالوجی کی کتاب کی سخت ضرورت تھی۔ یہ کتاب اس زمانے میں پانچ سو روپے کی آتی تھی۔ حوالے کے لئے یہ لکھنا ضروری ہے کہ اسوقت ڈپٹی کلکٹر کی تنخواہ ساڑھے تین سو روپے ہوتی تھی۔ میں نے بہت غور کیا کہ میں کیا کروں آخر میں نے ڈاکٹر ڈراگو کو ایک خط لکھا اور اس سے درخوست کی کہ وہ مجھے یہ کتاب دلوادے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ڈاکٹر بن کر اسکے روپے واپس کردونگا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دوسرے ہی دن اسکا چپراسی ہمارے گھر مجھے بلانے آیا۔ میں جب اس سے ملا تو اس نے فوراً مجھ سے کہا کہ کتاب کی تفصیل لکھ کر دوں۔ ایک ہی ہفتے بعد اس نے مجھے بلا کر نئی کتاب میرے حوالے کی اور کہا مجھے روپے واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جب وقت آئے تو میں بھی کسی طالب علم کی اسی طرح مدد کردوں۔ اس موقعہ پر ہم ''سبحان اللہ'' کہتے ہیں مگر یہ ہم مسلمانوں سے گفتگو کے دوران کہتے ہیں۔ آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں یہ اس نیک فطرت عیسائی کے لئے کہوں، مگر میرا کہنا ضروری نہیں اس لئے کہ اللہ کے حضور اس کے لئے بہت سے لوگوں نے پہلے ہی دعائیں کی ہونگی۔ ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں میرپورخاص میں ایک طبی کانفرنس ہوئی جسمیں کراچی اور حیدرآباد کے نامی گرامی ڈاکٹرز نے شرکت کی، میں اس زمانے میں میڈیکل کے فائنل ایر میں تھا۔ شام کو ڈاکٹر ڈراگو نے انکو اپنے گھر پر ایک شاندار اور باوقار ڈنر پر مدعو کیا۔ مجھے پھر بڑی حیرت ہوئی جب اسکا بھائی جارج ہمارے گھر آیا اور اس نے مجھے بھی اس دعوت میں شریک ہونے کا دعوت نامہ دیا۔۔ ڈاکٹر ڈراگو اور میں، میں نے تو کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں ڈاکٹر ڈراگو کے گھر جاؤنگا، ایک بہت ہی پروقار عشائیہ میں اسکا مہمان ہونگا اور مجھے ملک کے اتنے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ساتھ گھل مل کر کھانا کھانے اور باتیں کرنے کا موقعہ نصیب ہوگا۔ میں آج بھی اسکی اس وسیع القلبی پر دل میں شکر گذار ہوتا ہوں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر سید تھے یہ بھی ایم بی بی ایس تھے انکی کلینک شاہی بازار میں کپڑا مارکٹ میں تھی پریکٹس واجبی سی تھی مگر ہمارے ان سے گھریلو تعلقات تھے انکے لڑکے بھی میرے ہم جماعت تھے۔ ڈھولن آباد میں ڈاکٹر صدیقی کی کلنک بڑی تھی اور سول ہسپتال کے علاوہ صرف انکے یہاں ایکسرے کی مشین تھی یہ کلنک ''فضل عمر ایکسرے کلنک'' کہلاتی تھی۔ نیو ٹاؤن میں ڈاکٹر اے آر خان اپنے مرضی کے مالک تھے بہت اچھے اور خوش ذوق انسان تھے جب دل چاہتا تھا کلنک کھولتے تھے ورنہ زیادہ تر چھٹی کیا کرتے تھے۔ انکی بیٹی سعیدہ خان اور بیٹا عبدالرب شاہ لطیف کالج میں میرے ہم جماعت تھے بعد میں دونوں نے ڈاکٹری پاس کی۔۔ ڈاکٹر کمال ایل ایم پی تھے ان کے صاحب زادے اقبال میرے بڑے بھائی کے دوست تھے انہوں نے بہت بعد لندن سے پڑھ کر واپس آ کر اپنے باپ کی کلنک سنبھالی تھی۔ ڈاکٹر نذیر برطانوی فوج کے ریٹائر کپتان تھے وہ بھی ایل ایم پی تھے اور ڈاکٹری سے زیادہ سماجی اور سیاسی کاموں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ میونسپلٹی کے چیئرمین بھی رہے اور انکے نام پر ایک سڑک بھی تھی۔ بس اسوقت تک یہی چند ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر صفدر حسین میرے میرپورخاص چھوڑنے کے بعد آئے تھے اور اسی زمانے میں ریلوے ہسپتال میں ڈاکٹر محمد علی بھی آئے جو بہت مقبول ہوئے۔

پھر کچھ سال بعد ڈاکٹر احمدانی نے نیو ٹاؤن میں کنویں کے سامنے اپنی کلنک کھولی۔ وہ بھی ایل ایم پی تھے مگر اپنے اخلاق، غریب پروری، اور صوم و صلوۃ کی پابندی کی وجہ سے مریضوں میں اسقدر مقبول ہوئے کہ بالکل ڈاکٹر ڈراگو کا مقابلہ کرنے لگے۔ انکا بڑا بیٹا ڈاکٹر حزب اللہ احمدانی میڈیکل کالج میں میرا کلاس فیلو تھا مگر افسوس وہ ڈاکٹری پاس کرنے کے چند ہی سال بعد اللہ کو پیارا ہوگیا۔ یہ بہت نفیس کنبہ تھا اور خاص طور سے میرے گھرانے کے ساتھ انکا سلوک بہت اچھا تھا۔ شاید انکا ایک اور بیٹا امداد احمدانی اب بھی سانگھڑ میں پریکٹس کر رہا ہے۔

محرم

میری بچپن کی یادوں میں ایک اور یاد بڑی خوشگوار ہے اور وہ ہے ہمارے شہر کے محرم یہ وہ دور تھا جب نہ صرف میرپورخاص بلکہ پورے پاکستان میں انتہائی بھائی چارے کی فضا قائم تھی۔ عوام میں ایک دوسرے کے جذبات اور اعتقادات کا احترام تھا۔ شیعہ سنی تو ایک ہی مذہب کے دو فرقے ہیں میرپورخاص میں تو وہاں کے ہندو شہریوں کے ساتھ بھی بہت ہی محبت اور برادرانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ میرپورخاص میں ایک بہت بڑی تعداد ہندوؤں اور عیسائیوں کی تھی اور یہ دونوں اقلیتیں مسلمانوں کے قدم بقدم چلتی تھیں۔ خاص طور سے زیادہ تر وکیل ہندو تھے میرا اپنا قریب ترین دوست (جو اب بھی میرا ویسا ہی دوست ہے جیسا پہلے تھا) چندر دھانو مل نوتانی بھی ہندو تھا۔ شیعہ سنیوں میں تو ایسا لگاؤ اور دوستی تھی کہ وہ ایک ہی کنبے کے افراد لگتے تھے۔ شیعہ فرقے کے سربراہ سید نوازش علی نقوی تھے۔ یوں تو مجالس اور دوسری تقریبات یکم محرم سے ہی شروع ہو جاتی تھیں مگر سات محرم سے تو یہ اپنے عروج پر پہنچ جاتی تھیں۔ ہمارے یہاں بھی ملیدہ اور شربت بنتا تھا اور لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہم شہر بھر کی مجلسوں میں بھی شوق سے شرکت کرتے تھے۔ عاشورے کے دن میرپورخاص کی مرکزی سڑک اسٹیشن روڈ جس کے دونوں جانب ہوٹلیں اور اعلی معیار کی دکانیں تھیں محرم کے جلوس کے لئے مختص ہو جاتی تھی۔ دونوں طرف ہزاروں لوگ کھڑے ہوتے تھے اور خواتین اور بچوں کے لئے ہوٹلوں کی دوسری منزل پر انتظام ہوتا تھا۔

پہلے سنیوں کے تعزیئے نکلتے تھے جن کے ساتھ روائتی ڈھول تاشے اور مختلف کرتب دکھانے والے ہوتے تھے اس میں ہمارے ریلوے کے لوکوشیڈ کا

بھی تعزیہ ہوتا تھا۔ساڑھے تین بجے انکا آخری تعزیہ نکل جاتا تھااور سڑک بالکل صاف ہو جاتی تھی۔آدھ گھنٹے تک یہ سڑک بالکل خالی رہتی تھی اور ایک سناٹا سا طاری ہو جاتا تھا۔پھرانتہائی وقاراور خاموشی کے ساتھ شیعاؤں کا علم، دلدل اور ایک نہایت سادہ اور سفید رنگ کا تعزیہ آہستہ آہستہ سڑک سے گذرتا تھا جس کے پیچھے عمائدین شہر نوحے پڑھتے اور ماتم کرتے گذرتے تھے۔میں نے اپنی آنکھ سے پروفیسر کرار حسین صاحب کو، جواس زمانے میں شاہ عبدالطیف کالج کے پرنسپل تھے چاک گریبان اور پریشان بال ماتم کرتے اس جلوس کی قیادت کرتے دیکھا ہے۔شام کوسنیوں کے تعزیئے بھان سنکھ آباد کے قبرستان کے پاس جوہڑ میں ٹھنڈے ہوتے تھےاور شیعاؤں کا جلوس مکھن شاہ کی درگاہ میں اختتام پذیر ہوتا تھا۔دن بھر جگہ جگہ سبیلیں لگتی تھیں اور دوسرے قسم کے کھانے پینے کا بندوبست ہوتا تھا معلوم نہیں وہی بھائی چارہ آج بھی ہے یا نہیں؟

ہائی اسکول کے آخری سال

میں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۶۱ میں دیا۔ہمارا میٹرک گیارہ جماعتوں کا ہوتا تھا کیوں کہ سندھ میں بمبئ کا تعلیمی نظام یعنی اسٹینڈرڈ سسٹم رائج تھا۔ہمارے بیچ کے فوراً بعد سندھ میں بھی ہائی اسکول کو دس جماعتوں کا کر دیا گیا تھا۔نویں جماعت کا ذکر میں کر چکا ہوں جس میں ہمارے استاد مسیح صاحب تھے اس کے بعد دسویں اور گیارھویں جماعت میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔میں نے اختیاری مضامین میں بایولوجی اور فزیالوجی لی تھی جسے جعفری صاحب بہت ہی اچھے انداز سے پڑھاتے تھے انکی ڈرائینگ بھی بہت اچھی تھی ۔خاص طور سے CARDIAC CYCLE جیسا انہوں نے پڑھایا ویسا ہمیں کوئی میڈیکل کالج میں بھی نہیں پڑھا سکا۔میں انہیں آج بھی اچھے الفاظ میں یاد کرتا ہوں

میری بے راہ روی

مگر جسکا تذکرہ یہاں ایمان داری سے کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نہ جانے کیوں اس دور میں میرا پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا۔اسکی وجہ یہ تھی کہ مجھے زندگی کے اور بہت سے معاملات سے دلچسپی ہو گئی تھی۔اشفاق بھی جا چکا تھا، مقابلے کی بھی کوئی تحریک نہیں تھی پھر مجھے اس سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا کہ میرے کتنے نمبر آتے ہیں اور یہ کہ میری بلا سے کہ کلاس میں کون اول آتا ہے۔بس دن بھر اپنی مہنہ بولی بھابی کے ساتھ ناولوں پر تبادلہءخیالات کرتا تھا،شام کو دوستوں کے ساتھ فروٹ فارم کی سیر کو جاتا تھا، رات کو اس وقت تک جب کہ تمام ریڈیو اسٹیشن خدا حافظ نہ کہہ دیں انکے پروگرام سنتا تھا، ریڈیو اسٹیشنوں کو خطوط لکھتا تھا اور اپنا نام نشر ہونے پر بڑی خوشی محسوس کرتا تھا۔بچکانہ افسانے لکھ کر رسالوں کو بھیجتا تھا (جو زیادہ تر رد کر دئے جاتے تھے) اور رات گئے ریلوے پلیٹ فارم کی بنچوں پر بیٹھ کر اپنے دوست رشید غوری یا مشرف حسین کے ساتھ گپیں لگاتا تھا امّاں نے کئی دفعہ سمجھایا بھی مگر میں ان کے کہنے پر چند دن تو ٹھیک ہو جاتا مگر پھر وہی کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔اس کے باوجود، اگر چہ اب میں کلاس میں سر فہرست تو نہیں رہا تھا شاید اصغر (عمرانی) یا لئیق اب سرفہرست تھے مگر پھر بھی میں کلاس کے بہت اچھے طلبہ میں گنا جاتا تھا۔مگر انہی دنوں جب میں میٹرک کے پری لیمنیری امتحان میں الجبرا میں فیل ہوتے ہوتے بچا تو میرے ہوش ٹھکانے آ گئے (ان دنوں میٹرک۔۔جو یونیورسٹی امتحان تھا، سے پہلے ایک امتحان ہوتا تھا جس میں فیل ہونے پر میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی) ادھر ایک دن میرے بڑے بھائی صاحب نے ایک شام میرے پاس آکر مجھ سے نرم مگر بہت ہی حتمی لہجے میں کہا کہ وہ مجھے دیکھ رہے ہیں کہ میں بالکل پڑھائی نہیں کر رہا اور فضول چیزوں میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں انہوں نے کہا کہ اب تک انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا ہے مگر مجھے اسکا احساس ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنی زندگی کنبے کی اور خاص طور سے میری بہبود کے لئے وقف کر دی ہے تا کہ میں ان حالات سے نہ گزروں جن سے وہ گزرے ہیں مگر اب وہ مجھے وارننگ دیتے ہیں کہ اگر میں میٹرک میں فیل ہو گیا تو وہ میری کفالت نہیں کرینگے اور مجھے خود اپنے آپ کو سپورٹ کرنا پڑیگا اور یہ کہ میٹرک فیل لڑکے کو کس قسم کی نوکری ملے گی یہ انہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھ پر ہر قسم کی پریشانی بہت جلد طاری ہو جاتی ہے اور میرا فکر کے مارے دم آدھا رہ جاتا ہے۔مجھے بُرے بُرے خیالات آنے لگے۔الجبرا میں میں اسقدر کمزور تھا کہ مجھے اسکا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں آنے والے دو مہینوں میں اس پر اس قدر دسترس حاصل کر لونگا کہ میٹرک کے معیار کے الجبرا میں پاس ہو جاؤں۔سندھ میں یہ ضروری تھا کہ میٹرک میں کامیابی کے لئے ہر مضمون میں علیحدہ علیحدہ کامیابی حاصل کی جائے۔الجبرا سے بلکہ الجبرا ہی کیا تمام ہی حساب سے تعلق رکھنے والے مضامین جیسے جیومیٹری اور ارتھمیٹک سے مجھے بڑی حد تک نفرت تھی۔ہمارے گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ ہم ٹیوشن رکھ لیتے۔ایسے وقت میں میرے نئے دوست رشید غوری نے جو ایک سال پہلے ہی سانگھڑ سے آیا تھا مجھے بڑا سہارا دیا۔

رشید سانگھڑ میں اپنے اسکول میں وہی پوزیشن رکھتا تھا جو ہمارے اسکول میں اشفاق اور مجھے حاصل تھی مگر چونکہ سانگھڑ کے اسکول میں سائنس نہیں تھی اس لئے اسے میر پور خاص آنا پڑا۔اگرچہ ہماری کلاس میں بھی وہ انتہائی ذہین لڑکوں میں شمار ہوتا تھا مگر اسکی اولیں حیثیت نہیں تھی ۔خاص طور پر الجبرا میں وہ نا قابل یقین حد تک تیز تھا۔اسکے عموماً الجبرا میں سو فیصد نمبر آتے تھے۔اس نے مجھ سے کہا کہ اب ہر شام فروٹ فارم کی کئی گھنٹے سیر اور ناولوں اور تازہ ترین فلموں پر تبصرے ختم اور اس کے بجائے ہم روزانہ الجبرا کی مشقیں کرینگے۔

اس نے انتہائی محنت اور جاں فشانی سے مجھے فائنل امتحان تک روزانہ الجبرا کی مشقیں کرائیں جس کی وجہ سے میں اس قابل ہو گیا کہ الجبرا میں پاس ہو سکوں۔یوں تو اشفاق بیگ اور چندر نوتانی سے بھی میری دوستی لازوال تھی۔۔اور الحمد وللہ آج بھی ہے مگر رشید کے ساتھ جو رشتہ بندھا اور جس طرح ہم

دونوں ہم پیشہ بنے اور ساتھ ساتھ رہے اور خاص طور پر میرے لئے اسکا جو خلوص تھا اسکو بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ اس وقت تک جب کہ میں نے ۲۶ جون ۱۹۷۰ کی رات گیارہ بجے کراچی سے لندن کی پرواز کے لئے اس سے گلے مل کر رخصت لی ہم تقریباً ہر جاگتے لمحے ساتھ رہے کیونکہ وہ ہائی سکول، شاہ لطیف کالج، لیاقت میڈیکل کالج اور سیونتھ ڈے ہسپتال میں میرے ساتھ رہا۔ افسوس وہ بچھڑنے کی گھڑی تھی، اسکے بعد گاہے گاہے ملاقاتیں اور خط کتابت تو رہی مگر پھر ہمارا مستقل ساتھ نہیں ہو سکا۔ وہ پہلے پاکستان کے دیہی علاقوں میں رہا پھر ۱۹۷۱ کی جنگ میں فوج میں طلب کر لیا گیا اور اسکے بعد لبیا چلا گیا۔ میری کوشش کے باوجود وہ امریکا نہ آ سکا۔ میں بار بار پاکستان گیا اور وہ بھی کئی دفعہ پاکستان آیا مگر بقول شاعر:

مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں

دور رہ کر بھی وہ میرا سب سے بڑا جذباتی سہارا تھا اس کا تذکرہ بار بار اور نہایت جذباتی طور پر آئیگا افسوس وہ گزشتہ سال دس نومبر کو لبیا میں ایک حادثہ کا شکار ہو کر مالک حقیقی سے جاملا۔ اللہ اس کے مرتبے بلند کرے۔

میٹرک کا نتیجہ

ایک بار پھر۔۔ میں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۶۱ میں گورنمنٹ ہائی اسکول میر پور خاص سے دیا۔ امتحان کی تفصیلات مجھے یاد نہیں مگر مجھے یہ بات یاد ہے کہ میں نے پرچے اتنے اچھے نہیں کئے جتنی مجھے توقع تھی۔ ظاہر ہے دو سال کی بے راہ روی، پڑھائی سے عدم دلچسپی اور حساب میں کمزوری رنگ لائی تھی۔ پھر بھی فزکس، بایولوجی، انگلش اور اردو میرے قدرتی طور پر مضبوط مضامین تھے۔ میں امتحان دیتے ہی حسب معمول کراچی چلا گیا۔ وہاں میں عام طور سے اپنے ماموں جان مظہر محمد کے یہاں ٹھہرتا تھا۔ انکا گھر اُس وقت ناظم آباد میں لبرٹی سنیما کے پاس تھا۔ اسوقت میری بہن بھی ناظم آباد میں تھیں مگر میں انکے یہاں تکلف سے کبھی کبھی ہی جاتا تھا بقول میری والدہ کے کہ داماد کا گھر ہے وہاں بہت زیادہ "ٹھنگنے" کی کوشش نہ کرنا۔

ماموں جان کے یہاں میری دلچسپی کا سبب میری بہت پیاری کزن غزالہ تھی جو قریبی دوست تھی اور جس سے میری بیحد ذہنی یگانگت تھی۔ ہم دیر تک رات گئے گھر کے باہر پڑی بجری پر، جو اسوقت بہت پر کیف طور پر ٹھنڈی ہو جاتی تھی، باتیں کرتے تھے۔ وہ اس وقت انٹر سائینس میں تھی اور اسکا ارادہ بھی میڈیکل کالج میں داخلے کا تھا۔ وہ مجھے اپنے کالج کے مزے مزے کے قصے سناتی تھی۔ اسکی سہیلیوں خاص طور سے زینت فرزانہ کریم سے بھی میری دوستی ہو گئی تھی اور وہ سب مجھے چھوٹے بھائی کی طرح ٹریٹ کرتی تھیں۔ ہم کسی کسی شام چورنگی کے علاقے میں (جو اس وقت اس قدر خوبصورت ہو گیا تھا کہ تفریح کے لئے صدر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی) گھومنے جاتے، چاٹ اور دوسری اچھی اچھی چیزیں کھاتے اور دیر تک وہاں کی خوبصورت دکانوں اور سڑک کے کنارے لگی جھلملاتی روشنیوں سے لطف اٹھاتے، میر پور خاص کے کم عمر لڑکے کو یہ مناظر مسحور کر لیتے مگر دل میں ایک پھانس تھی کہ ابھی نتیجہ نہیں آیا ہے اور اگر فیل ہو گیا تو زندگی برباد ہو جائیگی۔ یہ بات طے تھی کہ ہمارے گھر کے جو حالات تھے اس کے پیش نظر مجھے دوبارہ امتحان کی مہلت نہیں ملتی اور میں میٹرک فیل ہو کر کسی موٹر گیراج میں فٹر کی نوکری کے لئے دھکے کھاتا۔ میٹرک میں گیارہ مضامین تھے اور ہر ایک میں پاس ہونا لازمی تھا۔ مزید یہ کہ اس زمانے میں سپلیمنٹری امتحان نہیں ہوتا تھا۔ میں اس اچھے اور پر مسرت دور میں بھی کبھی کبھی غزالہ سے باتیں کرتے کرتے کھو جاتا تو وہ پوچھتی "کہاں کھو گئے؟" میں نہایت بجھے دل اور پریشانی سے ڈوبی آواز میں جواب دیتا "غزالہ میں امتحان میں فیل ہو جاؤنگا" اس پر وہ مجھے تسلی دیتی۔ ادھر خاندان بھر میں میٹرک کے نتائج کا سب کو بڑی بے صبری سے انتظار ہوتا تھا اور میرا رول نمبر سب کو معلوم تھا اس کی بھی شرمندگی تھی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہونگا کیونکہ ہمارے خاندان میں شاید ہی کوئی میٹرک میں فیل ہوا ہو۔

خدا خدا کر کے نتائج کی تاریخ کا اعلان ہوا۔ دوسرے دن اخباروں میں رزلٹ چھپنا تھا۔ مجھے آج بھی خوب یاد ہے کہ میں اس دن جتنا پریشان ہوا شاید ایسا پھر کبھی نہیں ہوا۔ میرا دل عجب طرح گھبرا رہا تھا۔ ہونٹ خشک تھے گلا لگتا تھا بند ہو گیا ہے پانی بھی حلق سے مشکل سے اترتا تھا۔ ہاتھوں میں عجب کپکپی تھی۔ میں نے اپنے ماموں جان کی سائیکل اٹھائی اور بے وجہ ناظم آباد کی پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ اس وقت ناظم آباد کے شمال کی جانب نارتھ ناظم آباد کی تعمیر شروع ہی ہوئی تھی۔ میلوں لق و دق چٹیل میدان تھا یا نئی بنی سڑکیں۔ میں نہ جانے کتنی دور نکل گیا، بس دل چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں۔ بہت دور جا کر ایک پلیا آئی میں وہاں سائیکل سے اتر کر اس پلیا پر بیٹھ گیا اور اپنے آپ میں گم ہو گیا ہر طرف سناٹا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، بس پھر تو جیسے بندھ ٹوٹ گیا پھوٹ پھوٹ کر رو یا اور اللہ سے نہ جانے کیسی کیسی معافیاں مانگیں، کیسے کیسے عہد و پیماں کئے کہ بتا نہیں سکتا واپس آتے آتے شام ہو گئی تھی۔ مگر گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا عجب بے چینی تھی، دل بہلانے اپنی بہن سلطانہ آپا کے یہاں چلا گیا۔ میرے بہنوئی اظہار سعید صدیقی جو مجھ سے بیحد محبت کرتے ہیں اور آج بھی وہ ماشاءاللہ حیات ہیں اور میری تمام زندگی انکی محبت سے شرابور ہے مگر وہ اپنی فطرت میں کچھ "ٹیڑھے" ہیں اور کج بحثی اور کبھی کبھی حوصلہ شکنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ جان کر کہ کل میرا نتیجہ آ رہا ہے مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرنے شروع کر دئے جیسے میرا امتحان لے رہے ہوں۔ جب میں ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا تو انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ مجھے نتیجہ دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں میں فیل ہو رہا ہوں۔

رات نیند کتنی اور کیسے آئی اسکا ذکر فضول ہے۔ دوسرے دن صبح میں غسل خانے میں ٹنکی کے سامنے بیٹھا ابھی منجن کی شیشی کھول کر انگلی پر منجن لگانے

ہی والا تھا (جی ہاں مڈل کلاس گھرانوں میں ٹوتھ پیسٹ کا رواج بہت بعد میں آیا ہے) کہ غزالہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اسکے ہاتھ میں اخبار تھا اس نے چیختے ہوئے کہا فیروز تم پاس ہو گئے اور تمہاری فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔ مجھے تو جذبات کے مارے چکر آ گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کئی کئی دفعہ اخبار دیکھا اپنا رول نمبر دیکھا تو دل کو کچھ قرار آیا۔ سب نے گلے لگایا، ماموں جان نے فوراً کسی سے کہا لڈو خرید کر لاؤ۔ میں کچھ غصے اور کچھ خوشی میں بھاگم بھاگ اپنے بہنوئی کے یہاں پہنچا کہ ان کو بتاؤں کہ آپ کی پیشین گوئی غلط نکلی۔ وہ بھی بہت خوش تھے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ مگر یہاں اس کی وضاحت کرنی ضروری ہے کہ میری فرسٹ ڈویژن بالکل بارڈر پر تھی یعنی پانچ نمبر بھی کم ہوتے تو سکنڈ ڈویژن ہوتی اور یہ کہ میں اپنی کلاس میں ان سات لڑکوں میں جنکی فرسٹ ڈویژن آئی تھی سب سے نیچے تھا مگر میں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر گزار تھا کیونکہ میں تو یقین کر چکا تھا کہ فیل ہو جاؤنگا مگر اس نے مجھے یہ کامیابی عطا کی۔ اس واقعہ سے یہ سبق حاصل کیا کہ میں اگر چہ اپنی دوسری دلچسپیوں سے مکمل طور پر قطع تعلق تو نہیں کرونگا مگر تعلیمی ذمہ داریوں کو اولیت دونگا۔ اس بات کی بھی آگہی ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ بہت کم محنت کر کے بھی میرے بہت اچھے نمبر آتے ہیں تو اگر میں صحیح طور پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤں تو اللہ مجھے بے شمار کامیابیاں عطا کریگا۔

میر پور خاص واپسی

میں دوسرے ہی دن گاڑی سے میر پور خاص واپس پہنچا اور دوستوں میں موج میلا کیا۔ شام کو جب میں واپس گھر پہنچا تو گھر کا ماحول کشیدہ تھا اور میرے مستقبل کے بارے میں بحث ہو رہی تھی۔ یہ واقعہ میں کبھی نہیں بھولونگا اور میں نے اسکا تذکرہ اس یادگاری مضمون میں بھی کیا ہے جو میں نے اپنے بھائی صاحب سید سلطان عالم کی وفات کے بعد لکھا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارا کنبہ اب بھی مالی طور پر تنگ دست تھا اور کل وقتی کالج کے اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا ادھر میری والدہ کو اس کا بھی خیال تھا کہ اب سلطان بھائی جان کی شادی کی بھی فکر کرنی چاہئے۔ اس لئے میری امّاں اور ابّا کا خیال تھا کہ میں پی ڈبلیو ڈی میں نوکری کرلوں اور شام کی کلاسیں لیکر آرٹس میں بی اے کروں اور پھر قانون پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کرلوں۔ اپنی مقرری صلاحیتوں کی وجہ سے میرے ہائی اسکول کے کچھ استاد بھی یہی کہتے تھے کہ تمہیں وکیل بننا چاہئے۔ مگر میرے بھائی میرے اور حالات کے درمیان دیوار بن گئے۔ انہوں نے نہایت سختی سے کہا کہ انہیں معلوم ہے کہ میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں اور انکو یقین تھا کہ میں اپنی تعلیمی کارکردگی کی بنا پر میڈیکل کالج کے داخلے میں ضرور کامیاب ہونگا۔ انہوں نے صاف کہا کہ وہ میرے ساتھ وہ سب کچھ نہیں ہونے دینگے جو انکے ساتھ ہوا، گھرانے کے لئے ایک ہی قربانی کافی ہے۔ مجھے آج بھی اسکا خیال ہے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس میں میرے بڑے بھائی کا بہت ہاتھ ہے۔ بہر حال دوسرے دن میں خوشی خوشی شاہ عبدالطیف کالج داخلے کے فارم لینے گیا اور چند ہی دنوں میں میرا داخلہ ہو گیا اور مجھے کالج کا آئی ڈی کارڈ مل گیا اس کارڈ کا تصور تو میں آٹھویں نویں کلاس سے کر رہا تھا۔ مگر کالج کھلنے میں ابھی ایک ماہ باقی تھا اس لئے میں پھر ایک ماہ کے لئے تفریح کی غرض سے کراچی چلا گیا۔

مجھے ایک انجانی خوشی تھی اور امنگوں پر بہار تھی، میٹرک میں فرسٹ ڈویژن میں کامیابی، کالج میں داخلہ۔۔ یعنی اب میں "کالجیٹ" ہوں یہ خیال عجیب مسرت عطا کرتا تھا۔ بقول میرے ابا میٹرک پہلا دروازہ ہے اور اب یہ میری اپنی محنت، ارادے اور لگن پر منحصر ہے کہ میں کہاں تک جانا چاہتا ہوں۔

زندگی کا ایک بالکل نیا دور شروع ہونے کو تھا اور میں نہ صرف بڑی بے چینی سے اسکا انتظار کر رہا تھا بلکہ بڑی حد تک اس کے لئے تیار بھی تھا۔ یہ تو سن ہی رکھا تھا کہ کالج میں بڑی آزادی ہوتی ہے اور اسکول کی بہت سی پابندیوں کا کالج میں رواج نہیں مگر اس تصور نے بھی ایک لذت آمیز بے چینی (excitement) میں مبتلا کر دیا تھا کہ کالج میں کو ایجوکیشن تھی اور ہمارے ساتھ سائنس سیکشن میں لڑکیوں کو بھی داخل ہونا تھا۔۔۔ وہ کیسی ہونگی؟؟ اسکا جواب تو مجھے کالج کھلنے کے بعد ہی ملنا تھا۔

بقیہ: سیارۂ نابینا

But I am not the only one
I hope some day you will Join us
And the world will be as one

لیکن اس زمین پر زندگیوں کے سیارے اپنے اپنے عقیدوں کے ستارے چن کر اپنے محور کے گرد رقصاں ہیں۔ سرحدوں کی خراشوں سے زمین کے رخسار بدنما ہیں۔ گلاب کی سرخی کی جگہ خون کے رنگ ہیں۔

مگر نہ جانے کیوں دل کو یقین ہے کہ کائنات بسیط میں کوئی سیارہ ایسا ضرور ہے جہاں ایک ہی راہ کے سب ہم راہی ہیں۔ چہار سو محبت کے پھولوں کے حسین رنگ بکھرے ہیں۔ فضائیں صیقل۔۔ ہوائیں معطر جہاں انسانیت کی معراج ہے جہاں بصارت اور بصیرت کی کرنیں جگمگا رہی ہیں۔ جہاں چاند ٹوٹ کر لاپتہ نہیں ہوتا۔ سورج خندق میں نہیں گرتا۔ مدھر نغمے ساعت کا مرہم ہیں جہاں۔ وہ سیارہ ایک حسین گھر ہے اور اُس کے باشندے ایک خاندان جو اس گھر میں مقیم ہے۔

''روحِ غزل''

پرواز انبالوی

(بھارت)

تُو ملا ہے مجھے قسمت کی لکیروں کی طرح
میں نے پھیلائے نہیں ہاتھ فقیروں کی طرح

میری سوچوں کے سمندر میں تمہاری یادیں
سہمی سہمی سی ہیں ویران جزیروں کی طرح

تُو مرے دل میں سجا ہے کسی بُت کی مانند
عُمر بھر مَیں نے ہے پُوجا تجھے پیروں کی طرح

بے تکلّف ملو ہم سے جو کبھی ملنا ہو
ہم نہیں رہتے ہیں شاہانہ وزیروں کی طرح

میں تجھے کیسے گنوا دُوں کہ مری روحِ غزل
میں نے تقدیر سے پایا تجھے ہیروں کی طرح

تُو مجھے بھول گیا ہے تو عجب کیا پرواؔز
مَیں ترے دِل میں تھا پانی پہ لکیروں کی طرح

عارف شفیق

(کراچی)

وہ دشت میں گئے ہیں تو گلزار بن گئے
دل میں بسے تو نبض کی رفتار بن گئے

لکھے ہوئے ہیں چہرے پہ اپنے مشاہدات
گویا ہم اپنے عہد کا اخبار بن گئے

اُس نے جو اک نگاہ اٹھائی مِری طرف
سارے ہی لوگ میرے طرفدار بن گئے

جو خود تراشتے تھے ادب کے جدید لفظ
کہنہ روایتوں کے پرستار بن گئے

اب کارواں کو راہ میں لٹنے کا ڈر نہیں
جو راہزن تھے قافلہ سالار بن گئے

جو فن کی آبرو تھے وہ گمنام ہی رہے
جو فن خریدتے تھے وہ فنکار بن گئے

اُس کے جو نقش ذہن پہ عارف کے نقش تھے
لفظوں میں ڈھل کے مطلعِ انوار بن گئے

ایم زیڈ کنول

(لاہور)

شاخِ زیتون کی ہچکیوں نے کہا
ہنستے ہنستے ہوئے سسکیوں نے کہا

جل نہ جائے مسافر کڑی دھوپ میں
پا پیادہ کڑی منزلوں نے کہا

اپنی صورت دکھائی نہ دی خواب میں
آئینہ خانوں کی وحشتوں نے کہا

خوشبوؤں کا بدن جل نہ جائے کہیں
چاند راتوں کی جلتی رُتوں نے کہا

بند گوشِ سماعت کروں کس طرح
یاد کی ادھ کھلی کھڑکیوں نے کہا

اپنی آنکھوں کو تاوان میں رکھ دیا
چشمِ بیدار کی ظلمتوں نے کہا

گُل مرادوں کے ملتے نہیں دُور تک
پارہ پارہ بدن تتلیوں نے کہا

آپ کے زخم سارے کنوؔل بن گئے
خاک ہوتے ہوئے جگنوؤں نے کہا

○

عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

مجھے خبر نہیں ہوگا کہاں قیام مِرا
کہ زندگی میں ہر جذبہ ہے تیز گام مِرا

مِرے کلام میں ہے جذب زندگی میری
ہے میری زندگی کا آئینہ کلام مِرا

نگاہِ وقت میں ہے مختصر مری پہچان
نگاہِ وقت میں ہے مختصر قیام مِرا

مرے حریف سلامت رہیں دُعا ہے مری
بڑا عجیب ہے جذبۂ انتقام مِرا

نہ اس میں ماضی کی قدریں نہ وہ خلوص ووفا
نئے مزاج کی تہذیب کو سلام مِرا

جو تم نہیں ہو تو ڈستی ہے دل کو تنہائی
مذاق اُڑاتا ہے اکثر سکوتِ شام مِرا

جنابِ عرشؔ کا دولت کدہ ہے ریشم گھر
اگر ملیں کبھی کہیے اُنہیں سلام مِرا

مَیں چاہتا ہوں اُدا ہو نہ کوئی رسم اے عرشؔ
کہ جب ہو زندگی کا یہ سفر تمام مِرا

ہر ایک شخص تعصّب کا ہے شکار اے عرشؔ
ہر ایک شخص کو مطلوب اصلی نام مِرا

○

رب نواز مائل

(کوئٹہ)

محبت جیسے انساں کو بناتی ہے
تو درودشوق تک ہر شے دِلاتی ہے

جسے حسنِ سِوا کا سا بہت مانیں
سو اپنی تو طبیعت اُس پہ آتی ہے

خرد کب ہے کوئی اندر کی رَو ہے وہ
جو ہستی کو بہت اوپر اُٹھاتی ہے

یہ اب جو خواہش بےصرفہ مرتی ہیں
تو کیا تقدیر ہی یہ سب کراتی ہے؟

نظارے خُوب سے بھی خُوب آ گئے ہوں
ہمیں تو دید اس سے ہی چلاتی ہے

○

کرشن پرویزؔ

(روپڑ، بھارت)

کبھی نیندوں سے مُنہ موڑا کبھی سپنے جگائے ہیں
دیئے دل کے جلا کر بارہا ہم نے بجھائے ہیں

گلے مل کر جو کہتے تھے قیامت تک تمہارے ہیں
زمانہ دیکھ لے اُن کو وہ کتنے پرائے ہیں

ہنسا کرتے تھے جیتے جی جو دل کی پائمالی پر
سنا ہے وہ ہماری قبر پر کچھ پھول لائے ہیں

یہ سوچا بارہا ہم نے بھلا دیں ہم تمہیں لیکن
نہ تم کو بھول پاتے تھے نہ تم کو بھول پائے ہیں

مثال اپنی کوئی پرویزؔ لائے تو محبت میں
ہزاروں زخم کھائے ہیں مگر ہم مسکرائے ہیں

○

''چہارسُو''

مظہر بخاری
(میاں چنوں)
۔ درزمینِ فیض ۔

ہماری جیت کا موسم نہ ہار کا موسم — اُسے عزیز رہا طوق و دار کا موسم
عجیب ہجر سے پالا پڑا ہے اُب کے برس — لہو لہو ہے دلِ غمگسار کا موسم
برہنگی ہے کہ پژمردگی نہ پوچھ میاں — سسک رہا ہے غمِ روزگار کا موسم
نسیمِ صبح پر لازم ہے آج کُھل کے چلے — چمن چمن ہے کِھلا حُسنِ یار کا موسم
اگر تجھے ہے تعارض شکستگی پہ مری — لکھے گا کوئی تو نا کردہ کار کا موسم
فضائے کوچۂ دلبر نہ پوچھیے ہم سے — نظر نظر سے چھلکتا ہے پیار کا موسم
گلِ مراد، یہ خوشبو، یہ رنگ اور یہ حسن — اُسی کے دم سے ہے مظہرؔ بہار کا موسم

نورزمان ناوک
(تلہ گنگ)

ضبطِ اظہار مار ڈالے گا — بس یہی خار مار ڈالے گا
حسنِ اقرار کو سرِ محفل — حسنِ انکار مار ڈالے گا
ایسا لگتا ہے آئینے کو مرے — غم کا زنگار مار ڈالے گا
پڑ رہا ہے جو اِن دنوں مجھ پر — کشف کا بار مار ڈالے گا
ہم سے حساس طبع لوگوں کو — کوئی اخبار مار ڈالے گا
سانپ بانبی میں رہے گا لیکن — خوف کا وار مار ڈالے گا
کوزہ گر میری خاک کا ناوکؔ — جزوِ بیدار مار ڈالے گا

نعیم الدین نظر
(میر پور خاص)

عزم کا امتحان باقی ہے — سب سے اونچی چٹان باقی ہے
ایک سیلاب اور آئے گا — ایک کچا مکان باقی ہے
ایک جگنو ہے میری مٹھی میں — نیلگوں آسمان باقی ہے
لُٹ چکی ہے متاعِ فکر و نظرؔ — ہاں مگر آن بان باقی ہے
اک دیا بجھ گیا ہے یادوں کا — روشنی کا نشان باقی ہے
فصل ساری تو لٹ گئی لیکن — عمر بھر کا لگان باقی ہے
اُس کی تصویر مل ہی جائے گی — اک نظرؔ کی دکان باقی ہے

تصورِاقبال

(اٹک)

یہ سچ ہے ہر گھڑی اپنے عدو کی زد میں رہتا ہوں
مگر کیا کم ہے میں جو اپنے پُورے قد میں رہتا ہوں

نہیں ایسا نہیں ہے اپنی حد سے آگے بڑھ جائیں
وہ اپنی حد میں رہتا ہے میں اپنی حد میں رہتا ہوں

دُعا ہے میری نہیں اب تک کوئی مقبول ہو پائی
مُقدر ہے مرا اپنا ہمیشہ سَد میں رہتا ہوں

میں یوں تو اپنے ہم عصروں کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں
مگر میں اپنے فن کے کاسئہ ابجد میں رہتا ہوں

یہ میرا حسن قائم ہے تو بس اُس کے حوالے سے
یہ سچ ہے آج بھی میں اُس کے خال وخد میں رہتا ہوں

وہ اب بھی مجھ کو ایسے ہی اضافی سا سمجھتے ہیں
اسی خاطر الگ ہو کر تصوّر صَد میں رہتا ہوں

صابرعظیم آبادی

(کراچی)

نہیں راستوں کا پتہ مجھے مرے مہرباں
میں گرا ہوا ہوں اٹھا مجھے مرے مہرباں

مرے پاس آ مرے پاس آ ابھی وقت ہے
کوئی دے رہا ہے صدا مجھے مرے مہرباں

وہ جو چل کے جس پہ سکوں ملے مری روح کو
اسی راستے پہ چلا مجھے مرے مہرباں

شب تار ہے تو ہُوا کرے کوئی غم نہ کر
میں چراغ ہوں تو جلا مجھے مرے مہرباں

یہ خموشیاں یہ اداسیاں بھلا کس لیے
کوئی بات ہے تو بتا مجھے مرے مہرباں

جو بہار دے، جو سنوار دے، جو نکھار دے
وہی آئینہ تو دکھا مجھے مرے مہرباں

پھروں کب تلک سرِ رہ گزر کڑی دھوپ میں
گھنے گیسوؤں میں چھپا مجھے مرے مہرباں

نہیں یاد ہے مری بات تو اسے چھوڑ کر
کوئی داستاں ہی سنا مجھے مرے مہرباں

ترا خواب ہوں ترا رنگ ہوں، ترا روپ ہوں
کسی شام گھر بھی بلا مجھے مرے مہرباں

ہوں سرابِ غم میں گھرا ہوا کہاں جاؤں میں
کوئی راستہ تو بتا مجھے مرے مہرباں

مری عادتیں بڑی پاک ہیں بڑی صاف ہیں
کہو اس قدر نہ برا مجھے مرے مہرباں

میں تو ساتھ تھا میں تو پاس تھا رہِ عشق میں
کیا آپ ہی نے جدا مجھے مرے مہرباں

سلیم ناز

(کراچی)

سوچتا ہوں میں تباہ کیسے ہوا
شہر بے آب و گیاہ کیسے ہوا

عمر بھر کی آگ میں جلنے کے بعد
اس جہنم سے رہا کیسے ہوا

مجھ کو حیرت ہے۔کہ میرے یار کا
میرے دشمن سے نباہ کیسے ہوا

صاحبِ علم و فراست آدمی
اسقدر کوتاہ نگاہ کیسے ہوا

وہ بظاہر خوش چلن خوش فکر ہے
دل مگر اُس کا سیاہ کیسے ہوا

کیا بتاؤں آخری توبہ کے بعد
پھر وہی مجھ سے گناہ کیسے ہوا

پروین نقش (میاں چنوں)

یوں مری روح میں تحلیل ہوئے جاتے ہو
تم میری ذات کی تکمیل ہُوئے جاتے ہو

کوئی نادانی ہے یا خوفِ پشیمانی ہے
دل کے ہر حکم کی تعمیل ہوئے جاتے ہو

کوئی تو بات رہے راز زمانے بھر سے
تم تو ہر درد کی تفصیل ہوئے جاتے ہو

ساعتِ صبح مسرت کا کہیں تو اِمکان
دُکھ کے انبار کی تمثیل ہوئے جاتے ہو

میری بے تاب نگاہوں کی تسلّی بن کر
ہجر میں وصل کی تحصیل ہوئے جاتے ہو

سُرخیِ وقت پہ احساس دلاتی ہے مجھے
شام کی آخری قندل ہوئے جاتے ہو

نقش راحت کا نظر آئے گا کیسے تم کو
درد کی راکھ میں تبدیل ہوئے جاتے ہو

زاہدہ عابد حنا (لاہور)

بس اتنی بات کا دل میں ملال رکھتے ہیں
جواب جس کا نہیں وہ سوال رکھتے ہیں

کسی بھی غم سے کبھی ہار ہی نہیں سکتے!
جو اپنے لب پہ تبسم کی ڈھال رکھتے ہیں

کبھی کہیں بھی مجھے چھوڑتے نہیں تنہا!
تمہارے غم مرا کتنا خیال رکھتے ہیں

ہے چاندنی سے کبھی گفتگو، کبھی شب سے
ہم ایسے لوگ بھی کیا روگ پال رکھتے ہیں

امید مر کے بھی ہم کو نہیں ہے ملنے کی
کسی فراق سے ایسا وصال رکھتے ہیں

ملے جو وقت کبھی وہ بھی تو ملے ہم سے
وہ جس کی یاد میں سب کام ٹال رکھتے ہیں

اسے ہے وہم ہمارے قریب ہے کوئی
یہی گمان ہمیں بھی نڈھال رکھتے ہیں

نہ آئندہ نہ گذشتہ کی کچھ خبر جن کو!
یہ کون ہیں کہ جو مٹھی میں حال رکھتے ہیں

یہ لوگ جو کہ صفِ رہبراں میں شامل ہیں
یہی تو راہزنی میں کمال رکھتے ہیں

نگر میں تیرہ شبوں کے یہی ہے رسم حنا!
پلک پلک پہ ستارے سنبھال رکھتے ہیں

مالک سنگھ وفا (جموں، کشمیر)

خشک پتّوں سی بکھرتی جارہی ہے زندگی
بے نشاں سی خُود کو کرتی جارہی ہے زندگی

کیا بگاڑا میں نے اس کا اے دلِ ناداں بتا
مجھ پہ ہر الزام دھرتی جارہی ہے زندگی

کون سا جادُو ہے اس میں کون سی ہے دل کشی
اُس پہ بے دیکھے جو مرتی جارہی ہے زندگی

جب غموں کی ذد میں آئی ایک پَل میں کھو گئی
رفتہ رفتہ پھر اُبھرتی جا رہی ہے زندگی

کس کی یادوں نے ہے گھیرا اس کو یہ کس سے کہوں
دھیرے دھیرے کیوں بکھرتی جارہی ہے زندگی

اس کے چہرے پر اُداسی کے سوا کچھ بھی نہیں
یاس میں جیسے اُترتی جا رہی ہے زندگی

کیا کہوں کس کے خیالوں میں ہے یہ کھوئی ہوئی
کس کی خاطر یوُں سنورتی جارہی ہے زندگی

اے وفا اس دور میں بھی لے رہے ہیں سانس ہم
مختصر یہ ہے گزرتی جا رہی ہے زندگی

سیارۂ نابینا

پروین شیر

(کناڈا)

امریکہ کا ایک معروف شاعر جون گاڈ فری سیکس (Jhon GodfreySaxe) Vermont میں پیدا ہوا۔ ۱۸۱۶ء میں اس دنیا میں آیا اور ۱۸۸۷ء میں دنیا چھوڑ گیا۔ اس کے آباؤ اجداد جرمنی سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ تجارت کے پیشے سے اُکتا کر اس نے شاعری شروع کر دی تھی۔ اس کی سب سے مشہور نظم ایک قدیم ہندوستانی تمثیلی کہانی کی بنیاد پر ہے جو اُنیسویں صدی میں وجود میں آئی۔ ہندوستان کے بہت مقبول Parable سے متاثر ہو کر اس نے نظم The Blind men And The Elephant کہی اور مغرب میں متعارف کیا۔ مغربی قاری نے اس مشہور طنز نگار کی اس تخلیق کو بہت سراہا۔ گرچہ یہ نظم اس کی موت کے بعد زیادہ مشہور ہوئی۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کی داستانوں میں بھی یہ بہت مشہور حکایت ہے جو ہندوستان سے شروع ہوئی اور ہر جگہ پھیلی۔ خاص کر یورپ میں بہت مشہور ہے جس کی بنیاد پر بچوں کی بھی کتابیں شائع ہوئیں جس کے تخلیق کاروں میں Paul Galdone کا نام نمایاں ہے۔ یہ ہندوستانی Parable جس کے کئی Versions ہیں دوسروں کے (Perspectives) نقطۂ نظر کے احترام کی راہ دیکھاتی ہے۔ گاڈ فری کی نظم کے کچھ اقتباس ہیں۔

It was six men of Indostan
To learning much in clined
Who went to see the elephant
Though all of them were blind
The first approached the elephant
And happening to fall
Against his broad and sturdy side
At once began to bawl:
"God bless me! but the elephant
Is very like a wall!"
The Second, feeling of the tusk,
Cried, "Ho! What have we here
So very round and smooth and sharp?
To me tis mighty clear
This wonder of an Elephant
is very like spear! "....

کچھ نابیناؤں نے ہاتھی کے کسی ایک عضو کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا اور یہ سمجھ لیا کہ ہاتھی کی مکمل شکل وہی ہے۔ ایک نے اُس کے پیٹ کے لمس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہاتھی دیوار جیسا ہے۔ دوسرے نے دانت چھو کر ہاتھی کو بھالے جیسا کہا۔ اسی طرح کسی نے پیروں کو محسوس کر کے ستون جیسا کوئی جانور کہا۔ دُم پر ہاتھ رکھ کر رسّی جیسا کہا۔۔۔ کسی نے سونڈ کے لمس سے یہ رائے قائم کر لی کہ یہ جانور درخت کی شاخ جیسا ہے اور کسی نے کان کو محسوس کر کے اسے پنکھا جیسا کہا۔ یوں وہ سب صحیح بھی تھے اور غلط بھی کیونکہ ان کا مشاہدہ ادھورا تھا۔ سبھوں نے ایک ہی شے کو مختلف زاویے سے محسوس کر کے محدود معلومات کی بنیاد پر ایک مضبوط رائے قائم کر لی۔ پھر تباہ کن کشمکش اور ایک دوسرے سے اختلافات پیدا ہوئے جس کی بنیاد پر گوڈ فری نے کہا:

So often in theologic wars
The disputants, I ween
Rail on in utter ignorance
of what each other mean,
And prate about an Elephant
Not one of them has seen

یہ صورت حال سوچ کے کئی دروازے وا کر دیتی ہے۔

یہ لامتناہی کائنات ، یہ خلاؤں میں بھٹکتے ہوئے چکراتے ہوئے سیارے، یہ گردشیں۔۔۔ ازل سے سیاروں کا ستاروں کے گرد منڈلاتے رہنا۔ کس تلاش میں سرگرداں ہیں یہ؟ سورج کے گرد چکراتی ہوئی ہماری زمین اور زمین پر بھٹکتے انسان۔ سہارے کی جستجو ، سچ کی تلاش ، سکون کی تلاش ، روشنی کی تلاش ، کاملیت کی تلاش۔۔۔ دوڑتے بھاگتے ، رینگتے ، ٹٹولتے لوگ۔ چھوٹے چھوٹے دائروں کے اندر بند جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چراغ ہیں لیکن ٹمٹاتی ہوئی لَو کی مدھم روشنی اپنی محدود طاقت تک ہی منظر کو روشن کر سکتی ہے۔ دور تک جو پھیلاؤ ہے وہ تاریک رہ جاتا ہے۔ آدھا سچ پورا سچ بن جاتا ہے۔ دور بہت دور۔۔۔ دھند کے اندر جاتے ہوئے آب و گل کے مختلف راستے۔۔ پگ ڈنڈیاں ، سڑکیں ، کچی راہیں ، ندیاں ، سمندر اور ان پر رواں مسافر۔۔۔ الگ الگ۔ یہ مختلف راستے دور جا کر دھند کے ایک ہی نقطے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ مسافروں کو ایک ہی مقام پر پہنچاتے ہیں۔ ایک ہی منزل پر۔ ابتداء ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا اور انتہا ایک ساتھ۔ لیکن اتنی دور تک دیکھنے کی معذور آنکھوں میں طاقت کہاں۔ ان کی بصارت جس راستے پر انہیں

لے آتی ہے وہی اُن کے لیے منزل پر پہنچنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ان کے قدم اسی راستے سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ یہ راہیں انہیں ایک یقین کی بانہوں میں جکڑ لیتی ہیں۔آدھے سچ کو پورا سچ سمجھنے کا یقین۔۔۔! کچھ مسافر کسی پگڈنڈی کا سہارا لے کر آگے بڑھتے ہیں۔کچھ سڑک پر رواں ہیں کچھ کچی راہوں پر اور کچھ پانیوں پر اپنے سفینوں میں بہے جا رہے ہیں۔سبھوں کا رخ اُس دھند کے اندر نہاں منزل کی طرف ہے لیکن ایک دوسرے سے بیگانہ، الگ الگ اپنی اپنی ٹولی بنا کر۔ایک ہی دھن میں مگن کہ ان کا راستہ ہی سر منزل لے جائے گا۔انہیں یقین کامل ہے کہ دوسرے مسافر کسی کھائی میں گر جائینگے۔اور دور دور دھند کی آغوش سب راستوں کو اپنے سینے میں سمیٹ لیتی ہے لیکن یہ بے بصیرت و بے بصارت مسافر اپنے سچ پر جیت حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے سچ کو جھوٹ ثابت کرتے ہیں۔پھر اختلافات کے بطن سے نفرت کی پیدائش ہوتی ہے۔دشمنی کے خنجر ایک دوسرے کے خون پی کر بھی پیاسے رہتے ہیں۔بے بصری تباہی کے زہریلے ناگوں کو جنم دیتی ہے جو ہر موڑ پر لہراتے رہتے ہیں۔تعصب کے گدھ انسانیت کے جسم کو نوچ نوچ کر کھاتے رہتے ہیں اور اسے لاغر بنا دیتے ہیں۔

انسانیت کی آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھیں بصارت کی شفافیت چاہتی ہیں لیکن یہ ممکن نہیں۔نفرتیں اپنی سرفرازی کے جم چڑھاتی رہتی ہیں۔سوچ کے اسلحہ خانوں میں دشمنی کے کارتوس جمع کیے جاتے ہیں۔بصیرت کفن اوڑھ کر سوتی رہتی ہے۔محبت کی شاخوں کو ایندھن بنا کر چھاؤں چھین لی جاتی ہے۔جنون میں ڈوبے نابینا مسافر ان راستے بھر ادھورے پن کو تکمیل سمجھ کر، مگن ہو کر سفر پورا کرتے ہیں۔بے بصری کے عالم میں وہ دیکھیں بھی تو کیسے کہ دوسرے راہ گیر بھی اُسی دروازے کی طرف جا رہے ہیں جہاں یہ گامزن ہیں۔ان کی نابینائی ازل سے تا بہ ابد ہے۔دور۔۔۔دھند لے جھانکتی ہوئی منزل مسکرا کر اس تماشے کو دیکھتی رہتی ہے۔الگ الگ راہوں کے دھاگوں کے آخری سروں کو ایک ساتھ جوڑ کر اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے۔اور قافلے ادھورے سچ کا پرچم تھامے ایک دوسرے کو زیر کرتے ہوئے رواں ہیں جو صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔کیونکہ ادھورا پن ہی اُن کے لیے تکمیل ہے۔

مختلف عقیدوں کے سنگلاخ دائرے ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے غیر مکمل علم کی اساس پر زلزلے پیدا کرتے ہیں۔ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔گوڈفری کی نظم کے نابینا کرداروں نے علم حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کیا انھوں نے مطلق کو پا لیا؟ اپنے اپنے تجربات، اپنے اپنے نظریے، اپنے اپنے راستے۔سچ کو پانے کے لیے مکمل بصارت اور بصیرت لاحق ہے۔نیم سچائی کے بلبلے میں مفید لوگ اُسی کو کامل مانتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے دائرے ایک دوسرے میں سما کر ایک نہیں ہوتے۔اختلافات کی پتھریلی فصیلیں رعونت سے سر اٹھائے کھڑی رہتی ہیں۔جو انہیں گرانے کی کوشش کرتا ہے ان سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ہماری زمین اُداس ہے کہ اس کے بچے نابینا ہیں۔یہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں دکھ کا لاوا چھپائے دیکھتی رہتی ہے۔اپنے شانوں پر موٹی پتھریلی تفرقے کی دیواروں کا بوجھ اُٹھائے۔اتنی شدت سے اس کا دل دھڑکتا ہے کہ اس کا سینہ شق ہو جاتا ہے، جس سے چمٹے ہوئے جاندار تہس نہس ہو جاتے ہیں۔اس کی آنکھوں سے رواں رنج و غم کے سیلاب انہیں بہا لے جاتے ہیں۔یہ تھرّاتی ہے مگر دیواریں نہیں گرتیں۔روز نیا سورج خون کے آنسو بہا کر افق کی خندق میں گر کر مر جاتا ہے۔پورا چاند کھِلتا ہے اُسے بھی کرب کے ہتھوڑے روز ذرا ذرا توڑتے رہتے ہیں اور آخر کار اس کا آخری ٹکڑہ بھی سیاہی کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔نفرتوں کا کثیف دھواں فضا کی صقیل آنکھیں دھندلا دیتا ہے اور اس کی شفاف گود تعصب کا کوڑے دان بن جاتی ہے تفاوت کی چیخ و پکار، سنگین حالات کے سیاہ بادل، بربریت کے پنجوں میں دم توڑتی انسانیت، کھنڈر میں تبدیل خوابوں کے محل، سکھ چین کی اکھڑی اکھڑی سانسیں، حیوانیت کے قہقہوں کی گونج سے کانپتا آسمان یہ بدنصیب سیارہ نابیناؤں کا سیارہ ہے۔کیسی ہوتی یہ زمین جب اس پر ایک ہی راستہ ہوتا Absolute تک پہنچنے کے لیے؟ کیسی ہوتی یہ دنیا کہ یہ راستہ تمام مسافروں کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر آخری منزل تک پہنچاتا؟ کیسا ہوتا یہ سیارہ جب یہاں بے بصری نہ ہوتی؟ اس کے سینے پر مختلف سرحدوں کی خراشیں نہ ہوتیں؟ جب جنون کی کوکھ سے خوفناک دشمنی کے شارک پیدا ہو کر ایک دوسرے کو لہولہان نہ کرتے؟ جب لوگ اپنے اپنے بلبلوں میں بند نہ ہوتے؟ جب بصری انسانیت کے چیتھڑے نہ اُڑاتی۔

کچھ مسافر ایسے بھی ہیں جن کے راستے تنہا تنہا، سانسیں تنہا تنہا ہیں۔یہ لوگ سوچ کے سربفلک کوہ پر آگہی کے الاؤ میں جلتے رہتے ہیں۔یہ خواب دیکھنے والی زندگانیاں ہیں جو اپنے سیارے کو Perfection کے جواہرات سے سجانا چاہتی ہیں۔یہ بلند فکر انسان چاہتے ہیں کہ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تمام لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں بن جائیں۔ان کے خواب اُن کی آنکھوں میں بھی سما جائیں۔ان کے سنہرے خوابوں کی روشنی سے راہ یابی ہو۔ان کی یہ اندرونی بے چینیاں تا زندگی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

یہ چاہتے ہیں سبھوں کے ہاتھوں میں پھول ہوں۔۔ہتھیار نہیں۔

انہیں تنہا لوگوں میں ایک عظیم فنکار John Lennons بھی تھا۔مقبول و معروف گلوکار، نغمہ نگار، مصنف اور کمپوزر۔جو ہمیشہ اندھی و دقیانوسی قدروں کے خلاف رہا۔جو حسین دنیا کا خواب دیکھتا تھا۔اپنے شدید ذاتی جذبات کا اظہار اپنی ایک غنائی نظم ''Imagine'' میں کیا جس کی یہ سطریں انمول ہیں:

Imagine there's no Countries
Imagine no possesions
Imagine all the people
Sharing all the world
You may say that I am a dreamer

باقی صفحہ ۹۹ پر ملاحظہ فرمائیے

''طفلِ زندہ''

''ڈرون حملہ''

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

دھماکے، آگ شعلے اور چیخیں
بسا گھر۔۔۔ڈھیر ملبے میں بدلتا
دیئے چھاتی کو بچے کے لبوں میں
زنِ مردہ لئے
اک طفلِ زندہ
گری دیوار کے نیچے سسکتا
ناتواں۔۔۔اور نیم جاں بوڑھا

ڈھیر ملبہ ---
ڈھیر ملبے میں دبی
لہو سے رنگی
لاچار لاشیں

کہیں میلوں پرے
شیطان طیارے چلاتیں
مہذب انگلیاں شاداں و فرحاں

○

خانہ جنگی

محمود شام
(کراچی)

تمہارے ہاں گزشتہ خانہ جنگی کب ہوئی تھی
آسماں کی آنکھ سے کب خون ٹپکا تھا
زمیں کی پیاس کب بھڑکی تھی
تمہارے ذہن کس کا ساتھ دیتے ہیں
دلوں میں کس کی چاہت تھی
تمہارے ہاتھ کس کے حق میں بندوقیں اٹھاتے تھے
کسے تم کھل کے زندہ باد کہتے تھے
کسے نفرت سے مردہ باد کہتے تھے
یہ اب پھر خانہ جنگی کی صدائیں آرہی ہیں
گھروں میں پھر سے ماتم ہے
پھر اپنے دل میں جھانکو اور بتاؤ
تمہاری چاہتیں بدلیں
تمہاری نفرتیں بدلیں
تمہارے ہاتھ میں بندوق اب کس کے لئے ہے؟

○

جس نے ترتیب سے کبھی نہ لکھا

فہیم شناس کاظمی
(کراچی)

آج ہیں جس جگہ قدم میرے
کل وہ............
......ان راستوں سے گزرا تھا
جس کی آنکھوں میں
چاندلرزاں تھا
جو سمندر سے پیار کرتا تھا
جس نے ٹینکوں کو روندتے دیکھا
جس کو چڑیوں کے نام آتے تھے
جو صبا سے کلام کرتا تھا
اپنی داڑھی میں الجھی نظموں کو
جس نے ترتیب سے کبھی نہ لکھا
جس نے ہر موج کا پڑھا ہے خط
جس نے ہر جھونکے کو دیا بوسہ
جس نے خوشبو کو چھو کے دیکھا تھا
رنگ جس سے کلام کرتے تھے
جس کی ہر شام گزری یاروں میں
جس کی ہر رات تھی ستاروں میں
جان سے جو گزرنا جانتا تھا
جو محبت میں مرنا جانتا تھا
اس کو
یہ نظم
لکھ کے دینی ہے

○

تصویرِ الم

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

(غم واندوہ میں کسی کو اشکبار دیکھ کر)

بے بسی، مجبوریاں، رنجوریاں
زندگی کیسی اُنہیں دی آسماں
آئے وہ، چل بھی دیئے، خاموشیاں
کیا ایفا وعدہِ وصل یوں میاں
روکتے بھی ہم اُنہیں تو کس طرح
وہ کہ تھے تصویرِ الم الاماں
بانٹ سکتے کاش! ہم اُن کا درد
اشکوں کے دریا بھی، آنکھوں سے رواں
کِس گھٹن میں جی رہے ہیں تشنہ وہ
وہ یہاں تو تھے، مگر نہ تھے وہاں

○

ساعتِ وصل

قیصر نجفی
(کراچی)

آج پھر شوق کا بے پایاں سمندر دل میں
رقص کرتا ہے طلاطم کے پہن کر گھنگھرو
پر بُنِ مُو سے لپکتے ہیں لہُو کے شعلے
مئے ہیجان سے لبالب ہے رگِ جاں کا سُبو

اُفُقِ چشم پہ بیتاب تمناؤں کی کہُر
پھیلتی جاتی ہے ہر سمت بڑے ناز کے ساتھ
دامنِ ضبط چھٹا جاتا ہے ہاتھوں سے مرے
نبض بھی ڈوب چلی ہے دلِ ناساز کے ساتھ

ساعتِ وصل بھی شاید ہے قیامت کی گھڑی
کوہِ ایماں پہ ہوا جاتا ہے لرزہ طاری
سوچتا ہوں کہ یہ کہسار نہ پھٹ جائے کہیں
اور ہو جائے خطاؤں کا نہ لاوا جاری

اے مرے نفسِ نیکو کار سہارا دینا
میں ہوں مشکل میں گرفتار سہارا دینا

○

کرن کی ایک سلائی کی تلاش

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

آؤ اپنے زخم سجا کر شہر میں نکلیں
آنکھوں کو آباد کریں
جسم کے ٹکڑے سی کر دیکھیں
موت کے شہر میں جی کر دیکھیں
روحوں کو آزاد کریں

تھکے پپوٹے، جلتی پلکیں
اشکوں کی برفاب رُتوں سے دھو کر اُٹھیں
سوچ کی نایاب کرن کی ایک سلائی
آنکھوں کی سیڑھی پر رکھ کر
سینوں کو گل زار کریں

کھیت جلے ہیں
خوشہ خوشہ راکھ ہوا ہے
خون کی ندی میں ہر خوشہ ڈوب گیا ہے
کونپل کونپل
بُجھ کر سوکھے گھاس پہ دیکھو ڈھیر پڑا ہے

ماچس کی اِک تیلی لے کر
کالی آندھی لوٹ رہی ہے
جسم کے ٹکڑے گننے والے
کالی آندھی کی آوازیں ریڈاروں میں دیکھ رہے ہیں
آنکھوں کی پُرکار سنہرے ایوانوں پر گھوم رہی ہے

میری آنکھیں
سورج کی نایاب کرن کی ایک سلائی
بٹوے کی خوش رنگ تہوں میں سُرمہ ڈالے اونگھ رہی ہے

آؤ پھر سے
دل کی کھڑکی کھول کے دیکھیں
اس کھڑکی میں آنکھ جلا کر زخم سجا کر
بول کے دیکھیں

بانیٔ تخلیق کو اپنا سلام!

جاوید زیدی (امریکا)

بانیٔ تخلیق یارو
جا ملے خالق سے آج
''پیار کے دن'' ہو گیا پُورا
ادھورا کام کاج
جیسے آپ لمبی مسافت
ہر گئی آخر کو طے
جیسے آخر آ گیا
دل کو قرار
نہ شمارے کی ہے چنتا
نہ کتابت کا شمار
ڈاک کا خرچا بڑھے
یا ہوں ''ہرے گلشن کے پات''
پر نہیں لکھے گا اب وہ
''اپنی بات''
بزمِ یاراں کیسی سُونی ہو گئی
جس کا ڈر تھا وہ انہونی ہو گئی
اس قدر افسوس ہے اور رنج ہے اتنا شدید
ہائے تنہا ہو گئے اب ساتھیو انور سدید
کس کو خط لکھا کریں گے
کس سے کریں گے دل کی بات
رُک گیا چلتا قلم، اور
سو گئے تھک تھک کے ہاتھ
بس دُعا یہ ہے
اظہر جاوید کی تخلیق کا
یہ سلسلہ چلتا رہے
یہ ادب کا کارواں
بڑھتا رہے!

* VALENTINE DAY : FEB.14Th

دیس، پردیس اور تنہائی

عظمیٰ صدیقی
(لندن)

اجنبی دیس کا ایک شہر جہاں کوئی نہیں
میرا اپنا جو محبت سے پکارے مجھ کو
کوئی دروازہ کھلے، کھڑکی سے جھانکے کوئی
راہ میں چلتے ہوئے پیار سے آئے کوئی
یونہی رسماً ہی سہی حال تو پوچھے کوئی
آدمی سا کوئی چہرہ، کوئی دلدار نظر
کوئی مانوس سی خوشبو کوئی میٹھی سی لہر
اجنبی دیس کا ایک شہر جہاں کوئی نہیں
اور اس بستی سے ہے دور بہت دور کہیں
وہ مرا دیس ، مرا شہر، مری پاک زمیں
مڑ کے دیکھیں تو وہاں بھی تو کوئی ایسا نہیں
میرا اپنا جو محبت سے پکارے مجھ کو
کوئی دروازہ کھلے کھڑی سے جھانکے کوئی
راہ میں چلتے ہوئے پیار سے آئے کوئی
مجھ کو چاہے، مجھے جانے، مجھے سمجھے کوئی
مجھ کو ایک خواب سمجھ کے نہ بھلا دے کوئی
میری تصویر کو کمرے میں سجا کے رکھے
یاد جب آؤں تو میرے لیے روئے کوئی
درد کی تیز ہوائیں وہ سنبھالے مجھ کو
بند دروازوں کو آ کے کبھی کھولے کوئی
دور تک پھیلتی راہوں کی شناسائی ہے
مڑ کے جب دیکھوں تو تنہائی ہی تنہائی ہے

❍

دوہے

سیفی سرونجی
(سرونج، بھارت)

کیسے یہ بھر پائیں گے دل پر لگتے گھاؤ
ہم بھی نفرت چھوڑ دیں تم بھی ہاتھ ملاؤ

میرا کہنا مان کے سارے رشتے توڑ
سب کچھ تیرا جھوٹ ہے دل کا رشتہ جوڑ

ڈگری کوئی چیز نہیں سب کچھ اسے نہ مان
رہ جائے گا ایک دن سارا تیرا گیان

سب کچھ تیرا جھوٹ ہے سب کچھ میرا جھوٹ
اندر سے ہم دوستو اتنے گئے ہیں ٹوٹ

بھاشاؤں میں ایک ہے اردو جس کا نام
بولوں میں تو پھول جھڑیں خوشبو پھیلے عام

ہم نے کسی مزرا پر چڑھائے نہ عنبر عود
تنہائی میں بیٹھ کر پڑھتے رہے درود

❍

سوچ کو پابند نہ کرو

جہانگیر اشرف
(برمنگھم)

سوچ ہر کارِ نمایاں کی ابتداء ہے
سوچ سے ہی انسانیت کی ارتقاء ہے

سوچ سے ہی اِدراک کی راہیں کھُلیں
سوچ سے ہی نئی منزلوں کے سُراغ ملیں

سوچ سے ہی کائنات کی تسخیر ہے
سوچ سے ہی ابنِ آدم کی توقیر ہے

سوچ کو عقیدتوں کی بھینٹ نہ چڑھاؤ
سوچ پر پنتھ کے پہرے نہ لگاؤ

سوچ کے خلاف سوچ سے لڑو
غلط سوچ کو رد دلیل سے کرو

گو ہم سب کا ایک سا سراپا ہے
جُدا جُدا سوچ قدرت کا کرشمہ ہے

❍

ایک صدی کا قصہ
بی۔آر چوپڑہ
دیپک کنول
(ممبئی،بھارت)

بی۔آر۔چوپڑہ کا پورا نام بلدیو راج چوپڑہ تھا لیکن وہ بی۔آر۔چوپڑہ کے نام سے مشہور تھے۔بی۔آر۔چوپڑہ کا جنم 21اپریل 1914 کو پنجاب کے صنعتی شہرلدھیانہ کے ایک متوسط گھرانے میں ہوا۔بعد ازاں اُن کا خاندان لدھیانہ سے لاہور منتقل ہوگیا۔لاہور اُس زمانے میں آرٹ اور کلچر کے حساب سے کافی زرخیز مانا جاتا تھا۔اُن کے والد ایک سرکاری افسر تھے جن کے کل ملا کر سات بچے تھے۔چوپڑہ صاحب کی تعلیم وتدریس لاہور میں ہی ہوئی۔اُنہوں نے ابتدائی تعلیم پوری کرنے کے بعد لاہور یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں انہوں نے انگریزی لٹریچر کو چنا۔وہ بھی اپنے باپ کی طرح بہت بڑا سرکاری افسر بننا چاہتے تھے پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔وہ سول سروسز امتحان میں فیل ہوگئے۔اس ناکامی نے اُنہیں صحافت کی طرف موڑ دیا۔اُنہوں نے فلمی جرنلزم کو اپنا پیشہ چن لیا۔1938 میں اُنہیں فلم میگزین ''سنے ہیرالڈ'' کا ایڈیٹر بننے کا موقع مل گیا۔چند شمارے ایڈیٹ کرنے کے بعد اُنہوں سے یہ پرچہ خرید لیا۔تب یہ پرچہ خسارے میں چل رہا تھا۔نصیب کا کھیل دیکھئے کہ چوپڑہ صاحب کی ملکیت میں یہ پرچہ خوب چل پڑا۔نقصان کا مداب منافع میں بدل گیا۔یہ پہلا سودا تھا جو منعفت بخش ثابت ہور ہا تھا۔

بی۔آر۔چوپڑہ نے سیمابی طبعیت پائی تھی۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔وہ فلموں میں اپنی قسمت آزمانا چاہتے تھے۔1944 میں اُنہوں نے ایک فلم شروع کی۔اس فلم کی کہانی اپنے زمانے کے مشہور کامڈین آئی ۔ایس۔جوہر نے لکھی تھی۔اس فلم کے لئے نعیم ہاشمی کو ہیرو کے رول کے لئے منتخب کیا گیا جب کہ ہیروئن کے رول میں اریکا رکھشی کو چنا گیا۔اس سے پہلے کہ فلم کی شوٹنگ شروع ہوتی ملک میں خونیں فسادات پھوٹ پڑے۔لاکھوں انسانی جانیں ان فسادات کی بھینٹ چڑھ گئیں ۔ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے ۔چوپڑہ صاحب اپنے پریوار کے ساتھ لاہور چھوڑ کر دلی چلا آئے۔دلی کی آب وہوا اُنہیں راس نہ آئی۔اُن کے دل میں بہت کچھ کرنے کی اُمنگ تھی ۔ دلی تو آرٹ کے معاملے میں بڑا پچھڑا نظر آرہا تھا۔چوپڑہ صاحب نے محسوس کیا کہ دلی میں کلچرل سرگرمیاں ناہونے کے برابر ہیں سو وہ دلی کو خیر باد کہہ کے بمبئ پہونچ گئے۔

1948 میں چوپڑہ صاحب نے پھر سے اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔اُنہوں نے پائی پائی جوڑ کر ایک بار پھر فلم پروڈکشن میں قسمت آزمائی کی اُنہوں نے فلم ''کروٹ'' بنائی جو بری طرح فلاپ ہوگئی۔اپنی اس ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر اُنہوں نے پروڈکشن سے دور رہنا ہی مناسب سمجھا اور وہ ہدایت کاری پر ہی اکتفا کر کے بیٹھ گئے۔اُن کے پاس آئی۔ایس۔جوہر کی لکھی ہوئی ایک کہانی ''افسانہ'' تھی جسکے لئے اُنہیں ایک پرڈیوسر اور ایک دم دار ایکٹر کی ضرورت تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اشوک کمار کا ہرطرف طوطی بولتا تھا۔اشوک کمار کو قائل کرنا آسان کام نہ تھا۔بی۔آر۔چوپڑہ کافی گنی آدمی تھے۔ فلمی صحافت کی وجہ سے فلمی ستارے اُن کے نام سے بخوبی آشنا تھے۔چوپڑہ صاحب نے اشوک کمار کو اپنی ہدایت میں کام کرنے کے لئے راضی کر لیا۔1951 میں ''افسانہ'' ریلیز ہوئی تو اس فلم نے دھوم مچائی۔ایک ذہین ڈائرکٹر کا طلوع ہوا تھا۔فلمی نقادوں نے چوپڑہ صاحب کی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کو خوب سراہا۔

1953 میں اُنہوں نے فلم ''شعلے'' اور 1954 میں اُنہوں نے ہدایت کار کے طور پر مینا کماری کو لے کر فلم ''چاندنی چوک'' بنائی۔یہ وہی فلم تھی جو اُنہوں نے لاہور میں شروع کی تھی ۔1955 میں اُنہوں نے ایک اور فلم کو ڈائرکٹ کیا۔اس فلم کا نام ''ایک ہی راستہ'' تھا۔یہ فلم ایک سلگتے ہوئے موضوع پر مبنی تھی۔ہندو بیوہ کی دوسری شادی۔فلم چلی تو ضرور البتہ وہ کامیابی حاصل نہ کرسکی جس کی اُمید چوپڑہ صاحب نے کی تھی۔چوپڑہ صاحب کا شروع سے ہی یہ مسلک رہا کہ وہ بامقصد اور معیاری فلمیں ہی بنائیں گے۔وہ اس قول پر آخری دم تک قائم رہے۔بطور ہدایتکار اُنہوں نے اپنی ایک الگ پہچان بنالی تھی۔ایک دن وہ صبح صبح تیار ہو کے کہیں جارہے تھے کہ بیوی نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو۔چوپڑہ صاحب نے کہا کہ کسی پرڈیوسر سے ملنے جارہا ہوں۔بیوی نے کہا کہ وہ دوسروں سے کام مانگنے کی بجائے اپنی کمپنی کیوں نہیں کھولتے۔چوپڑہ صاحب نے کہا کہ کمپنی کھولنے کے لئے پیسے درکار ہیں۔کون دے گا پیسے؟ بیوی نے کہا کہ اُسکے پاس کچھ رقم موجود ہے جو وہ پس انداز کرتی رہی اور ساتھ ہی اُسکے پاس کچھ گہنے بھی ہیں،اگر وہ چاہیں تو انہیں بیچ کر وہ اپنی کمپنی کھول سکتے ہیں۔تھوڑی ردوقدح کے بعد چوپڑہ صاحب نے بیوی کی بات مان لی اور اُنہوں نے اپنی ذاتی کمپنی کھولنے کا فیصلہ کرلیا۔اور'1955' میں اپنی پروڈکشن کمپنی ''بی۔آر۔فلمز'' کی نیو ڈال دی۔

اُنہوں نے بی۔آر۔ کے بینر تلے اپنی پہلی فلم ''نیا دور'' بنانے کا اعلان کیا۔یہ کہانی اختر مرزا کی لکھی ہوئی تھی جو اُس نے کئی لوگوں کو سنائی تھی۔سبھی نے اس کہانی کو رد کیا تھا،یہاں تک کہ محبوب خان نے بھی اس کہانی کو پسند نہیں کیا تھا۔جب اُنہیں پتا چلا کہ چوپڑہ صاحب اس کہانی پر فلم بنانے جارہے ہیں تو اُنہیں بڑی حیرت ہوئی۔اُنہوں نے چوپڑہ صاحب سے مل کر اُنہیں سمجھانے کی

کوشش کی کہ وہ اس کہانی پر فلم نہ بنائیں ورنہ وہ کہیں کے نہ رہ جائیں گے۔ چوپڑہ صاحب نے تو ٹھان لی تھی کہ وہ فلم بنائیں گے تو اسی کہانی پر۔ اُنہوں نے دلیپ کمار اور مدھو بالا کو اس فلم کے لئے سائن کیا۔ اس فلم کی شوٹنگ بڑے تزک و احتشام سے شروع ہوئی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب دلیپ کمار اور مدھو بالا کا عشق پورے شباب پر تھا۔ اس فلم کا پہلا شیڈول پندرہ روز کا تھا جو بمبئی میں پورا کیا گیا۔ اس کے بعد بھوپال کا آؤٹ ڈور تھا جس کے لئے پورے یونٹ کو بھوپال چلنا تھا۔ مدھو بالا کا باپ عطا اللہ خان دلیپ کمار سے پہلے ہی خار کھائے بیٹھا تھا۔ اُسے دلیپ کمار اور مدھو بالا کی قربت بری طرح کھل رہی تھی۔ مدھو بالا اُسکے لئے سونے کے انڈے دینے والی مرغی تھی۔ وہ اس مرغی کو کسی اور کو سونپنے کے لئے تیار نہ تھا اسلئے وہ اس پریمی جوڑے کو الگ کرنے کے لئے ہر طرح کے داو پیچ کھیلتا رہا۔ جب اُسے پتا چلا کہ بھوپال کا آوٹ ڈور ہے تو اُس نے اپنے بیٹی کو بھوپال بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُسنے کھلے عام چوپڑہ صاحب پر یہ الزام لگایا کہ اُس نے دلیپ کمار کو اُسکی بیٹی سے رومانس کرنے کے لئے یہ آوٹ ڈور شیڈول رکھا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ چوپڑہ صاحب کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ پہلی بار دلیپ کمار کو بھری عدالت میں مدھوبالا کے خلاف گواہی دینی پڑی۔ وہ اپنے پیار کی خاطر جھوٹ نہیں بولنا چاہتے تھے۔ مدھو بالا کے خلاف گواہی دیتے وقت اُنہوں نے بھری عدالت میں اس بات کا اعتراف بھی کر لیا کہ وہ مدھو بالا سے پیار کرتے ہیں اور مرتے دم تک اُس سے پیار کرتے رہیں گے۔ مدھو بالا کیس ہار گئی۔ اُسے فلم سے الگ ہونا پڑا۔ اُسکی جگہ وجینتی مالا آ گئی۔ 1957 میں اُنہوں نے یہ فلم ریلیز کی۔ اس فلم نے اسقدر ریکارڈ توڑ کامیابی حاصل کی کہ فلمی پنڈت انگشت بدنداں رہ گئے۔ ''نیا دور'' نے بی۔آر۔ چوپڑہ کو شہرت کی معراج پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اس فلم کو ڈھیر سارے اعزازت سے نوازا گیا۔ اس فلم کی کامیابی کو دیکھ کر چوپڑہ صاحب نے مدھو بالا کے خلاف عدالتی کیس واپس لے لیا اور اس طرح مدھو بالا نہ صرف ذلت سے بچ گئی بلکہ اُسے معاہدے کی خلاف ورزی کرنے پر سزا بھی ہو سکتی تھی اُس عذاب سے بھی اُسے خلاصی مل گئی۔ ''نیا دور'' بمبئی کی فلمی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فلم کو 3 اگست 2007 کو رنگین بنا کر دوبارہ ریلیز کیا گیا۔

اس فلم کی ریکارڈ توڑ کامیابی کے بعد بی۔آر۔ چوپڑہ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ 1959 میں اُنہوں نے وجینتی مالا کو لے کر فلم ''سادھنا'' بنائی۔ بی۔آر۔ چوپڑہ ادبی مزاج رکھتے تھے۔ اُردو پر اُنہیں خاصی دسترس حاصل تھی۔ اُنھوں نے اُردو کے بہترین رائٹروں کے ساتھ کام کیا۔ ساحر لدھیانوی اُن کا من پسند شاعر تھا۔ وہ ساحر کے اس حد تک دیوانے تھے کہ ''نیا دور'' میں جب ساحر صاحب کو پتا چلا کہ موسیقار آر۔ کے۔ نیر کو اُن سے زیادہ معاوضہ ملا ہے تو اُنہوں نے اُس سے زیادہ معاوضے کی مانگ کی۔ بی۔آر۔ چوپڑہ ساحر صاحب کو کھونا نہیں چاہتے تھے اس لئے اُنہوں نے بغیر کسی چوں چرا کے ساحر صاحب کی مانگ پوری کی۔ ''سادھنا'' کا یہ گیت کون بھول سکتا ہے جو لتا منگیشکر نے اپنی پرسوز آواز میں گایا ہے۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اُسے بازار دیا

جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا دھتکار دیا

یہ فلم بھی ایک سلگتے ہوئے موضوع کو لے کر بنائی گئی تھی۔ اس فلم کے بارے میں بی آر۔ چوپڑہ کے فرزند روی چوپڑہ نے ایک بار اپنے ایک ٹی۔وی انٹرویو میں کہا کہ ایک دن وجینتی مالا کی نانی ایک بڑا سا تھال لے کر چوپڑہ صاحب کے گھر پر پہونچی۔ اُسمیں ایک لاکھ کے نوٹ سجے ہوئے تھے۔ نانی نے یہ تھالی چوپڑہ صاحب کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ یہ ایک لاکھ روپے لے لیجئے اور بدلے میں اُس کی نواسی کو اپنی اس فلم میں لے لیجئے گا۔ چوپڑہ صاحب نے وجینتی کو فلم میں تو لے لیا البتہ اُن کی بھینٹ اُنہوں نے سویکار نہیں کی۔

بی۔آر۔ فلمز ہر نئی فلم کے ساتھ شہرت کی نئی بلندیوں کو چھوتا جا رہا تھا۔ بی۔آر۔ چوپڑہ بمبئی کی فلم انڈسٹری کا ایک معتبر نام بن گیا تھا۔ عمدہ اور کامیاب سماجی فلموں کو بنانے میں بی۔آر۔ فلمز نے اپنی ایک الگ پہچان بنا لی تھی۔ یش چوپڑہ جو کہ چوپڑہ صاحب کے برادر اصغر ہیں۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے معاون کے طور پر اُن کے ساتھ کام کرتے رہے۔ چوپڑہ صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی کی صلاحیتوں پر اسقدر بھروسہ تھا کہ اُنہوں نے یش جی کو آزادانہ طور پر ایک فلم کی ہدایت کاری سونپ دی۔ اس فلم کا نام ''دھول کا پھول'' تھا۔ اس فلم کے اداکاروں میں اشوک کمار، راجندر کمار، مالا سنہا اور من موہن کرشن مرکزی کردار میں تھے۔ یہ فلم 1959 میں ریلیز ہوئی۔ ناظرین اس فلم کا وہ لافانی گانا نہیں بھولے ہونگے۔

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا

انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

یہ گانا بھی ساحر کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ اس فلم کی ریکارڈ توڑ کامیابی نے فلمی اُفق پر ایک اور درخشندہ ستارے کا اضافہ کر دیا۔ چوپڑہ صاحب اس فلم کے فلمساز تھے۔

1961 میں چوپڑہ صاحب نے پہلی بار ایک سسپنس تھرلر بنائی۔ اس فلم کا نام ''قانون'' تھا۔ اس فلم میں اشوک کمار اور راجندر کمار کی بے مثال اداکاری کے علاوہ چست منظر نامہ، برجستہ مکالمے اور سلجھی ہوئی ہدایت کاری نے اس فلم میں چار چاند لگا دئے تھے۔ یہ فلم ناظرین کو شروع سے آخر تک باندھ کے رکھ دیتی تھی۔ اس فلم کے لئے بی۔آر۔ چوپڑہ کو 1962 میں بہترین ہدایت کار کے طور پر فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ اس فلم میں ایک بھی گانا نہ تھا پھر بھی یہ فلم باکس آفس پر ہنگامہ مچا بیٹھی۔ 1962 میں یش چوپڑہ کی زیر ہدایت ایک اور فلم بی۔آر۔ فلمز کے بینر تلے بنی

جس کا نام ''دھرم پتر'' تھا۔ یہ یش چوپڑہ کی بحیثیت ہدایت کار دوسری فلم تھی۔اس کے اداکاروں میں ششی کپوراور مالاسنہاسرفہرست تھے۔چونکہ چوپڑہ صاحب بٹوارے کے دردکوبذات خودجھیل چکے تھے اس لئے وہ اس موضوع پر ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔یہ فلم ہندومسلم فسادات کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔ افسوس کہ فلم چل نہ سکی۔

ہجرت کے درد کے تعلق سے مجھے اپنی کہانی یادآ گئی۔1991 میں جب میرے پریوارکوکشمیر سے بھاگ کر بمبئی آنا پڑاتو ان کوزندہ رکھنے کے لئے میں روٹی روزی کی تلاش میں جٹ گیا۔ایک دن میں نے دلیپ صاحب کی چھوٹی بہن اختری بی سے بات کی۔انُہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے لئے کوئی مناسب نوکری تلاش کرلےگی۔انُہوں نے بی۔آر۔چوپڑہ سے بات کی۔ اگلےروز مجھے چوپڑہ صاحب نے اپنے کھارآفس میں بلالیا۔میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ میراکام بن گیااور مجھے بی۔آرفلمز میں کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔میں سویرے سویرے ہی اُن کے آفس میں پہونچ گیا۔جونہی میں نے آپریٹر کواپنانام اورکام بتایااُس نےفوراًانٹرکام پر چوپڑہ صاحب کوخبرکردی۔پانچ منٹ بعد چوپڑہ صاحب بذات خود ننگے پاؤں اپنے ایک کارندے کے ساتھ سیڑھیاں اُترکرنیچےآگئے۔میں نیچےایک سوالی کی طرح کھڑاتھا۔سلام ودعاکے بعدانُہوں نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا۔اس میں کچھ روپے تھے۔روپے دیکھ کر مجھے گہرادھچکالگا۔میں نے مجروح ہوکراحتجاجی انداز میں چوپڑہ صاحب سے کہا کہ میں اُن سے پیسے مانگنےنہیں آیاہوں۔اگر مجھے پیسے ہی مانگنے ہوتے تو میں دلیپ کمارصاحب سے مانگتا،کسی اور سے کیوں مانگتا۔

میں توایک مناسب نوکری کی تلاش میں ہوں۔میں نے سوچا کہ آپ مجھےکوئی نوکری دے پائیں گے۔چوپڑہ صاحب نے اپنی ہجرت کاواقعہ سنا کر مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے یہ مددقبول کرنی چاہیے کیونکہ ان پیسوں کوقبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ میری اناکوٹھیس پہونچا چکے ہیں۔میں نے زندگی میں کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے تھےاسلئے میں اُن کی پیشکش ٹھکراکروہاں سے نکل گیااورکھارروڈ سے اندھیری تک میں روتارہا۔مجھے رونااس بات پرآرہاتھا کہ کیااب مجھے جینے کے لئے بھیک مانگ کراپنا گزارہ چلانا پڑے گا؟اس واقعے کے بعدمیری چوپڑہ صاحب سے کئی بارملاقات ہوئی۔تب میں دلیپ صاحب کا دست راست تھااورانڈسٹری کے لوگ مجھے دلیپ صاحب کےاس قدرقریب ہونے کے ناتے بڑی عزت دیتے تھے۔

یہ تھی میری کہانی۔اب چوپڑہ صاحب کی کہانی سنئے۔''دھرم پتر'' کی ناکامی کے بعد چوپڑہ صاحب ایک بارپھرمیدان میں اُترپڑے۔اس بار اُنہوں نے فلم ''گمراہ'' بنانے کا فیصلہ کیا۔یہ ایک پریم کہانی تھی۔تین کرداروں پر مشتمل یہ تکونی کہانی بڑی دلچسپ تھی۔شوہر بیوی اور بیوی کے پہلے عاشق کے بیچ چلنےوالی اس پریم کہانی میں ایسے ڈرامائی موڑپیداکئے گئے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔اس فلم کے مرکزی کردار میں اشوک کمار، راجندر کمار اور سادھنا تھے۔یہ فلم باکس آفس پردھوم مچابیٹھی۔اس فلم میں سب سے زیادہ اشوک کمار کی اداکاری کی تعریف کی گئی تھی۔

1965 میں یش چوپڑہ کے کھاتے میں ایک ایسی فلم کا اضافہ ہوا جس نے اُسے عظمت بخشی۔یش چوپڑہ کا نام چوٹی کے ہدایت کاروں میں لیا جانے لگا۔یہ فلم تھی ''وقت'' جواُس زمانے کی ملٹی اسٹارفلم تھی۔راج کمار،سنیل دت،ششی کپور،سادھنا،بلراج ساہنی،شرمیلا ٹیگوراس فلم کے مکھیہ اداکاروں میں شامل تھے۔اس فلم میں راجکمار کے مکالموں پرلوگ ہزارجان سے فداہوکررہ گئے تھے۔''چنائے سیٹھ!جوخودشیشے کےمحل میں رہتے ہوں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے۔''اُس زمانے میں ان مکالموں کوہرطبقے کے لوگ محل بےمحل دہرایا کرتے تھے۔''وقت''ایک کامیاب ترین فلم تھی جس نے بی۔آر۔فلمز کے پرچم کواورزیادہ سربلندی عطا کی۔

1967 میں چوپڑہ صاحب نے ایک اورفلم بنائی جس کانام ''ہمراز'' تھا۔اس فلم میں راجکمار،سادھنا،سنیل دت،بلراج ساہنی اورنئی اداکارہ ومی نے کام کیا تھا۔یہ فلم بھی ایک تھرلر تھی۔بی۔آر۔چوپڑہ کے یہاں ایک اسٹوری بورڈ ہوا کرتا تھا جس میں انڈسٹری کے بہترین رائٹر شامل تھے۔اخترالایمان ان کے پسندیدہ مکالمہ نگار تھے''ہمراز'' نےبھی کامیابی کےجھنڈے گاڑدئے۔

''وقت'' کے بعدیش چوپڑہ ''آدمی اورانسان'' کی تیاریوں میں لگا تھا۔یہ بھی ملٹی اسٹارفلم تھی۔اس فلم کوسیٹ پر جانے میں ابھی وقت تھا۔یش جی کے پاس وقت گزاری کے لئے کچھ نہیں تھا۔ایک دن چوپڑہ صاحب نے یش سے کہا کہ وہ کوئی کومکی کیوں نہیں بناتا۔یش جی نے ایک ناٹک دیکھا تھا جواُنہیں اتنا بھا گیا تھا کہ وہ اسے ایک مکمل فلم کی صورت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔بڑے بھائی سے اجازت پاکراُنہوں نے راجیش کھنہ اورنندہ کولے کرایک فلم بنائی جس کا نام ''اتفاق'' تھا۔اس فلم میں نہ کوئی گانا تھا نہ کوئی رومانس تھا۔یہ ایک مرڈر مسٹری تھی۔ایک عورت اپنے عاشق کی مدد سے اپنے شوہر کاقتل کرتی ہے۔اسی بیچ خبر یہ ملتی ہے کہ پاگل خانے سیا یک خونخوار پاگل فرار ہوگیا ہے۔وہ اسی گھر میں جاکرچھپ جاتا ہے۔بیوی اوراُس کا عاشق اس صورت حال کا فائدہ اُٹھا کر اس قتل کے لئے پاگل کوقصوروارٹھہراتے ہیں۔کہانی میں ڈرامائی موڑتب آجاتا ہے جب یہ پتا چلتا ہے کہ جسے خطرناک پاگل قراردیا گیا ہے وہ پاگل نہیں بلکہ بےرحم حالات کاشکار ہےاورغلط فہمی کےکارن اُسے پاگل خانے میں بندکیا جاتا ہے۔وہ تہہ درتہہ اس قتل کیس کی گھتیاں کھول دیتا ہےاورقصوروار اپنے انجام تک پہونچ جاتے ہیں۔یہ فلم شائقین کوکچھ خاص پسند نہ آئی اوراس طرح راجیش کھنہ کے ہوتے ہوئے یہ فلم ناکام رہی۔یہ وہ زمانہ تھاجب راجیش کھنہ کے نام کی کمان ہرطرف چڑھی ہوئی تھی۔

1970 میں یش چوپڑہ کی زیرہدایت بننے والی فلم ''آدمی اور

انسان'' ریلیز ہوئی۔اس فلم کے مرکزی کرداروں میں دھرمیندر، فیروز خان، سائرہ بانو اور ممتاز نمایاں تھے۔اس فلم کو بھی خوب کامیابی ملی۔یہ فلم بی۔آر۔فلمز کے لئے یش چوپڑہ کی آخری سوغات تھی۔اس فلم کے بعد یش چوپڑہ اپنے بڑے بھائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ ہو گئے۔بی۔آر۔چوپڑہ نے اپنے اکلوتے بیٹے روی چوپڑہ کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔یش کے چلے جانے سے وہ ٹوٹ ضرور گئے مگر اُنہوں نے بی۔آر۔فلمز کی مشعل کو روشن رکھا۔1972 اُنہوں نے اپنی کامیاب ترین فلم ''افسانہ'' کو دوبارہ بنایا۔اس بار اُنہوں نے اپنے محبوب اداکار دلیپ کمار کو شرمیلا ٹیگور کے ساتھ پیش کیا۔افسوس یہ فلم نہیں چلی۔ 1973 میں اُنہوں نے سنجے خان اور زینت امان کو لے کر ایک اور فلم بنائی جس کا نام ''دھند'' تھا۔یہ فلم بھی نہیں چلی۔اس فلم سے ایک بہترین اداکار کا جنم ہوا جس کا نام ڈینی ڈنزوگپا تھا۔1975 میں اُنہوں نے اپنے بیٹے روی چوپڑہ کی ہدایت میں بننے والی پہلی فلم ''ضمیر'' پیش کی۔اس فلم میں امیتابھ بچن اور سائرہ بانو کلیدی رول میں تھے۔یہ فلم بھی نہیں چلی۔1976 میں اُنہوں نے باسو چٹرجی کے ساتھ ایک فلم بنائی جس کا نام ''چھوٹی سی بات'' تھا۔یہ فلم بظاہر تو چھوٹی تھی مگر یہ فلم بڑی بن گئی۔اس فلم میں اشوک کمار، امول پالیکر اور ودیا سنہا نے کام کیا تھا۔یہ فلم ہر خاص وعام کو پسند آگئی۔اس فلم کی خاصیت اس کی سادگی تھی۔یہ ایک لو اسٹوری تھی جسے اشوک کمار اور امول پالیکر کی دمدار اداکاری نے جاوداں کر دیا تھا۔

1977 میں اُنہوں نے ''کرم'' نام کی ایک فلم بنائی۔اس فلم کے مرکزی کردار میں راجیش کھنہ، ودیا سنہا اور شبانہ اعظمی تھے یہ فلم بھی باکس آفس پر اوندھے منہ گری۔1980 میں چوپڑہ صاحب نے سنجیو کمار، ودیا سنہا اور رنجیتا کو لے کر ایک چھوٹی سی فلم بنائی۔اس فلم کا نام ''پتی، پتنی اور وہ'' تھا۔یہ فلم ایسی چلی، ایسی چلی کہ فلمی پنڈت دنگ رہ گئے۔کسی بھی فلمی مہارتھی نے اس بات کی کلپنا بھی نہ کی تھی کہ یہ فلم ایسی دھوم مچائے گی۔اس فلم میں سنجیو کمار نے جس اچھوتی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا اُس کا کوئی ثانی نہ تھا۔سنجیو کمار سچ میں ایک عظیم اداکار تھا جسے اپنے فن پر ید طولی حاصل تھا۔

1980 میں بی۔آر۔فلمز نے دو فلمیں پیش کیں۔ایک فلم چوپڑہ صاحب کی زیر ہدایت بنی تھی، دوسری فلم اُن کے صاحبزادے روی چوپڑہ نے بنائی تھی۔

اس فلم کا نام ''دی برننگ ٹرین'' تھا۔اس فلم میں دھرمیندر، پروین بابی، جتیندر، ہیما مالنی، ونود مہرہ، ڈینی اور نیتو سنگھ نے کام کیا تھا۔افسوس کہ ستاروں کی اتنی بڑی فوج بھی اس فلم کو ڈوبنے سے نہ بچا سکی۔اسکے برعکس چوپڑہ صاحب نے ایک نو آموز اداکار راج ببر کو لے کر اس سال ایک فلم بنائی جس کا نام ''انصاف کا ترازو'' تھا۔

اس فلم میں معاون اداکاروں میں پروین بابی اور پدمنی کولہا پوری شامل تھی۔چوپڑہ صاحب کی سلجھی ہوئی ہدایت کاری اور چست اسکرپٹ کی وجہ سے یہ فلم باکس آفس پر کمال کر بیٹھی۔یہ فلم بھی ایک ایسے سلگتے ہوئے سماجی موضوع پر تھی جس پر کسی فلمساز کی کبھی نگاہ ہی نہیں پڑی۔زنا بلجبر جیسا موضوع لے کر چوپڑہ صاحب نے ذی حس لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

1982 میں پھر اُنہوں نے دو فلمیں پیش کیں۔روی چوپڑہ کی زیر ہدایت بننے والی فلم کا نام ''اگنی پریکھشا'' تھا جب کہ چوپڑہ صاحب کی ہدایت میں بننے والی فلم کا نام ''نکاح'' تھا۔''فلم اگنی پریکھشا'' کا حشر وہی ہوا جو روی چوپڑہ کی سابقہ فلموں کا ہوا تھا۔اسکے برعکس فلم ''نکاح'' نے ہر شہر میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔اس فلم میں راج ببر، دیپک پراشر کے علاوہ ایک نو خیز پاکستانی اداکارہ تھی جس کا نام سلمہ آغا تھا جس نے نہ صرف اپنی معصوم اداکاری سے ناظرین کا من موہ لیا بلکہ اپنی خمار آگیں آواز سے کروڑوں لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا دیا۔یہ فلم مسلم بیک گراونڈ کو لے کر بنائی گئی تھی اور اسمیں طلاق کے حساس موضوع کو اُجاگر کیا گیا تھا۔اس فلم کو ہر خاص وعام نے پسند کیا۔

''نکاح'' کے بعد بی۔آر فلمز نے کئی ساری فلمیں بنائیں جو باکس آفس پر ناکام رہیں۔ان فلموں کے نام یوں ہیں۔1983 میں فلم ''مزدور'' جو روی چوپڑہ کی ہدایت میں بنی تھی اور جسمیں دلیپ کمار جیسا قدآور اداکار تھا پھر بھی یہ فلم نہ چلی۔1984 میں ''آج کی آواز'' جو ٹھیک ٹھاک گئی۔1986 میں ''کرایہ دار'' اور ''دہلیز'' باکس آفس پر اوندھے منہ گریں۔1987 میں چوپڑہ صاحب کی ہدایت میں بننے والی فلم ''عوام'' بھی جنتا جناردھن کو اپنی اور کھینچ نہ سکی۔1991 میں ''پرتیگیا بند'' بھی نہ چل سکی۔1992 میں ''کل کی آواز'' چوپڑہ صاحب کی بطور ہدایت کار آخری فلم تھی جو ٹھیک ٹھاک رہی۔

فلموں کی ناکامی کی بھرپائی چوپڑہ صاحب نے اپنے ٹی۔وی سیریل ''مہا بھارت'' سے کی۔''مہا بھارت'' 1988 سے لے کے 1990 تک دوردرشن کی زینت بنا رہا۔اس سیریل نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔اتوار کے دن تمام شہروں کے بازار بند ہو جایا کرتے تھے۔لوگ اپنے اپنے ٹی۔وی سیٹوں کے سامنے نہا دھو کر بیٹھ جاتے تھے۔چوپڑہ صاحب ہندو مسلم بھائی چارے کے ہمیشہ حامی رہے ہیں۔قارئین کو یہ سن کر اچنبھا ہوگا کہ ''مہا بھارت'' کو لکھنے والا کوئی ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھا جس کا نام راہی معصوم رضا تھا۔''مہا بھارت'' ہر لحاظ سے ایک مکمل اور جامع ٹیلی سیریل تھا جس نے بی۔آر۔فلمز کو نئی رفعت سے ہمکنار کر دیا۔

اس سیریل نے چوپڑہ صاحب کو نہ صرف شہرت بخشی بلکہ عزت اور دولت سے بھی سرفراز کیا۔آج بھی اس کی cds دھڑلے سے بکتی ہیں۔

چوپڑہ صاحب آخری ایام میں بیحد علیل رہے۔وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔اُنہیں ویل چئیر کا سہارا لینا پڑتا تھا۔5 نومبر 2008 کو ایک طویل علالت کے بعد وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور ہمارے لئے چھوڑ گئے یادوں کا ایک انمول خزانہ۔

ورثہ

''اِٹّاں روڑے''

یاری لانا سوکھا کم اے توڑ نبھانا اوکھا
اکھ چُرانا یار دی عادت اکھ ملانا اوکھا

وارث شاہ دی ہیر نُوں پڑھ کے رانجھا کوئی نہ بنیا
ہیر دی خاطر ٹھوٹھا پھڑنا ، کن پڑوانا اوکھا

اِٹّاں روڑے ہتھ چ پھڑ کے راہواں ڈکن والے
اوہ کیہ جانن جیوندے جی نوں مار مکانا اوکھا

عمراں لنگھیاں لیکاں چھکدیاں نقطہ ہتھ نہ آیا
اکھر لکھنا ہر کوئی جانے نام کمانا اوکھا

عزتاں دا رکھوالا آپو کنی عزت والا
سرتے کپیا جانا اک دن پگ بچانا اوکھا

حق دی خاطر ڈاہڈے اگے ڈٹ جانا وی چنگا
منصف دے لئی کمزوراں نوں حق دوانا اوکھا

رُسیا یار جے راضی ہووے منتاں ترلے کریئے
بوہے جا کے یار دی خاطر سیس نوانا اوکھا

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

''لگدا قبراں بولدیاں''

گھر جاواں تے تصویراں نیں۔۔۔
تصویراں نہیں بولدیاں۔۔۔
اِکو چُپ اوہناں ہوٹھاں تے۔۔۔
جتھے سدا دُعاواں سَن۔۔۔
گھر دی ہر اک شے اوہناں دی۔۔۔
یادتوں نیڑیاں کردی جاوے۔۔۔
دِل وَس وِچ ناں اکھاں ای۔۔۔
رَل کے نیں کرلاندے جاندے۔۔۔
گھر چھڈ کے میں اوتھے اَپڑاں۔۔۔
جتھے مَاپے سُتے نیں۔۔۔
ہتھ دُعالئی، مشک گلاباں۔۔۔
ڈھیریاں اُتے کِھڑ دی اے۔۔۔
ساری رونق جویں گھر دی۔۔۔
اَیتھے آ کے وس گئی اے۔۔۔
اکھیاں نُوں جویں جیوندے دِسدے۔۔۔
مُسکاوندے بُشرے دے نال۔۔۔
تصویراں نہیں بولدیاں۔۔۔
پر
لگدا قبراں بولدیاں!

شگفتہ نازلی

(لاہور)

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

اے گلزارِ ''چہارسو''!

ہم آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کریں۔ جو 2012ء کا پہلا شمارہ اس غیر مستحق کے نام کیا۔ اگر آج حشر قائم ہوتا تو میری دس کتابوں والا پلڑا آپ کے چند اوراق کے مقابلے میں ہلکا نظر آتا۔ میں اس قابل کہاں تھا کہ چہارسو کی وساطت کے بغیر تیس (30) سے زائد ناقدین اور ادیبوں کی علمی رائے کا بوجھ اٹھا پاتا۔ محترم سرور انبالوی صاحب کی شاعرانہ صنعت اور قلم کاری نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اُنکی اس کاوش پر بہت شکر گزار ہوں۔ اسی طرح ڈاکٹر یحییٰ نشیط صاحب نے جو مجھری ادب کے نکات اُجاگر کیے ہیں اُن سے وطن سے دور ادیبوں کے حوصلے بلند ہوئے ہیں۔ غلام مرتضیٰ راہی صاحب کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہوگا۔ کیونکہ اُن کی بصیرت نے ہند کے خطے خطے میں میرا نام پہنچا دیا۔ اُن کے توسط سے بہت سے شعراء اور ادیبوں سے رابطہ ہوا اور بعض سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اُنہیں کی وجہ سے محترم عشرت ظفر اور ڈاکٹر اسماعیل سے تعلقات استوار ہوئے۔ مامون ایمن صاحب سے امریکہ میں بات چیت کا سلسلہ اس بارے جاری ہے اور اُنکے تاثرات بہت اچھے اور مثبت ہیں۔

میں یہ خط مختصر رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے توسط سے ہر اُس شخص کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے بارے میں ایک لفظ بھی لکھا یا میرے اشعار کو چُنا۔ میں یہاں ہر شخص کا نام یوں نہ لکھنا چاہتا ہوں کہ پڑھنے والے یہ نہ کہیں کہ ان لوگوں کا نام لکھ کر اپنی تعریف کر رہا ہے۔ چہارسو کے تمام اراکین کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ایک نام خاص طور پر لکھ دوں وگرنہ اگلی بار ہند میں داخلہ ممنوع ہوگا۔ جناب چوہدری علی مبارک عثمانی صاحب جنہوں نے T.V پر (دوردرشن) میرا انٹرویو لیا جو کہ بعد میں بہت ممالک میں نشر ہوا۔

صفوت علی صفوت (یو۔ایس۔اے)

عزیزی گلزار جاوید صاحب!

شاید آپ اس انکشاف پر مسکرائیں یا غصّہ ہوں کہ پہلے میں آپ کے چہارسو کو محض ایک قرطاسِ اعزاز کا حامل جریدہ سمجھتا تھا مگر یہ آپ کے اس مضمون سے پتا چلا جو آپ نے گذشتہ شمارہ میں اداکاروں اور اداکاراؤں پر رقم فرمایا تھا کہ چہارسو میں قرطاس اعزاز کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے اور بڑے عالمانہ اور فاضلانہ انداز میں زندہ باد مگر تازہ شمارہ میں آپ نے صفوت علی صفوت پر اتنا عمدہ اور خوب سارا مواد جمع کر ڈالا کہ اُس کی داد دینا بھی چاہوں تو داد دیتا نظر نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ صفوت علی صفوت ایک نہیں کئی صفوت علی ہیں۔ کبھی ان حضرت کا ایک پہلو اجاگر ہوتا ہے اور ابھی کہ پہلو اجاگر ہو رہا ہوتا ہے کہ دوسرا پہلو کہہ رہا ہوتا ہے کہ ارے اس پہلو کو کیا دیکھ رہے ہو! مجھے دیکھو میری آغوش میں اس پہلو سے زیادہ مواد موجود ہے اور یہ مواد ہے بھی پہلے مواد سے کہیں زیادہ اہم۔ پہلے تو میں نے یہ لکھا تھا کہ ''چہارسو'' کو ہر لائبریری میں ہونا چاہیے اب میں لکھ رہا ہوں کہ صرف ہر لائبریری ہی میں نہیں بلکہ چہارسو کو ہر گھر میں ہونا چاہیے۔ اور ہاں یہ بھی سن لیجیے کہ فلم کا آدمی فلم کا زیادہ ہوتا ہے اور علم کا کم لیکن آپ کے چہارسو نے مجھے یہ بھی بتایا کہ نہیں جناب فلم کا آدمی علم کا بھی آدمی ہوتا ہے اور جب فلم کا آدمی علم کا آدمی ہوتا ہے تو پھر یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی فلم کا زیادہ ہے یا علم کا۔ تو حضرت قبلہ گلزار جاوید صاحب میری جان آپ ہمیں تو علم کے آدمی زیادہ نظر آتے ہیں اگر چہ ویسے آپ پر نگاہ ڈالی جائے تو آپ ایک ہم جیسے عام آدمی ہی نظر آتے ہیں۔

سید مشکور حسین یاد (لاہور)

میرے گلزار، خوش رہو!

چہارسو کا تازہ ترین تحفہ باصرہ نواز ہوا۔ اور حفیظ انجم کی نظم کا اک اک لفظ میرے دل کی آرزو ہے۔ نظم خوب ہے حسنِ بصیرت خوب ہے۔ برسوں سے صفوت صاحب کو پڑھنے سے اشتیاق تھا کہ یہ آپ کے صفحۂ قرطاس پر نازل ہوں، آپ نے وہ بھی تشنگی بجھا دی گو کہ ہر شعر زندگی سے قربت کا احساس دلاتا ہے۔ مگر یہ اشعار کچھ عجیب طور سے دل میں اُترے۔ آنا، جانا ہے اٹل پیچ کی کاوش کیا ہے/ چھوڑ یہ فلسفہ تقدیر کا کیوں الجھا ہے/ بات یہ سوچ تری صورت بخش کیا ہے۔ اور اُن پر لکھے گئے تمام مضامین گو مختصر مختصر ہیں مگر خوب ہیں۔ دیپک بدکی کا ''روح کا کرب'' رومانہ رومی کا ''احساس کا میل'' رینو بہل کا ''آندھی میں رکھا دیا'' پسند آئے اور ''ثناخوانِ تقدیس'' گلزار جاوید پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔ مہندر پرتاپ چاند کا پیغام صبا۔ اُن کی محنت کی داد دینا ضروری ہے خوب لکھا ہے۔ دیپک کنول صاحب کا ایک صدی کا قصہ ہمیشہ کی طرح اچھا لگا۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کا ''ہوا کے دوش پر'' اس طرح پڑھتا ہوں جیسے میں نے اس کا امتحان دینا ہوگا۔ مشکل حالات کا تذکرہ اور جن میں فرشتہ اور غیبی آواز کا ذکر ہے احساس کو جھنجھوڑتا ہے۔ آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے ہیں۔ وہی جانتا ہے جو ان حالات سے گزر رہا ہو۔ فیروز عالم خوب لکھتے ہو۔ کیا بیان ہے۔ خوش رہو، اور دعائیں۔ آپ واقعی ایک کامیاب ''ڈاکٹر'' ہو طب کے بھی اور ادب کے بھی۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)

محترم بھائی گلزار جاوید صاحب' اسلام علیکم۔

اس بار صفوت علی صفوت جیسے دانشور ادیب/ شاعر کو آپ نے اپنی متجسس نظر کے ذریعے امریکہ سے ڈھونڈ نکالا۔ اب سے شاید ۳۰ سال پیشتر آپ اسلام آباد سے کوئی جریدہ بھی نکالا کرتے تھے جس میں ایک آدھ بار میری کوئی غزل بھی شائع ہوئی تھی بہرحال موصوف کے بارے میں ''براہِ راست'' میں جان کر اور آپ کے مضامین امریکہ اور قرآن، ربِّ زدنی علما پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ کیسے کیسے علم کے ذخائر کہاں کہاں چلے گئے لیکن علم سے کسی نہ کسی طور پر اپنا رشتہ قائم رکھا۔ ''ربِّ زدنی علما'' اُن کے کسی انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے اور اصل مضمون کا اختصار ہے جس کے سبب پڑھنے کے بعد تشنگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ کاش! کسی موقع پر آپ اُن کا یہ مکمل مضمون شائع فرمائیں تو تسکین دل وجاں کو کچھ ساماں ہو جائے۔ دیپک بدکی کا افسانہ اگر چہ صرف دو صفحوں پر محیط مختصر تھا مگر اُس کا اثر دیر پا رہا جیسے شوانگی کے چہرے کا سکون! ٹھیک یہی حال، رومانہ رومی کے افسانے ''احساس کا میل'' کا تھا۔ محترمہ عموماً مختصر افسانوں میں ایسی اہم باتیں کہہ جاتی ہیں جو دل کو لگتی ہیں اور نئی نہ ہونے کے باوجود کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

گلزار جاوید کا افسانہ ''ثناخوانِ تقدیس'' بھی عجیب تاثر دیتا افسانہ تھا جس میں مرکزیت تو میڈم سوزان کے کردار کو حاصل رہی اور موجودہ معاشرے کے سارے رنگ ایک رنگ میں سمٹ آئے تھے مگر PERVERTED عورت کے تلوے چاٹنے کا کام ''بُلڈاگ سے کروا کر'' مصنف نے جنسی آسودگی کا نیا زاویہ جو منکشف کیا ہے اُس میں شائستگی اُبھر آئی ہے۔ مبارک ہو۔ پروفیسر انوار احمد زئی نے اپنی یادداشت کے حوالے سے جو استاد اختر انصاری اکبر آبادی مرحوم کو یاد کیا ہے اُسے پڑھ کر اب سے تیس، پینتیس سال پُرانا زمانہ یاد آ گیا مرحوم سے میری ایک ہی بار اپنے دوست ناصر زیدی کے دفتر میں فون کے توسط سے گفتگو ہوئی تھی۔ ناصر نے اُن سے میرا تعارف کروایا تو فوراً بول پڑے میں کسی شاعر کو اُس وقت تک شاعر نہیں مانتا جب تک وہ ''نئی قدریں'' میں نہ چھپے۔ آخر ناصر زیدی کی ایما پر میں نے انہیں دو غزلیں ارسال کی تھیں جنہیں مرحوم نے اہتمام سے شائع فرمایا تھا پھر اُن سے حیدر آباد جا کر ملنے کی خواہش دل ہی میں رہ گئی اور وہ بہاولپور کے ہوٹل میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

غالب عرفان (کراچی)

عزیز از دل وجاں گلزار جاوید صاحب

دل مضطرب اور نگاہِ شفیقانہ بہ دل وجاں حاضر۔ نگاہِ شفیقانہ نہ کہیے نگاہِ عاشقانہ کہیے۔ معمولاً اب کے بھی چہارسو نے جلوہ در جلوہ نیرنگیاں دکھائی ہیں۔ مضمون اور نوشتے آنکھ میں بھرتے ہوئے دل میں اُتر گئے۔ ان کے برگ و بار سے ضعفِ دل وجاں میں کمی واقع ہوئی۔ میں ''ویرانہ بسری'' سے نحیف نزار ہوں لے دے کر اب رسالے کتابیں ہیں جن سے مستحکم ہوں چہارسو سے جو مطالعے کی خوشی ملتی ہے وہ ذرا مختلف سی ہے۔ آپ کا انتخاب ہیرے موتی سے کم نہیں۔ جن کی چوٹ پڑنے سے چہارسو گویا سارا مکان بوقلموں ہو جاتا ہے۔ بود و نبود محسوسات سے بعید نہیں۔ معیارات کے سب معترف ہیں، اس مقدمے میں یار و اغیار متفق اللفظ ہیں۔ صفوت علی صفوتؔ کی ادبی شخصیت متاثر کرتی ہے۔ بمصداق شعر:

صدق و صفا مہر و وفا اس کی ذات ہے
گنجینۂ معانی ہر اک اس کی بات ہے

(سرور انبالوی)

صفوت علی صفوتؔ کا تکلم متنوع موضوعات کو محیط ہے۔ میں نے ان کی نگارشات سے حوصلہ پایا ہے۔ ایک ایک لفظ نے لطف وعطا سے اس فقیر بعید از منزل کو اپنی حمایت میں لے رکھا ہے۔ افسانے پسند آئے آپ کا افسانہ اندازِ یک سو کا حامل ہے۔ ایسا منفرد انداز ''چہارسو'' میں نہیں ملتا۔ آپ نے تازہ ''فنون'' دیکھا ہوگا۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی اور نیّر حیات قاسمی نے احمد ندیم قاسمی کی ''روش'' پر چلتے ہوئے فقیر کو ''امیر'' بنا کے پیش کیا ہے۔ مجھے اپنے عجز اور نقص کا اعتراف ہے۔ ''جگت استاد'' پروفیسر اختر انصاری کے خصوص میں مضمون شدتِ احساس میں پیرائے کی کرب سامانی لیے ہوئے ہے۔ دیکھا نہیں سنا ضرور ہے۔ گو ملاقات نہیں ہوئی ان کو پڑھا بہت ہے۔ ان کا رسالہ بھی میرا دیکھا ہوا ہے۔ مانا اختر مرحوم اشاعتی در و بست پر نظر کم رکھتے تھے مگر معیار اور حسنِ انتخاب میں کمی نہیں آنے پائی تھی۔ یہ مضمون احساسات کے تار ہلا دینے والا ہے جو اچھے قلم کے سائے سے نکلا اور اچھے جریدے میں جریدہ جریدہ ہوا۔

''غزل نو کا پیکر تراش'' قیصر نجفی کے سے ممتاز صاحبِ قلم کی صلاحیتوں اور اخلاص مندیوں کا ثمرہ ہے۔ ان کے ''چناؤ'' سے اختلاف تو ہو سکتا ہے مگر تحریر کی خوبی اور دلائل کی استقامت سے انکار ممکن نہیں۔ قیصر نجفی کی شاعری بھی مرتفع پایہ اور نثر بھی کانٹے کی۔ ماشاءاللہ وہ قریب قریب ہر رسالے میں دل مضطرب اور نگاہ شفیقانہ کی کاوشوں سے ہمیں بہرہ مند کرتے ہیں۔ ''ایک صدی کا قصہ'' بسلسلہ شوکت حسین رضوی دیپک کنول پاکستان اور انڈیا کے فلمی تقابل میں ذرا جانبدار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے شاید پاکستانی فلمیں ''انتظار''، ''قاتل''، ''سات لاکھ''، ''دو آنسو''، ''پتن'' (وغیرہ) نہیں دیکھیں۔ رتبۂ تصرف کی تنگی کے باوصف پاکستان میں پائے کی فلمیں بنی ہیں۔ دیپک کنول کے مضامین کی دلچسپی کا میں منکر ہرگز نہیں بلکہ ان کا شکر گزار ہوں کہ وہ ہمیں ''برصغیر'' کی فلمی زندگی کی معلومات بہم پہنچا رہے ہیں۔ نوید سروش میرے محسن ہیں وہ اپنے ہر خط میں مجھے نوازتے ہیں۔ انہوں نے کمال محبت سے میرپور میں علمی، ادبی رونقیں لگا رکھی ہیں۔ خدا انہیں اور ہمت دے۔ میں ان کے کلام سے بھی حظ اندوز ہوتا ہوں۔ آخر میں چہارسو کے اس شعر کے ساتھ رخصت۔

چلا ہے اسپِ رواں جنگلوں سے دور کہیں
اور آگے آگے تھکاوٹ سے چُور آ ہو ہے

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

چہارسو کی الیکٹرانک کاپی موصول ہوئی۔ اس سے قبل کے شمارے بھی ملتے رہتے ہیں۔ محترمہ پروین شیر کے فکروفن سے منسوب اس شمارے کی ہارڈ کاپی میں موصول ہوئی تھی۔ تازہ شمارہ صفوت علی صفوت کے فکروفن سے منسوب ہے۔ آج کے دور میں جہاں اردو زبان وادب شاعری اور افسانہ نگاری کے حصار میں قید ہو کر رہ گئی ہے وہاں صفوت صاحب جیسے اجتہادی شاعر کے کلام کا مطالعہ کر کے ایک روحانی طمانیت نصیب ہوئی ہے۔ موصوف کے فکروفن پر تمام مضامین محنت اور علمی لیاقت کے ساتھ سپردِ قلم ہوئے ہیں جس کے لیے تمام احباب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نذیر فتح پوری (بھارت)

گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون!

چہارسو بابت: مارچ۔ اپریل ۲۰۱۲ء کے لیے شکر گزار ہوں۔ پرچے کی سب سے عمدہ تحریر ’’جگت استاذ‘‘ اختر انصاری اکبر آبادی کا خاکہ از انوار احمد زئی ہے۔ یہ ’’دوزخی‘‘ از عصمت چغتائی طرز کی چیز ہے۔ جس طرح ایک زمانے میں ’’دوزخی‘‘ کے حق میں آل احمد سرور اور مخالفت میں رشید احمد صدیقی سرگرم دیکھے گئے، بہت ممکن ہے اُنھی حوالوں سے ’’چہارسو‘‘ کے صفحات پر بحث چھڑے اور کوئی کہے کہ انوار احمد زئی کے استاد اختر انصاری اکبر آبادی کا خاکہ نہیں لکھا، خاکہ اُڑایا ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ نہ عصمت چغتائی اپنے از حد سنکی، ٹی۔ بی کے مریض بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی سے نفرت کرتی تھیں، نا انوار احمد زئی نے کم تر تخلیقی صلاحیتوں کے حامل، لیکن فنافی الادب اُستاد اختر انصاری اکبر آبادی کا مضحکہ اُڑایا۔ دونوں خون کے آنسو روئے ہیں، ’’دوزخی‘‘ اور ’’جگت استاذ‘‘ لکھتے ہوئے۔

۱۹۷۲ء میں استاد اختر انصاری اکبر آبادی لاہور تشریف لائے تھے اور اُس وقت تک میرا ایک افسانہ اور دو مضامین اُستاد کے جریدہ ’’نئی قدریں‘‘ حیدر آباد، سندھ میں شائع ہو چکے تھے۔ مُستزاد یہ کہ میرے مرتب کردہ ادبی جریدہ ’’لفظ‘‘ شمارہ: 1 پر اُستاد کا ریڈیائی تبصرہ بھی ’’نئی قدریں‘‘ میں چھپ چکا تھا۔ یہی میری بدقسمتی تھی، جس کے سبب میں مسلسل، کئی دنوں سے اُستاد کی اردل میں تھا اور اُستاد تھے کہ ہر آدھ گھنٹہ بعد حکم کرتے: ’’بھئی، سگریٹ ختم ہو گئے، لپک کر گولڈ فلیک کی ڈبیہ پکڑو......ارے! کوئی اچھی سی چائے ہو جائے‘‘۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ناصر کاظمی اور سجاد باقر رضوی سب اُنہیں استاد کہہ کر مخاطب کر رہے تھے اور میں اس تکریم پر حیران، اس کھوج میں لگ گیا کہ سبب کیا ہے، پتا چلا کہ اختر انصاری، دو ہیں۔ ایک افسانہ نگار، شاعر اور نقاد اختر انصاری اور دوسرے اپنے اُستاد اختر انصاری۔ اصل اختر انصاری یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء بہ مقام علی گڑھ کی پیدائش تھے۔ اُنہوں نے سینتیس (۳۷) کتب یادگار چھوڑیں، جن میں سے ’’نغمۂ روح‘‘ (قطعات، غزلیات، نظمیں) ۱۹۳۲ء ’’نازو اور دوسرے افسانے‘‘ (۱۹۴۰ء) ’’آبگینے‘‘ (قطعات) ۱۹۴۱ء ’’خونی اور دوسرے افسانے‘‘ ۱۹۴۳ء ’’خوناب‘‘ (غزلیات) ۱۹۴۴ء ’’لو، ایک قصہ سُنو‘‘ (افسانے) ۱۹۵۳ء اپنے اُستاد اختر انصاری کے ادبی دنیا میں نمودار ہونے سے پہلے کا قصہ ہیں۔

اصل اختر انصاری سے گیارہ برس چھوٹے ہمارے استاد اختر انصاری ۱۵۔ اگست ۱۹۲۰ء کو بہ مقام اکبر آباد (حال: آگرہ) پیدا ہوئے۔ غیر منقسم ہندوستان میں جب ہمارے اُستاد اختر انصاری نے اصل اختر انصاری کے نام کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مشاعروں میں شرکت کی غرض سے اپنی ’’رنگا رنگ‘‘ شاعری کا آغاز کیا تو ادبی دنیا میں ہڑ دنگ مچ گئی۔

اصل اختر انصاری ان سے بہت سینئر تھے، وہ نام کیا بدلتے، اُنہوں نے ’’استاذ‘‘ کے کرتوتوں کے سبب اپنے نام کے ساتھ ’’دہلوی‘‘ کا اضافہ کر لیا۔ ادھر، یہ کیوں پیچھے رہتے، استاد نے اپنے نام کے ساتھ ’’اکبر آبادی‘‘ لکھنا شروع کر دیا۔

اختر انصاری، ’’جگت استاذ‘‘ کب اور کیسے تسلیم کئے گئے؟ اس سوال کا جواب کھوجتے ہوئے میری طرح کئی لوگ سرگرداں پھرے۔ تاوقتیکہ سجاد باقر رضوی صاحب نے بتایا کہ جب اختر انصاری اکبر آبادی ہجرت کر کے پاکستان آئے تو غزلیات کا ایک انتخاب شائع کروادیا۔ بس، اُسی دن سے ’’اُستاذ‘‘ کہلائے۔ یہی سبب تھا، اُستاد کی شاعری میں ’’رنگا رنگی‘‘ اور طرحی مشاعروں میں شرکت سے اجتناب کا۔ بہت پہلے کسی ستم ظریف نے شعر کہا تھا:

ملک جب ہوا تقسیم، اپنے ہاتھ کیا آیا
ایک اختر انصاری، وہ بھی اکبر آبادی

جگت استاد اختر انصاری اکبر آبادی نے ۱۹۵۶ء میں ’’نئی قدریں‘‘ حیدر آباد (سندھ) سے جاری کیا تھا۔ اُس پرچے میں اشاعت کی غرض سے جو کچھ بھجوایا جاتا، اُسے براہِ راست ’’نئی قدریں‘‘ کے کاتب چراغ الہٰ آبادی یا حافظ ذوقی ہی دورانِ کتابت پڑھتے تھے۔ جس کا ایک ثبوت مجھے اُس وقت فراہم ہوا، جب میں نے زوال ڈھاکہ کے تناظر میں صدیق سالک کی کتاب ’’ہمہ یاراں دوزخ‘‘ میں پائی جانے والی سوچ پر مضمون لکھتے ہوئے کئی سوالیہ نشان لگائے۔ جنرل ضیاء الحق کا تازہ تازہ مارشل لاء لگا تھا اور پرندہ پر نہیں مارتا تھا۔ سبطِ حسن صاحب بھی میرے اُس مضمون کو اپنے مرتب کردہ جریدہ ’’پاکستانی ادب‘‘ کراچی میں شائع کرنے سے پہلو تہی کرنے لگے۔ میرے بار بار خط لکھنے پر پرچے کی نائب مدیرہ سعیدہ گزدر کا خط مع میرے مضمون کے ملا، جس میں سبطِ حسن صاحب کے نشان زد کردہ حصے حذف کرنے کی اجازت مانگی گئی تھی۔ ایسا

کرتا تو سارا مضمون ہی غت ربود ہوجاتا۔ میں نے وہ مضمون اُسی حالت میں اُستاد اختر انصاری اکبر آبادی کو روانہ کردیا۔''نئی قدریں'' کا اگلا شمارہ آیا تو اُس میں وہ مضمون شامل تھا۔

اللہ بخشے، ضمیر جعفری صاحب نے جب وہ مضمون جنرل ضیاء الحق کے دستِ راست صدیق سالک کو پڑھوایا تو صدیق سالک بجائے مجھ سے اُلجھنے اور مجھے گھاٹ گھاٹ کا پانی پلوانے کے اُسی مضمون کی معرفت میرے دوست بن گئے۔اب سوچتا ہوں، اگر صدیق سالک کی بجائے کوئی اور ہوتا تو اُستاد اور اُن کا بالکا دھر لیے گئے تھے۔

۱۹۷۴ء میں رشید امجد، احمد داؤد اور میں نے ''نئی قدریں'' سے نکل کر مستقل طور پر ''نیا دور'' کراچی ''اوراق'' لاہور ''فنون'' لاہور ''جواز'' مالی گاؤں (بھارت) ''شب خون'' الہ آباد اور ''سیپ'' کراچی کا رُخ کرلیا اور اُستاد کو بھول گئے۔۱۹۷۷ء میں ہمیں اُستاد کا ایک خط موصول ہوا۔تینوں کے لیے مضمون واحد تھا کہ ''نئی قدریں'' کا افسانہ نمبر نکال رہا ہوں۔فوراً تازہ افسانے بھجوائیں۔ہم تینوں نے اُستاد کے حکم کی تعمیل کی، جس کا ثبوت ''نئی قدریں'' شمارہ: ۲،۳ بابت: ۱۹۷۸ء کا افسانہ نمبر ہے۔اُس کے بعد رابطہ نہیں رہا۔بعد میں پتا چلا کہ استاد ۱۸ اگست ۱۹۸۵ کی رات، حبیب ہوٹل، بہاولپور میں انتقال کرگئے۔اُستاد نے اپنے ''رنگارنگ'' کلام کے تین مجموعے ''دل رُسوا''، ''غم فردا'' اور ''سروِ رجاں'' یادگار چھوڑے۔کہا جاتا ہے کہ اُن کی دیگر کتب: ''نظریات''، ''معفکرِ مہران'' اور ''ادبی رابطے لسانی رشتے'' بھی اُن کے اُستادی کے کامل نمونے ہیں۔

''ہوا کے دوش پر'' از فیروز عالم کی ہر قسط میر پور خاص، سندھ سے متعلق میری یادیں تازہ کردیتی ہے۔۱۹۶۴ء کے اواخر میں، جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، تو میرے والد محمد اکرم بیگ صاحب کا بطور ڈی ایس پی میر پور خاص تبادلہ ہوگیا۔سابق ڈی ایس پی نے سرکاری بنگلہ خالی کرنے سے انکار کردیا تو میر خدا بخش تالپور نے اس چپقلش کو ختم کرنے کے لیے گاما سٹیڈیم کے سامنے والے اپنے پیلس ''تالپور ہاؤس'' کا زنانہ حصّہ ہمیں رہائش کے لیے عطا کردیا۔تالپور ہاؤس کے سامنے والے مردانہ حصّے میں میر علی احمد تالپور کا ذاتی کتب خانہ تھا، جس کی ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ کر میں نے اندر آنے جانے کا رستہ بنا لیا۔میر برادران کا قیام کراچی میں رہتا اور میری دوپہریں اُس کتب خانے میں گزرتیں۔جس کی یادگار، لینن کی ایک کتاب اس وقت بھی میرے پاس ہے۔عصر کے وقت چہل قدمی کرتا ہوا میونسپل لائبریری چلا جاتا اور ریڈنگ روم میں رکھے جرائد کا مطالعہ کرتا۔وہاں اُن دنوں کئی سینما گھر تھے۔

سید پیر علی ''تصویر محل''، ماموں جی اینڈ سنز کا ''فردوس''، شیخ حبیب الرحمٰن کا ''پیلس'' اور غوث بخش ملکانی کے ''پاشا'' اور ''قائم سینما'' جن میں میں نے اُن دنوں دلیپ کمار کی ''آن''، ''گھر کی عزت'' اور پریم ناتھ کی ''بادل'' کے علاوہ بہت سی فلمیں جا کی پاڑہ کے محمد یعقوب کے ہمراہ دیکھیں، جو آٹھویں اور نویں درجے میں میرا ہم جماعت تھا مسعود رانا، تمام دوستوں سے دعا کروا کر گلو کاری کی غرض سے لاہور جانے کے لیے نکلا تھا۔اُس کے چھوٹے بھائی جاوید رانا کے ساتھ مل کر گاما سٹیڈیم میں کرکٹ کھیلی اور ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ چھڑ جانے پر فضائی حملے سے بچنے کے لیے ہائی اسکول کے سامنے خندقیں کھودیں۔نوید سروش سے فون پر بات ہوئی تو میں نے انہیں پرانی منزل، جا کی پاڑہ سے محمد یعقوب کو ڈھونڈ نکالنے کا کہا۔پتا چلا، زمانہ ہوا وہ کراچی کے ہوگئے۔

دیپک کنول کے مضمون کے کیا کہنے صاحب! لیکن گلزار جاوید صاحب، آپ نے تو کمال کردیا۔ماضی کے مشہور ٹیسٹ کرکٹر مقصود احمد صاحب سے ڈاکٹر ایوب مرزا کے کلینک، بنی چوک، راولپنڈی میں میری بھی اکثر ملاقات رہی لیکن نور جہاں کے ٹیسٹ کرکٹر نذر محمد کی بجائے خود مقصود احمد سے معاشقے والی بات آپ اُگلوانے میں کامیاب ہوئے۔ہاں، ایک بات وہ میرے استفسار پر بھی مانے تھے کہ شفیق الرحمٰن کے مشہور افسانہ ''ننانوے ناٹ آؤٹ'' میں ''مقصود گھوڑے'' کا کردار مقصود احمد ہی کی کارکردگی سے متاثر ہوکر وضع کیا گیا تھا۔اس لیے کہ شفیق الرحمٰن اور مقصود احمد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے طالب علم رہے تھے اور شفیق الرحمٰن نے اُس دور کو یاد کیا ہے۔

مرزا حامد بیگ (لاہور)

پیارے گلزار بھائی! اسلام شوق

جناب صفوت علی صفوت کے قرطاس اعزاز سے مزّین تازہ شمارہ (بابت مارچ۔اپریل ۲۰۱۲ء) موصول ہوکر نظر نواز ہوا۔سرورق پر ان کی شبیہہ دیکھ کر فوراً کچھ پرانی یادیں ذہن میں اُبھر آئیں۔مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے امریکا کے کسی قیام کے دوران کے کے نیاز سے فیض یاب ہو چکا ہوں۔برادرم پروفیسر مامون ایمن کے دولت کدے پر یا پھر نیو یارک کی نہایت فعّال تنظیم ''ادبی سنگم'' کے کسی ماہانہ اجلاس میں (اس بزم کے روحِ رواں بھی مامون ایمن صاحب ہی ہیں) صفوت صاحب کی فکر انگیز نثری تحریریں پڑھتے وقت دل اور دماغ دونوں ہی کو حاضر و ناظر رکھنا پڑتا ہے تبھی جا کر ان کے فکری و علمی شعور کے عُمق کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔گو ان محسوسات کو لفظوں میں بیان کرنا مجھ کم فہم کے لیے ممکن نہیں۔ہاں ان کے اشعار کی زبان نسبتاً سادہ بھی ہے اور پُر تاثیر بھی۔ان کے بے لاگ اور بے باک لب و لہجے میں جہاں بلا کی جرأت مندی ہے وہیں ان میں موجودہ دور کی کئی کڑوی سچائیاں بھی نمایاں ہیں۔

ہم نے مشرق سے تو کرڈالا سفر مغرب تک
داستاں ایک ہے گرتی ہوئی دیواروں کی
اب تو پیدا ہی نہیں ہوتے ولی و مجذوب
اور پرستش ہے مزاروں پہ نگہبانوں کی

کہانیاں سبھی عمدہ ہیں خصوصاً ''دامِ آگہی''، ''احساس کا میل''، ''آندھی میں رکھا دیا'' اور ''ثناخوانِ تقدیس'' جس میں آپ نے جدید دور کی

ہائی فائی زندگی جینے والے افراد کے ماضی وحال اور عروج زوال کی جھلکیاں نمایاں طور پراُجاگر کی ہیں۔حیرت ہوتی ہے کہ آپ اس قدر خانگی،صحافتی وادبی ذمہ داریوں میں پورے طور پر گھرے رہنے کے باوجوداتنی خوبصورت کہانیاں کب اور کیسے لکھ لیتے ہیں! پروفیسر انواراحمد زئی کا تحریر کردہ خاکہ ''جگت استاذ'' اور مرتضٰی برلاس صاحب سے متعلق پروفیسر قیصر نجفی صاحب کا تعارفی وتنقیدی مضمون ''غزلِ نو کا پیکر تراش'' پڑھ کر جی خوش ہوا۔ڈاکٹر فیروز عالم اور دیپک کنول صاحب کی دلچسپ اور معلوماتی تحریریں ہر بار دل کو چھو جاتی ہیں بلکہ شمارے کی جان ہوتی ہیں۔حصہ نظم میں صفوت صاحب کی نظمیں ''۱۱ستمبر۲۰۱۱ء'' اور ''سنو'' کے علاوہ حضرات مشکور حسین یاد، حسن عسکری کاظمی، آصف ثاقب، غالب عرفان، انوار فیروز، شوکت فہمی، خورشید انور رضوی، عارف شفیق، مشتاق اعظمی اور کاوش پرتاپ گڑھی کے کلام نے لطف دیا۔''رس رابطے'' میں ڈاکٹر جمیل آذر صاحب نے ''چہارسُو'' کے ذریعے میری خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے کوائف درج فرما کر مجھ پر بہت کرم کیا ہے۔ہاں ان کی علالت کی خبر سے قدرے تشویش لاحق ہورہی ہے۔اہلِ انبالہ کی طرف سے میں ان کی صحت کی بحالی کے لیے دعا گو ہوں۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ،بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب وتسلیمات۔

اس بار بھی چہارسو حسب دستور بھرپور پیشکش ہے۔مولانا حالی اور شوکت حسین رضوی پر اچھے مضامین ہیں۔ملکہ ترنم کی زلیخا صفتی کی طرف بھی اشارہ ہے بھلاوہ ''یوسفوں'' کی تلاشی کیوں نہ ہوتیں۔اُن کو ایک اعلیٰ یوسف ملا تھا بمبئی میں مگر ذرا دیر میں۔کئی ادیب وشاعر رخصت ہوگئے۔جن میں اظہر جاوید بھی تھے۔یعنی پرانی انارکلی کی بھگوان اسٹریٹ کے ''بھگوان''۔دوماہ قبل میں نے اُن کو اپنی کوئی تحریر بھیجی تھی ''تخلیق'' کے لئے اُن کا پتہ بالکل صحیح لکھا تھا لیکن نام غلطی سے ''اظہر جاوید'' کے بجائے ''گلزار جاوید'' لکھ دیا تھا۔چند دن بعد اُن کا ایک بڑا لفافہ آیا جس میں میرا ملفوف بغیر کھولے ہوئے واپس کیا گیا اپنے خط کے ساتھ (Enclosed) کہ آپ یہ ملفوف گلزار جاوید صاحب مدیر چہارسو راولپنڈی کو بھیجنا چاہتے تھے غلطی سے میری طرف آ گیا۔رب راکھا۔آپ کا اظہر جاوید میں نے فوراً فون پر اُن سے معذرت کی۔اور پھر جلد ہی وہ طرحدار قلمکار یہ کہتا ہوا روانہ ہوگیا:

''تخلیق کے دھارے سے جدا ہو نہیں سکتا
مرجاؤں گا لیکن میں فنا ہو نہیں سکتا

تخلیق کا ازلی وابدی کی طرف منہ پھیرے بغیر بقول ''ابو طالب کلیم''

وضعِ زمانہ درخورِ دیدن دوبارہ نیست
روٗ پس نہ کرو ہر کہ ازایں خاکداں گذشت

میری غزل میں کمپوزنگ کی تین غلطیاں ہیں۔''دوراں'' کے بجائے ''ادراک''، ''پوجتا کے بجائے ''یہ قبا''اور ''آزر'' کے بجائے ''آذر'' سامی زبانوں (سریانی،عبرانی وغیرہ) میں عربی کے علاوہ ''ذ'' (ذال) نہیں ہے۔''ز'' ہے۔مزید یہ کہ حضرت شہریار (مرحوم ومغفور) کے شعر کے پہلے مصرع کو یوں ہونا چاہیے تھا:

آسماں کچھ بھی نہیں ہے تیرے کرنے کے لئے

لفظ ''ہے'' موجود نہیں۔لہٰذا مصرع وزن سے گر رہا ہے۔

تشنہ بریلوی (کراچی)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ نے جناب صفوت علی صفوت کو قرطاسِ اعزاز دے کر وقت کو آواز دی ہے۔اور پھر صفوت علی صفوت کے بارے بہت سا مواد اکٹھا کر دیا ہے اسی سلسلے میں سید یحییٰ نشیط نے دربارِ محمدؐ کے عنوان سے بہت مفید اور دلچسپ مضمون لکھا ہے۔جناب سرور انبالوی نے صفوت علی صفوت کے بارے ''صدق و صفا'' عنوان سے جو نظم لکھی ہے خاصی کامیاب ہے یہ نظم صنعتِ توشیح میں ہے اشعار سے اُستادی رنگ جھلکتا ہے۔''براہِ راست'' میں سوالات جتنے گہرے ہیں جوابات اُس پائے کے نہیں۔سید ضمیر جعفری نے اپنے مضمون میں صفوت علی صفوت کے بارے لکھا ہے کہ ''صفوت رہتا ہے امریکہ میں اور جیتا ہے پاکستان میں'' اس جملے کی وضاحت آنے والا وقت کرے گا۔

رسالے کا باقی حصّہ بھی خوب دل لگا کر پڑھا۔افسانے آٹھ کے آٹھ دلچسپ اور بہترین ہیں۔آپ نے اپنے افسانے ''ثناخوانِ تقدیس'' میں جو ماحول دیا ہے اللہ کرے کہ وہ ماحول ہمارے پاک وطن میں نہ ہو۔رومانہ رومی نے اپنے افسانے ''احساس کا میل'' میں آخری جملہ بڑا خوبصورت لکھا ہے۔''بی بی جی! ہم لوگوں کا میل دھوتے ہیں پراُسے اپنے پاس نہیں رکھتے''، نظموں میں امین راحت چغتائی کی نظم ''اونگھتی گلیاں،لرزتے سائے'' پروفیسر حسن عسکری کاظمی کی نظم ''ہم کیسے آواز دیں'' اور سلیم آغا قزلباش کی نظم ''بھینٹ'' دل کو بھا گئیں۔غزلوں میں آصف ثاقب، خورشید انور رضوی اور تصور اقبال کے اشعار دل میں بیٹھ گئے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

مدیر محترم، تسلیم وآداب۔

پہلا صفحہ پلٹتے ہی بعنوان ''حسنِ بصیرت'' چہارسو سے متعلق مخلصانہ شعری اظہار پڑھا اور ویب سائٹ کی نوید پائی۔''صدق وصفا'' بھی بے حد موثر منظوم اعتراف ہے۔''چہارسُو'' کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس گلوبل ولیج میں جہاں کہیں بھی دانش وبینش کی شمعیں روشن ہوں اُن سے بصورت ''براہِ راست'' اُجالا کشید کے قارئین کے ذہنوں کو منور کیا جاتا ہے اس مرتبہ قرعۂ فال نیویارک کے صفوت علی صفوت صاحب کے نام بہت خوب نکلا۔اُن کی مذہبی وابستگی، سائنسی

اِدراک اور شعری شعور کا تشکیلی ارتقاء، ذہنی ارتکاز وجذبۂ ایمانی کے ساتھ قابل قدر ولائق تقلید ہے۔۔۔۔

بیک ٹائیٹل پر اُردو انگریزی کتب سے تعارف، شاعری ونثر سے انتخاب (اسلام کے احیاء کے لیے رجائی نکتۂ نظر، اردو زبان وادب کی ترویج کے لیے مثبت رویہ) ادبی وفکری زاویوں پہ محیط مضامین، صفوت صاحب کے افکار ونظریات کی تفہیم اور قلمی جہاد میں وقت کے ساتھ ساتھ اثباتی اقدار سے ہمکنار ہوں گے۔ گزشتہ دنوں علمی وادبی ترسیل کے لیے ایف۔سی۔ کالج اور اورئینٹل کالج کی لائبریریوں سے رابطے ہوئے تا کہ مطالعے کو محدود سے لامحدود کر دیا جائے، انشاء اللہ اگلے کسی مرحلے پر پروفیسر یاد صاحب کی تجویز کی تائید میں طالبانِ علم وادب کی نذر سوغاتِ چہارسو بھی ہوگی۔ ''فیضِ صدی'' کے حوالے سے نظم ''سالِ فیض ۲۰۱۱ء اور فیض فہمی بہت اہم ہیں۔ جمال نقوی صاحب نے بھی سالانہ ادبی جائزے میں بالخصوص مذکورہ کتاب کا ذکر کیا تھا۔

مسعود اشعر صاحب نے روزنامہ جنگ کے کالم میں بعنوان ''دو ہفتے میں پانچ سانحے'' لکھا جن میں سے تین صاحبانِ علم وفن کا چہارسو میں مذکور ہے باقی دو میں پی ٹی وی کے ''ٹاک شو'' کے مقبول اینکر افضال شاہد صاحب تھے جنہوں نے فخر زماں صاحب کے تعاون سے پنجابی کے عظیم شاعروں کی زندگی وفن پر کئی دستاویزی فلمیں بنائیں اور دوسرے پنجابی ادب وشاعری کا بڑا نام وپلاک کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد عباس نجمی صاحب ہیں جو اس وقت بھی پی ٹی وی کے مقبول پروگرام ''گل بات'' کے معروف میزبان تھے۔ ''جگت استاذ'' کے جملہ خصائل وخصوصیات کو نہایت موزونیت کے ساتھ دلچسپ وموثر پیرائے میں سمو کر کامیاب خاکہ لکھا گیا۔ ''ورثہ'' سے آگہی عمدہ سلسلہ ہے۔ ''ثناخوانِ تقدیس'' کے اختتام تک آتے آتے بیساختہ جناب حفیظ جالندھری کا شعر یاد آنے لگا۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

''ایک صدی کا قصہ''۔ کچھ ملکہ ترنم کے حوالے سے زیادہ باعث کشش رہا۔ ''تخلیقی وجدان'' کو سبھی نے اپنے اپنے انداز میں سراہا ہے، امید ہے آئندہ بھی صفحات ''چہارسو'' نوازے جاتے رہیں گے۔۔۔!

شگفتہ نازلی (لاہور)

مکرمی گلزار صاحب، تسلیمات۔

اس بار قرطاسِ اعزاز صفوت علی صفوت کے نام۔ جنہیں اپنی کوتاہ علمی کے باعث فقط شاعر جانتے تھے لیکن وہ تو ایک نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ شاعر، ادیب، دانشور، فلسفی، سائنس دان اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ ایک ایسے باعمل شخص کے متعلق تفصیلات جان کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ منقبت کا یہ شعر نصیحت کا کتنا خوبصورت پہلو لیے ہوئے ہے:

یدِ موسیٰؑ نہ ہو لیکن ہو ایسا تو یدِ صفوت
جو محنت اور مشقت کر کے ہی اونچا کرے سر کو

قرآن کی تفسیر میں سائنسی توجیہات ہمیں ہمیشہ متاثر کرتی ہے جہاں انگلیوں کے نشان کی بات کی گئی کہ فنگر پرنٹس کروڑوں انسانوں میں کسی دو انسان کے یکساں نہیں ہوتے۔ سورۃ ''قیامہ'' کی تشریح میں صفوت نے کیا باریک نکتہ تلاش کیا۔ حق ہے کہ قرآن کا اعجاز قیامت تک جاری رہے گا۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالوں کا جواب دیتے جہاں انہوں نے علم کی اہمیت کا ذکر کیا۔ قرآن کی آیت اور حدیث کا حوالہ دیا۔ مجھے اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار ''ممتاز مفتی'' کا قول یاد آیا کہ علم کے حصول کے لیے چین تک جانے کا حکم ہے۔ حدیث کا منشا دینوی علم ہے چونکہ دینی علم کے مراکز تو مکہ، مدینہ ہیں۔ صفوت کہتے ہیں ''سید ضمیر جعفری کی ستائش ان کے لیے سند ہے'' ڈاکٹر یحییٰ نشیط کے دونوں مضمون۔ اوّل ''دربارِ محمدؐ'' ''صنعتِ نعت پر ایک تحقیقی حوالہ دوم ''میرے اردگرد ہے کہکشاں'' جس میں صفوت کی شاعری میں سائنسی موضوعات کا ذکر۔ اردو شاعری میں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ''ربِّ زدنی علماً'' صفوت کا مضمون انتہائی مدلل اور فکر ونظر کے کئی در وا کرتا ہے۔ ''نجات''، نعیم کوثر کا افسانہ جس کا انجام قاری کو مطمئن نہیں کرتا کہ حادثاتی موت کسی کو جواب دہی سے کیسے آزاد کر سکتی ہے۔ ''دامِ آگہی'' سید سعید نقوی کا افسانہ نہایت متاثر کن ہے۔ ہم سنتے آئے کہ امریکی سپاہی سرکاری فرائض کے انجام دہی کے دوران میں ایک نفسیاتی کرب وجبر سے گزرتا ہے۔ نتیجتاً اس کی زندگی سوہانِ روح بن جاتی ہے۔ سید صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ تلخ حقائق پر مبنی ایک خوبصورت افسانہ امریکہ سے بھجوایا۔

''روح کا کرب'' دیپک بدکی کا افسانہ انسانی نفسیات کی گرہ کھولتی تحریر، انسان کرتر ہمیشہ خوش ہوتا ہے لیکن کبھی کسی کو سب کچھ دے کر سچی خوشی بھی حاصل کر لیتا ہے۔ انسان اپنے کردار سے ہی عظمت کو پاتا ہے۔ رومانہ رومی کا افسانہ ''احساس کا میل'' کچھ ایسے ہی احساس کی کہانی ہے۔ زہرہ جبیں کا افسانہ ''حقیقتِ منتظر'' کے پہلے پیراگراف میں فرشتے اور کروبیاں۔ مترادف الفاظ میں فاضل مصنف نے کیوں کر فرق کیا۔ نثار احمد صدیقی کی تحریر ''قصہ الم کا'' ماضی کے یادوں کو سینے سے لگائے عہدِ نو کا نوحہ۔ رینو بہل ایک پختہ کار افسانہ نگار۔ ''آندھی میں رکھا دیا'' میں قاری افسانے کے آغاز سے ہی انجام کو بھانپ لیتا ہے۔ شہر کی کڑوی کسیلی حقیقتیں۔ اسی لیے تو شہر کو دیواروں کا جنگل کہتے ہیں۔ ''ثناخوانِ تقدیس'' انسانی نفسیات کے گرد گھومتا آپ کا خوبصورت افسانہ۔ ایک ایسی انتہا کی نشاندہی کرتا ہے کہ لذت کوشی سوزان کو بالآخر کہاں پہنچا دیتی ہے۔ آپ نے کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہہ دیا۔

نجیب عمر (کراچی)

☆

...... ماورائے آب وگل ......

''ماورائے آب وگل'' برادرم سعید الظفر صدیقی صاحب کا تصنیف کردہ ایک جواہر پارہ ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ گنج ہائے گرانمایہ ہے تو غلط نہ ہوگا آپ نے موجودہ دور کی مادی اور دنیاوی لعنت پر بہت ہی آسان زبان میں روشنی ڈالی ہے اور فرمودات الٰہی کا حوالہ دے کر ہم کو اپنے دین، مذہب اور قیمتی اسلامی ورثہ سے متعارف کرایا ہے۔ آپ مطالعہ کے لیے کتاب کھولیں تو ختم کئے بغیر کتاب رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ نے ان تمام حقائق سائنس پر روشنی ڈالی جو ہمارے رب نے اپنے پیارے پیغمبر محمدؐ کے ذریعہ چودہ سوسال پیشتر عیاں کر دیئے تھے۔ ہزار سال بعد مغربی سائنسدانوں نے اب اُن ہی رازوں کی تصدیق کر کے اپنے سر سہرا باندھنے کی کوشش کی ہے۔ جو فرد بھی (بشمول سائنسدان) اگر اس کتاب کا مفیدگی سے مطالعہ کرے تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ایمان پختہ کردے گا۔

...... ڈاکٹر عبدالقدیر خان

ایک سوچھہتر صفحات پر مشتمل یہ نادر کتاب تین سو پچاس روپے کے ماورا پبلی کیشنز، لاہور پر دستیاب ہے۔

...... کوؤں کی بستی میں ایک آدمی ......

طاہر نقوی کا اختصاص یہ ہے کہ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے ماہر افسانہ نگار گردانے جاتے ہیں۔ اُن کے یہاں کفایتِ لفظی کے ساتھ اشارات اور کنایات میں معاشرے کی ژولیدہ اقدار کو تواتر کے ساتھ بحث کا موزوں بنایا جاتا ہے۔ وہ کبھی کرداروں کی زبان سے اور کبھی کہانی اور پلاٹ کے بین السطور اس قدر بلیغ طنز کر جاتے ہیں کہ قاری کئی بار پڑھنے اور سوچنے کے بعد کہانی کے معنی اور مفہوم کی تہہ تک پہنچ پاتا ہے ''کوؤں کی بستی میں ایک آدمی'' پاکستان بالخصوص کرۂ ارض کا ایسا منظر نامہ ہے جسے پڑھ کر انسان ہونے پر افسوس اور ملال کے ساتھ یہ احساس بھی شدت سے اجاگر ہوتا ہے کہ آخر مفاد پرستی اور کشت وخوں کا یہ بازار کب تک گرم رہے گا۔

...... عطیہ سکندر علی

ایک سوساٹھ صفحات کی یہ کتاب مبلغ تین صد روپے کے عوض ممتاز مطبوعات، گلشن اقبال، کراچی پر بآسانی دستیاب ہے۔

...... بذلہ سنجانِ کراچی ......

زیرِ نظر کتاب کراچی میں مقیم (عارضی یا مستقل) نثری فکاہی ادب کے نامور اور نوخیز تخلیق کاروں کی کہکشاں کا ایسا نادر نسخہ ہے کہ جو موجودہ دور کی پُر ہنگام زندگی میں بہار کے تازہ جھونکے کی مانند آپ کو تازگی اور شگفتگی سے سرشار کر سکتا ہے۔ جناب شوکت تھانوی، رئیس امروہوی، ابن انشاء، ابراہیم جلیس، ابنِ صفی، دلاور فگار، مشفق خواجہ کے ساتھ بہت سے مستند مزاح نگار بھی شریک اشاعت ہیں۔ یہ نادر کارنامہ نامور شاعر، ادیب اور مزاح نگار پروفیسر عزیز جبران انصاری اور جناب شجاع الدین غوری نے بڑی عرق ریزی سے انجام دیا ہے جس کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔

...... فاری شا

دوسو بہتر صفحات مجلد، چار سو روپے کے عوض جبران اشاعت گھر، اردو بازار، کراچی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔
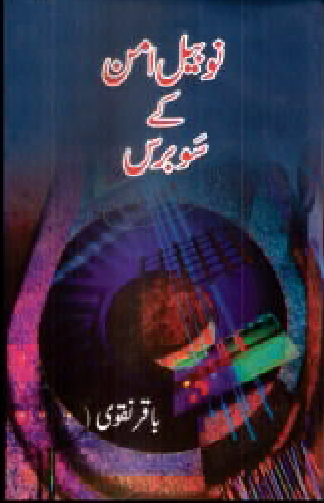
اس کتاب کے ذریعے ایک اور اہم نکتہ سامنے آتا ہے کہ امن کے لیے کی جانے والی ایک صدی کی محنت کے باوجود دنیا اسلحہ سازی کی اپنی پرانی روش پر آگے ہی بڑھی ہے، پسپا نہیں ہوئی ہے۔ تو کیا صرف زبان سے امن کی باتیں کی جاتی رہی ہیں؟ اگر اربابِ اقتدار و اختیار اسی نکتے پر غور کر لیں تو اکیسویں صدی میں انسانی تاریخ وہ موڑ لے سکتی ہے جو اس دنیا کی صورت گری الگ ہی انداز سے کرے گا۔ باقر نقوی کا یہ کام اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کی فکری تاریخ اور انسانی تہذیب کے لیے صورت و معنی کا نصاب ہے اور سنہرے لفظوں میں لکھا جانے والا بے مثال کارنامہ۔

--- شمس الرحمٰن فاروقی
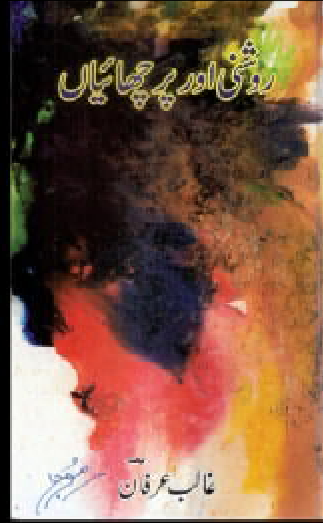
عرفان کی غزلیں محض عشق و عاشقی پر مبنی کچے پکے جذبات کی غزل نہیں بلکہ ان کی غزل میں عرفان کے کنائے بھی ملتے ہیں، نام کی مناسبت سے یہ نہیں لکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب عرفان کا شاعر ہونے کی وجہ سے اپنی غزل کو عرفانِ ذات کے استعارہ میں تبدیل کر دینے کے فنی رمز سے آگاہ ہے۔ اس لیے اُس کی غزل لذتِ دیدہ و دل کے ساتھ فکر و آگہی کے نکات بھی اجاگر کرتی ہے۔

نوائے عرفاں کی لہر تھی یا صدائے دل نغمہ زن ہوئی تھی
کہ میں نے دشتِ گماں کے اندر خود اپنا سینہ فگار دیکھا

--- ڈاکٹر سلیم اختر
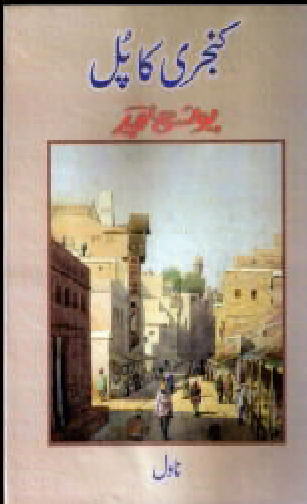
یونس جاوید کی خوبی یہ ہے کہ ٹی وی ڈرامے سے بے پایاں شہرت کے باوجود افسانے کو نظر انداز نہیں کیا اور خاکہ نگاری میں بھی افسانوی سوجھ بوجھ کے باعث خوب فائدہ اٹھایا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ زیرِ نظر ناول ''کنجری کا پُل'' میں یونس جاوید نے ڈرامہ، افسانہ اور ناول کی تکنیک کو یکجا کر کے ایک نئی دنیا بسائی ہے۔ یونس جاوید کے تخیلاتی اور کرشاتی قلم نے اس ان دیکھی اور انجانی دنیا کو قاری کے لیے بہت دیکھا بھالا، شناسا اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ صرف ایک ناول ہی نہیں معاشرے کی ناہمواریوں کی ایسی داستان ہے جس میں کبھی کبھی اور کہیں کہیں اپنا عکس بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔

--- ڈاکٹر انور سدید